ہندوستان میں وہابی تحریک

مصنف
ڈاکٹر قیام الدین احمد
ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی
پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی

مترجم
پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی
ایم۔اے

نفیس اکیڈمی
اسٹریچن روڈ، کراچی

علامہ عباسی صاحب

ہندوستان میں وہابی تحریک

مصنف
ڈاکٹر قیام الدین احمد
ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی
پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی

مترجم
پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی
ایم۔ اے

نفیس اکیڈمی
سٹریچن روڈ ——— کراچی

قیمت اٹھارہ روپے مجلد
(۱۸٫۰۰)

باہتمام ——— خالد اقبال گاہندری

اشاعت اول ——— دسمبر ۱۹۷۲ء

ٹیلیفون ——— ۵۱۳۳۴

مطبوعہ

(انٹرنیشنل پریس، کراچی)

فہرست مضامین

وہابی تحریک حصہ اوّل

باب ۳

باب ۵

دوسرا حصہ

باب ۶

باب ۷

باب ٩

حیات اور مکتوبات سید احمد شہید
کے بعد
ہندوستان میں وہابی تحریک

از:- چوھدری محمد اقبال سلیم گاھندری

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے سامنے پیش ہے، ڈاکٹر قیام الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی گراں قدر اور بے مثال تصنیف "ہندوستان میں وہابی تحریک" (انگریزی) کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ پروفیسر محمد مسلم صاحب ایم اے نے کیا ہے۔ اور خود پروفیسر صاحب کا نام نامی ترجمہ کی خوبی، سلاست اور عمدگی کے لئے ضمانت ہے۔ پروفیسر صاحب حضرت شاد کے شاگرد رشید و پختہ مشق ادیب و شاعر ہونے کے علاوہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ادا شناس ہیں۔ ان کے ترجمہ کی خوبیوں کا کیا کہنا۔

مصنف کتاب ڈاکٹر قیام الدین صاحب نے یہ کتاب اس وقت لکھی ہے جب کہ ہندوستان میں وہابی تحریک سے متعلق مواد بہت کچھ ظاہر ہو چکا تھا اور جو ابھی تک عام نظروں سے پوشیدہ تھا اسے ڈاکٹر صاحب نے بڑی جستجو سے حاصل کیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں [illegible] کی [illegible]۔ [illegible] غلام رسول مہر مرحوم کی تین ضخیم کتابیں۔ تحریک مجاہدین۔ سرگزشت مجاہدین۔ اور سید احمد شہید جو بہت کے علاوہ مرحوم مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ہندوستان کی پہلی سیاسی تحریک مولانا ابوالحسن سید علی ندوی کی کتاب سیرت سید احمد شہید۔ اس سلسلہ کی مشہور کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر قیام الدین صاحب کی اس کتاب میں مذکورہ بالا تمام کتابوں کے علاوہ دوسرے متعدد ذرائع اور کاغذات سے حاصل شدہ اور بہت سا مواد موجود ہے جو کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا میں سب سے زیادہ مکمل کتاب ہے اور جدید ترین معلومات پوری طرح اس میں موجود ہیں۔

وہابی تحریک حقیقتاً اس تحریک کا نام ہے جو شیخ محمد بن عبدالوہاب النجدی المتوفی ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء نے نجد میں چلائی تھی۔ یہ ایک اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو غیر ضروری اوہام اور غیر شرعی اعمال اور رسوم پیدا ہو گئے ہیں انھیں ختم کر کے دین کو اپنی قدیم سادگی پر واپس لایا جائے۔ اور دین پر چلنے کی جو تمنا صحابہ کرام میں موجود تھی اسے پھر سے زندہ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد

ھول میں وہابیوں کو مختلف طاقتوں سے ٹکرانا پڑا اور وہ ٹکرائے۔

ہندوستان کی وہابی تحریک کا اس سے حقیقۃً کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ لوگ بھی دینی جذبات سے لبریز تھے، ان میں بھی روحِ جہاد کارفرما تھی اور یہ بھی دین کو عہدِ اول کی سادگی پر لانا چاہتے تھے اس لئے یہ لوگ بھی وہابی مشہور ہو گئے، دوسروں نے انکی تحریک کو وہابی تحریک کے نام سے موسوم کر دیا۔

ہندوستان کی وہابی تحریک جسکی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیمات سے ہوئی۔ ان کی اور انکے شاگردوں نے اس درخت کی آبیاری کی اور حضرت سید احمد شہید بریلوی۔ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کے جاں نثار رفیقوں نے اسے اپنے خون سے سینچا۔ یہ ایک عوامی سیاسی تحریک تھی اور یقیناً ملی آزادی کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد کسی کو تخت و تاج دلوانا نہیں تھا۔ بلکہ غیر مسلموں کے اقتدار اور ان کے بے پناہ مظالم سے مسلمانوں کو نجات دلانا تھا۔ اگرچہ سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید اپنے چھ سو رفقاء کے ساتھ ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہید ہو گئے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لیکن اس تحریک نے مسلمانوں کے قلوب میں وہ آگ روشن کر دی جو بار بار بھڑکتی رہی اور وہ وقت بھی آ ہی گیا کہ ؎

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

کہاں تو یہ حال تھا کہ سکھوں کے تسلط میں اذان دینا بھی جرم تھا۔ شاہی مسجد رنجیت سنگھ کے گھوڑوں کا اصطبل بنی ہوئی تھی، اور کہاں یہ وقت کہ ڈھونڈنے پر بھی ہزارہ اور لاہور میں کوئی سکھ نظر نہیں آتا۔ سکھوں کے بعد انگریز جو دشمن ہوئے تو ایسے ہوئے کہ ہر پابند شرع آدمی پر وہابی ہونے کا الزام لگا کر وہ کالے پانی بھیجتے رہے۔ کتنی ہی بستیاں اجاڑ دیں جو مجاہدین کے مرکز تھے۔ انگریزی فوجوں نے آگ برسائی اور ایسے ایسے مظالم کئے کہ ان کا ذکر بھی غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکا دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس سے کیا نتیجہ نکلا؟ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام تک اس کا مرکز بھی قائم رہا اور اسکی تنظیم بھی موجود رہی۔ انگریز کبھی ان کو سرنگوں کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ البتہ ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانوں کی ایک مملکت پاکستان قائم ہو گئی تو مرکز کے مجاہدین نے یہ اعلان کر دیا کہ اب اس تنظیم اور مرکز مجاہدین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کا جواب پوری کتاب کو پوری توجہ سے پڑھ کر خود اپنے دل سے پوچھئے۔

سید احمد شہید کے حالات کو پڑھ کر جہاں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آج سے صرف سو سوا سو سال پہلے ہم میں اتنے مخلص بے خوف اور جفاکش مجاہدین موجود تھے وہاں یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ اس تحریک کے مقاصد میں کس قدر جاذبیت اور اس کے مقدس و محترم رہنما میں کس بلا کی مقناطیسی قوت موجود تھی کہ اسکی آواز پر مسلمان جنگل و صحراء کو عبور کر کے اور بھوک پیاس کی شدت کو برداشت

کرتے ہوئے۔ خطرات کو جھیلتے ہوئے، کفن بردوش اور سر بکف انتہائی تکلیف دہ اور غیر دلچسپ پہاڑی علاقے میں کھنچے ہوئے چلے آتے تھے، اور کیا حاصل کرنے کے لئے چلے آتے تھے، دولت دنیا۔ مخلوت والعزازات، وزیری و مشیری۔ شہرت و ناموری؟ نہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ خالق ارض و سماء کی رضامندی کے لئے۔ اور

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

سوچتا ہوں اور شرم سے سر جھکا کر خود اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ اب ہمارے علماء اور زعماء کی آواز میں وہ جاذبیت کیوں نہیں موجود ہے۔ کون دے اس کا جواب، اور کہاں سے ملے جواب۔ سچ ہے کہ

"قومیں جب تباہ ہونے لگتی ہیں تو سب سے پہلے اس قوم کے
ارباب اقتدار اور ارباب علم بگڑ جاتے ہیں"

اس کتاب کی اشاعت سے ہمارا مقصد محض کاروبار ہی نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے بوڑھے اور جوان، مرد اور عورت سب اس کو پڑھیں، اور دیکھیں کہ کیسے حوصلہ شکن حالات میں دل والے ایمان اور یقین والے اور جوش دین رکھنے والے کام کیا کرتے ہیں اور کتنے موانع اور رکاوٹوں کے باوجود دین و شریعت سے وابستگی کو قائم رکھتے ہیں۔

لیجئے یہ کتاب آپ کے سامنے پیش ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مطالعہ سے ہمارے سیاست والوں اور عوام کو فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی نظر

نامِ کتاب میں نے جب اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو پہلے "وہابی موومنٹ" کے نام سے بد خط ہوا۔ مگر تمہید میں ان کا یہ عذر دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ جماعت مجاہدین ہند کے انگریزوں کے تھوپے ہوئے خطاب "وہابی" کے اختیار کرنے پر اس لئے مجبور ہو گئے کہ ان کے شاطرانہ پروپیگنڈے سے ایک طرف مسلمانانِ ہند فریب کھا کر ان کو نجدی وہابیوں کا پیرو سمجھے اور اسی نام سے پکارنے لگے دوسری طرف انگریزوں اور ہندوستانیوں نے بھی اس موضوع پر جو کتابیں اور رسالے لکھے یا سرکاری دفاتر میں ان سے متعلق جو رپورٹیں، دستاویزیں اور نقشے، آخذ ہیں سب میں ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ داغ ان کی پیشانی پر ایسا چپکا ہے کہ چھڑائے نہ چھوٹا۔

اس مسئلہ میں کچھ مزید توضیح مناسب سمجھتا ہوں۔ حضرت سید احمد شہید کا کوئی واسطہ بانی وہابیت محمد بن عبدالوہاب سے نہ تھا نہ یہ دونوں معاصر تھے۔ محمد ۱۷۹۲ء میں وفات پا چکے تھے اور حضرت سید احمد ۱۸۲۱ء میں حج کو حجاز تشریف لے گئے تھے، اس لئے ان میں باہم ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر محمد بن عبدالوہاب کے پیرو وہابیوں کی کشمکش مسلمانوں سے تھی اور مجاہدین ہند کی کفار سے، یہ بہت بڑا اصولی فرق تھا۔

باوجودیکہ سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ آویزش سے لیکر آخری مجاہد امیر عبداللہ تک مجاہدین کی قربانیاں، وہ سکھ کبھی ان کو "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

بعض عقائد میں وہابیان نجد اور مجاہدین ہند کا اشتراک یا مماثلت، توسیعی اصلاحِ عقائد میں یہ قدرتی امر اتفاقی ہے، جسے سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں۔

وہابیانِ نجد سے انگریزوں کی عداوت کی وجہ یہ تھی کہ وہابیوں کی آویزش صرف ترکوں سے نہیں ہوتی خلیج فارس میں وہابیوں کی مدافعانہ سرگرمی سے انگریزوں کے نوآبادیاتی مفاد اور جوع الارضی سے تصادم ہوا اور خونریز جھڑپیں ہوئیں۔ اسی لئے وہ وہابیوں سے سخت عناد رکھتے تھے اور مزید جھڑپوں کا اندیشہ رہتا تھا۔ انگریزوں نے اپنی فطری عیارانہ حکمت عملی سے نجدیوں کو مسلمانان ہندوستان میں مبغوض و مردود کرنے کا یہ زبردست حربہ استعمال کیا کہ ان کو وہابی کہا۔

یہ انگریزوں کا پرانا آزمودہ حربہ تھا جسے علمائے سوء کے ہاتھوں میں دیکر دور سے ہی اپنا کام نکالتے تھے۔ علمائے سوء کی کمی نہ تھی۔ یہ ہمیشہ حکام وقت کے آلۂ کار بنے رہے۔ ٹیپو سلطان شہید نے جب انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو بھی دعوت جہاد دی تو انگریزوں نے نام نہاد خلیفۃ المسلمین سلطان سلیم سے درخواست کی کہ وہ شیخ الاسلام سے ایک فتویٰ لکھوادے کہ انگریز مسلمانوں کے فرائض و شعائر اسلامی میں دخل انداز نہیں ہوتے اس لئے ان کے خلاف جہاد جائز نہیں۔ سلطان ٹیپو دکن میں فرانسیسی فوج سے مدد لینے اور ان کے افواج کی عسکری تربیت بھی فرانسیسی سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی اور فرانس نپولین کے، سخت ترکی کا حریف تھا۔ اس نے فرانسیسیوں سے ٹیپو سلطان کا گٹھ جوڑ سلطان سلیم کو سخت ناگوار تھا۔ اس نے انگریزوں کی خواہش پوری کردی اور مطلوبہ فتویٰ بھیج کردیا۔ انگریزوں نے علمائے ہند کی وساطت سے اس کی خوب تشہیر کی۔ اس سے جہاد کے خلاف رسالے لکھوائے اور وعظ کہلوائے۔ ٹیپو سلطان لڑتے لڑتے شہید ہوگئے مگر شمالی ہند کے مسلمانوں نے انگلی بھی نہ اٹھائی۔

مجاہدین شمالی ہند کے ساتھ بھی یہ حربہ کامیابی سے استعمال کیا گیا۔ اس وقت یعنی انگریزوں نے اپنے اور ترکی کے مشترک دشمن کے معتقدین ہند کو آسانی سے وہابی بے دین مشہور کردیا ورنہ اصلیت کچھ نہیں۔

رہا عقائد میں کچھ اختلافات یا اجتہادات تو یہ دوسری ہی صدی میں معتزلہ کے ہاتھوں شدت سے رونما ہو چکے تھے۔ ان سے قطع نظر اب سے سات صدی پیشتر امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے استمداد لغیر اللہ، سماع موتیٰ، ایصال ثواب، پیر پرستی، تعظیم قبور، نذر و نیاز سے

متعلق مدلل بحثیں اور آواز بلند کی۔ بے شک ابن تیمیہ نے ان کی پاداش میں قید و بند
میں زندگی گزار دی اور زندان میں ہی وفات پائی مگر مرتے ہی قوم نے اُن کو ہیرو
بنا لیا اور ان کے خلاف فتاوے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ پھر عہد اکبری میں حضرت
سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے بھی حق گوئی کی پاداش میں ہی قید زنداں میں
زندگی گزار دی۔ اس کے دو صدی کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی عام
عقائد پر بحث کی۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی بھی ان کے شریک رہے مگر آج یہ
سب مجتہد اور فقہا تسلیم کئے جاتے ہیں، مگر ایسے ہی فروعی اختلافات کی
بدولت مجاہدین ہند وہابی اور بے دین ٹھہرائے گئے۔ یہ امتیاز خاص وہ وہابی
کا لقب ان کو صرف جہاد کے انعام میں انگریزوں سے ویسے ہی عنایت ہوا جیسے
جزیرہ انڈمان کی مہمانی۔

وہابی تحریک اصلاً مذہبی تھی یا سیاسی؟ اس سوال پر ہمارے مورخین تحریک
بہت الجھے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام میں دین و سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے
ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں یہ اجتماع و اختلاط کس طرح ممکن ہے؟
اسلام نے ایمان کے زور سے کر دکھایا۔ اُسی عہد سے جب مسلمانوں کو پیٹ بھر
روٹی بھی نصیب نہ تھی اپنی زنگ خوردہ تلواروں تیر کمانوں اور معدودے چند لاغر اور
بے زین کے گھوڑوں پر ہزاروں بکتر بند گھوڑوں و ہاتھیوں پر آزمودہ کار رومی اور
ایرانی سورماؤں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ نہ جان و مال کی پروا کی۔ نہ ہزیمتوں سے
بددل ہوئے۔ آخر قیصریت و خسرویت کا خاتمہ کر دیا۔ کیا یہ سیاست نہ تھی نہیں
تھی مگر دین کی آزادی اور ایمان کا کرشمہ۔

ہندوستان میں تحریک جہاد بظاہر تو دو صاحبین سے اوپر آتی ہے مگر اس کی جڑیں
شاہ عبد العزیز اور شاہ ولی اللہ سے اور گہری ہوتی ہوئی حضرت مجدد الف ثانی
تک پہنچتی ہیں۔ ہندوستان میں اکبر کی الحاد پروری کے مقابلے میں جب رائے
عامہ خاموش تماشائی تھی حضرت مجدد نے صبر سے قید و بند کی مشقتیں جھیلیں اور

ترک کر کے کفایت شعاری و سادہ زندگی . . . . سے بچائی ہوئی دولت اور ہمت تبلیغ دین اور جہاد پر صرف کی جا سکتی ہے۔

جہاد کا بھولا ہوا سبق پھر یاد کرایا جائے۔ ہر مسلمان عمر بھر اپنے آپ کو سپاہی سمجھے، مرنے مارنے کو تیار رہے۔ سپاہیانہ زندگی کے لئے نکاح بیوگان اور تعدد ازدواج بھی جاری کیا جائے، کیونکہ نکاح محض نفسانی و جنسی تقاضہ نہیں بلکہ گوناگوں اقتصادی، سماجی، سیاسی و فوجی مسائل کا حل بھی ہے، خصوصاً اس زمانے میں جب کہ مجاہدین کی کثرتِ تعداد فتح و کامیابی کا بہت قوی عنصر تھی۔

اسی طرح پیروں کی لوٹ کھسوٹ اور اس کے نتائج پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ قبروں کی آرائش، روضوں کی تعمیر، بزرگوں کے مزارات کی چادر، عرس، نذر و نیاز پر ضائع ہونے والی رقمیں بچائی جائیں۔ اسی قبیل اپنی اور مُردوں کی سکونت (مقبرہ)، مساجد مدارس کے لئے عالی شان عمارات کی تعمیر سے اجتناب کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے افعال کا نتیجہ مسلمانوں نے پاکستان کو ہجرت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ نیز مسلمانوں کے ذہن نشین کیا جائے کہ ان کا کوئی ایک وطن نہیں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" اور مدفن کے لئے بھی مردہ عزیزوں اور بزرگوں کے قرب کی تلاش بھی خام خیالی ہے۔

ان تمام اصلاحات کو آپ مذہبی کہیں گے یا سیاسی؟ کچھ بھی نہیں اور سب کچھ۔ اسلام میں سیاست جدید معنوں میں کوئی اصطلاح ہی نہیں، مسلم لغت میں یہ لفظ موجود نہیں۔

تعارف ڈاکٹر قیام الدین احمد پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کی یہ تالیف درحقیقت ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقاتی مقالہ ہے۔ ہر چند اس موضوع پر کئی تالیف انگریزی اور اردو میں موجود ہیں جن میں مولانا غلام رسول مہر کی تصنیف سید احمد شہید، جماعت مجاہدین و سرگذشت مجاہدین پر مشتمل چار جلدوں میں تاریخ وہابیہ تحقیق و تدقیق اور بڑی [illegible] پردازانہ قدرت سے لکھی گئی ہیں کہ اب تک وہ اس موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہیں۔ مگر تاریخ میں کوئی حرف آخر مشکل سے ہوتا ہے۔ یہ جنگل ناپید کنار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی تحقیقات کے دوران میں بہت سے ایسے مواد مل گئے جن تک دونوں

کی رسائی نہ تھی۔ علاوہ بریں وہ خاندان صادق پور کے چشم و چراغ بھی ہیں۔ تحریک کے ایک عظیم
قائد مولانا احمد اللہ کے بیٹے حکیم عبدالحمید کے نواسے ڈاکٹر عطاء الدین احمد صدر شعبہ عربی
پٹنہ کالج، کے پوتے ہیں۔ اسی طرح ان کو اپنی خاندانی روایات پر بھی بہت کچھ دسترس
ہے۔ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے تحریک سے متعلق مزید تحقیق اور بعض
غلط فہمیوں کی اصلاح بھی کی ہے۔ اب اس موضوع پر ان کی کتاب کم سے کم انگریزی
میں حرف آخر ہے۔

اس نسخہ میں نے باوجود کبرسنی و ضعف بصارت اس کا ہو بہو مکمل ترجمہ پیش
کر دیا ہے۔ مترجم بھی اسی خاندان کا ایک بدنام کنندہ نکو نامے چند ہے اور تحریک
کے دوسرے بزرگ ترین قائد سید احمد شہید کے خلیفہ ثانی مولانا عنایت علی کا پوتا ہے۔
اس جہت سے اس کا تعلق قدیم تر ہے اور روایات خاندانی سے واقفیت میں
کسی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ اس لئے میں نے اتنی جسارت کی کہ جا بجا
ذیلی حاشیہ (فوٹ نوٹ) میں مولف کے بعض تسامح یا غلط فہمی کی توضیح بھی
کر دی۔ امید ہے کہ اب اردو میں یہ کتاب وہابی تحریک کی مکمل روداد
اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے چراغ راہ ثابت ہوگی۔

مولف کے بعض ذیلی حواشی خصوصاً دستاویزات کے کچھ حوالے میں
نے ترک کر دئے ہیں۔ اس لئے کہ ان حوالہ جات تک عام قارئین کی رسائی
مشکل ہے۔ باقی تمام حوالے مع فہرست مآخذ اردو فارسی بھی نقل کر دئے
ہیں۔

کچھ مقامات ایسے ہیں جن سے اب اکثر قارئین کو شاید کوئی دلچسپی نہ ہو۔
مگر میں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ ان ناموں میں سے کچھ مجاہدین و معاونین بعد
کی اولادیں جو اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف یا غافل و بے پروا کم
بے فکر زندگی گذار رہے ہیں ان کے لئے اپنے فراموش کردہ اسلاف کے کارناموں
کا ذکر تازیانۂ عبرت ہوگا۔ ان کی آواز اب بھی سن لینگے۔

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے"

ہر مسلمان کو ہر زمانہ اور ہر زمین میں مجاہد رہنا ہے۔

تعظیمی خطاب مولفِ کتاب نے تمام مجاہدین و اکابر کے نام جن میں اکثر جلیل القدر علماء ہیں کسی تعظیمی خطاب مثلاً شہید، مولانا، مولوی یا حضرت کے بغیر لکھے ہیں۔ یہی انگریزی تاریخوں کا دستور بھی ہے۔ میں نے بھی ترجمہ بعینہ کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے تعظیمی الفاظ نہیں بڑھائے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ بزرگوار ہر تعظیمی توصیف سے مستغنی تھے۔

ز عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی ست
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

محمد مسلم عظیم آبادی (ریٹائرڈ نیر)
کراچی ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء

مضمون کا اس خطاب کے متعلق یہ اصرار نہ ابہام عمداً اور بدنیتی پر محمول معلوم ہوتا ہے۔ عرب
نجدی وہابیوں نے شروع میں عوام کے بعض اعمال کو جن کو وہ غیر اسلامی تصور کرتے تھے روکنے
کے لئے فرط جوش میں جن حرکات کا ارتکاب کیا ان کی بدولت یہ جماعت مسلمانان ہند
اور دوسری جگہوں میں بہت بدنام اور انگشت نما رہی۔ حکومت برطانیہ کی نظر میں تو غلط
وہابی غدار اور باغی کا مترادف تھا۔ اس لئے سید احمد کے متبعین کو وہابی سے تعبیر کرکے
اس وقت کے سرکاری حکام ایک تیر سے دو چڑیوں کا شکار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔
ایک تو عملی حکومت سے نبٹتے ہیں ان پر باغی ہونے کا داغ لگانا دوسرے عام مسلمانوں میں انتہا
پسند متعصب اور آثار کو غارتگر قرار دینا۔ یہ لفظ ایک مذہبی سیاسی دشنام بن گیا۔ بہرحال
اس کتاب میں وہابی کا خطاب برقرار رکھا گیا۔ اس لفظ کے غلط مفہوم سے جو اس میں
پنہاں ہے مولف کو قطعی کوئی سروکار نہیں۔

یہ کتاب دراصل پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے میرے اس مقالے پر مبنی ہے
جو میں نے ۱۹۶۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا اس کے بعد بعض نئے مواد جو باہر
سے دستیاب ہوئے ان کی مدد سے اس کی نظر ثانی کی گئی۔ نئی ترتیب دی گئی اور توسیع
کی گئی۔ یہ ایک حد تک اس تاخیر اشاعت کا عذر ہے۔

یہ کتاب کئی اصحاب کے زیر بار منت ہے۔ میرے لئے اپنے دو واجب التعظیم
استاد ڈاکٹر کے کے دتا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی اور پروفیسر سید حسن عسکری کے شکریہ
کے کماحقہ احساس کا اظہار ناممکن ہے۔ ڈاکٹر دتا کی عالمانہ رہنمائی ترغیب اور دلچسپی کے
بغیر میرا مقالہ اور یہ کتاب شاید تکمیل نہ پا سکتی۔ موضوع کے وسیع مطالعہ کے ساتھ
پروفیسر عسکری کا مشورہ اور نہایت گراں بہا ثابت ہوئی جو ہر وقت مجھے حاصل رہی
اور کام میں سہولت کا باعث ہوئی۔ میرے دوسرے واجب التعظیم استاد ڈاکٹر آر ایس
شرما نے میرا مسودہ ملاحظہ فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ شعبہ مسودات فارسی
کتب خانہ پٹنہ یونیورسٹی سے متعلق مرحوم فصیح الدین بلخی بھی ایک قیمتی ذریعہ اعانت تھے۔
کے پی جیسوال کی تحقیقاتی انجمن کے ایک رکن (فیلو) ڈاکٹر جے ایس جھا نے اس موضوع

پر کچھ دستاویزات کی نشان دہی کر کے میری مدد کی۔

سنٹرل ریکارڈز آفس پٹنہ، کلکتہ، الہ آباد، انڈیا سے قومی محافظ خانوں اور ڈویژنل کمشنر پٹنہ کے دفتر کے محافظین دستاویزات کے افسروں کا بھی شکر گذار ہوں۔ کلکتہ کے محافظ دستاویزات مسٹر جے سی گوسوامی بھی بالخصوص ہمیشہ اعانت کے لئے آمادہ رہے۔ میں نیشنل لیبریری، بہار ریسرچ سوسائٹی اور پٹنہ کالج کے کتب خانوں کا بھی تحقیقات کے دوران مختلف سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ممنون ہوں۔

میرے بھائی ہشام نے ٹائپ شدہ مسودہ کی تصحیح اور تیاری میں میری مدد کی۔ میں خاص طور پر اپنی بیگم کا شکر گذار ہوں جنہوں نے ہمیشہ خاموشی کے ساتھ میری مدد کی اور اس کتاب کی تیاری کی طویل المدت اور کبھی کبھی کٹھن گھڑیوں میں میرا ہاتھ بٹایا۔ میں مسٹر ایل موکر پادھیائے کی توجہ اور صبر و استقلال کا اعتراف کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جو انھوں نے کتاب کی طباعت میں دکھائی۔

قیام الدین احمد

۶ ستمبر ۱۹۶۶ء۔ ریتواجہ کلاں۔ پٹنہ سٹی

تعارف

(ماخذ کا جائزہ)

وہابی تحریک انگریزوں کے خلاف اُن شدید ترین قدیم ترین اور ممتد ترین تحریکوں میں سے تھی جو اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک مہتم بالشان عنصر رہے۔ تاہم یہ افسوسناک امر ہے کہ اگرچہ اس عظیم تحریک پر ابھی ایک صدی بھی نہیں گذری مگر اب تک کسی تاریخی تالیف میں اس پر کماحقہ بحث کی گئی نہ صحیح نقطۂ نگاہ سے نظر کی گئی ہے۔ آج تک وہابیوں پر ایک سر ولیم ہنٹر کی کتاب مطبوعہ ۱۸۷۱ء کے سوا کوئی جامع تصنیف موجود نہ تھی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی بیداری اور اصلاحات پر فی الحال بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں وہابی تحریک کا کوئی تذکرہ نہیں آتا۔ حالانکہ سیاسی حیثیت سے قطع نظر یہ تحریک ہندوستانی مسلم معاشرہ کی سماجی، مذہبی اصلاح کی نہایت اہم جدوجہد کی نشان دہی کرتی ہے۔

تحریک کی ابتدائی تاریخ بالخصوص سید احمد کی وفات تک کے زمانے سے متعلق جستہ جستہ معلومات مخطوطات، مسودات، پرانی اور نایاب کتب اور فارسی، اردو، انگریزی ماخذ میں ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ ان بچے بچائے ذرائع معلومات کا جائزہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

سید احمد کے سوانح حیات پر قدیم ترین تالیف حضرت شہید کے بھانجے، شاگرد اور قریب ترین رفیق سید محمد علی کی مخزن احمدی ہے۔ اس میں اُن کی ولادت سے مراجعت تک کا ایک عام بیان ہے اور بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔ یہ

۱؎ [illegible] کتب خانہ [illegible] کا مخطوطہ [illegible] حسن علی [illegible] قدیم ترین موجودہ نسخہ ہے [illegible]

نواب وزیر الدولہ (۱۸۳۳ء) والیٔ ٹونک کی فرمائش سے لکھی گئی اور انہیں کے نام پر معنون ہے۔ وزیر الدولہ اپنے والد نواب امیر خاں کے ساتھ وہابی تحریک کے ایک اہم سرپرست تھے۔ دراصل ٹونک وہابیوں کا ایک اہم مرکز رہا ہے اور ریاست ٹونک کے قدیم کتب خانے میں اس موضوع پر مواد کا ایک قیمتی ذخیرہ موجود تھا۔ وزیر الدولہ خود بھی ایک کتاب مسمّی وصایا الوزیر کے مصنف تھے جس میں سید احمد اور ان کے بعض رفقا کا تذکرہ ہے۔ اسے نواب محمد علی خاں نے ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) میں مفید عام پریس آگرہ سے شائع کیا۔

سید احمد کا ایک اور سوانحی تذکرہ جعفر علی نقوی کی تاریخ احمدیہ ہے۔ مؤلف ایک اچھے کاتب تھے اور سید احمد نے ان کو اپنا معتمد منشی اور دفتری کاغذات کا ناظم مقرر کیا تھا۔ اس حیثیت سے ان کو وہابیوں پر لکھنے کا ایک مناسب موقع حاصل تھا۔ بہت سے واقعات جو انھوں نے بیان کئے ہیں انھوں نے خود حصہ لیا تھا۔ وہ سید احمد کے ساتھ شمالی مغربی سرحد پر رہے۔ ان کی شہادت کے بعد ہندوستان لوٹ آئے اور ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) میں یہ کتاب تصنیف کی۔ مہر نے کتاب کے ایک مخطوطے کی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نشان دہی کی ہے اور بتاتے ہیں کہ اس میں بنگال میں ٹیٹو میر کی شورش کا ذکر بھی ہے جو کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں۔ بدقسمتی سے اس قیمتی مخطوطہ کا کوئی نسخہ مجھے دستیاب نہ ہوا۔

وقائع احمدی بڑی ضخیم تذکرہ ہے جس میں سید احمد کے بعض رفقا کی متعدد سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی نواب وزیر الدولہ کی سرپرستی میں تالیف ہوئی۔ جن لوگوں نے سید احمد کے بہت سے رفقا کو جمع کیا اور ان کے بیانات قلمبند کئے اس کی ترتیب کا کام ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں تمام ہوا۔ اس کتاب کے کئی نسخے مختلف مقامات پر موجود ہیں جن میں کتب خانہ ریاست ٹونک بھی ہے۔ اس میں سید احمد کی زندگی اور ان کے معرکوں کی بہت قیمتی تفصیلات ملتی ہیں لیکن دراصل یہ روایات کا مجموعہ ہے اور خوش اعتقادی کے عناصر سے خالی نہیں۔

ٹونک [illegible] سے ملحق علاقہ جات جموں و کشمیر [illegible] حکومت

کے قیام سے لیکر گلاب سنگھ کی تخت نشینی تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ضلع کانپور کے ایک کالیستھ مہتاب سنگھ نے علاقہ ہزارہ کے پہلے انگریز ناظم الامور جیمس ایبوٹ کی فرمائش سے لکھی۔ مہتاب سنگھ نوکری کی تلاش میں سرحد شمالی ومغربی کو گیا تھا اور کچھ عرصہ تک کنور کھڑک سنگھ، فتح سنگھ مان اور ہری سنگھ کے تحت خدمت کی تھی۔ سموت ۱۸۸۱ (۱۸۲۴ء) میں ہزارہ سرکار کے دفتر میں اُس کا تقرر ہو گیا، ۱۸۵۴ء تک تیس سال اس عہدے پر رہا۔ اسی زمانے میں ایبوٹ نے اُسے علاقہ ہزارہ کے حالات لکھنے پر مامور کیا۔ موجودہ نسخہ لندن کے تعلقاتِ ریاستہائے جمہوریہ کے دفتر کے کتب خانہ کی ملکیت ہے اور اس پر تاریخ ۱۸۵۴ء درج ہے۔ اس میں سید احمد اور سکھ جنرل شیر سنگھ کے درمیان اہم معرکۂ بالاکوٹ کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کی وقعت اس حقیقت سے بڑھ جاتی ہے کہ یہ اُس شخص کی تحریر ہے جسے ۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۴ء تک کی پوری مدت میں جائے وقوع پر موجود ہونے کا نادر موقع حاصل ہوا اور جسے ماخذی سے متعلق تمام کاغذات دستیاب تھے۔ مؤلف کا دعویٰ ہے کہ اس نے تمام واقعات جو بیان کئے ہیں ان میں سے اکثر اس کے چشم دید ہیں۔ چونکہ یہ کتاب . . . .
ایک انگریز کی سرپرستی میں لکھی گئی اس لئے مؤلف کے لئے آسانی سے ممکن ہوا کہ وہ اُس وقت تک اپنے آقاؤں کے دو دشمنوں کے درمیان جنگ کے متعلق غیر متعصبانہ رائے کا اظہار کر سکے۔ اب تک اس کتاب کی طرف کسی نے اعتنا نہیں کی حتی مہر نے سید احمد کے سرحدی محاذات پر تمام ممکن معلومات کا جائزہ لینے پر بہت محنت صرف کی ہے اس ماخذ سے اُن کی نظر بھی چوک گئی۔

صراط مستقیم سید احمد کے اقوال و افکار کی بنیاد پر شاہ اسمٰعیل اور عبدالحی کی مشترک تالیف ہے بعض لوگوں نے اسے وہابیوں کے قرآن کا نام دیا ہے۔ یہ سید احمد کی اساسی تعلیمات پر مشتمل ہے اور اس میں مسلمانوں میں مروجہ سماجی مذہبی اعمال و رسوم کا بیان بھی ہے۔ اسے تحریک کا سماجی مذہبی منصوبہ یا منشور تصور کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے مطبوعہ نسخے اور اردو ترجمے بھی موجود ہیں۔ میں نے ایک نایاب نسخے سے استفادہ

کیا ہے جو سید احمد کے پہلے خلیفہ شاہ محمد حسین کے ذاتی مطالعہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس نسخے کے آخر میں شاہ صاحب موصوف کو سید احمد کی بخشی ہوئی نایاب سندِ خلافت بھی موجود ہے۔ حوالے کے لئے میں نے اس کتاب کا ایک مطبوعہ نسخہ استعمال کیا ہے۔

سید احمد اور ان کے بعض رفقا کے مکتوبات کے کئی مجموعے ہیں۔ یہ مختلف مقامات میں موجود ہیں۔ سید احمد کے مکتوبات کا ایک بہت اہم نسخہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے۔ اس میں ایک تتمہ بھی ہے جس میں سرحد پر وہابیوں کی قائم کی ہوئی آزاد ریاست کا حال بھی مذکور ہے۔

اُردو میں مطبوعہ نسخوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

تواریخ عجیبہ یا سوانح احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری۔ وہ ایک دقیع وہابی تھے اور انبالہ کے مقدمے میں بغاوت کے الزام میں سزایاب ہوئے۔ ان کو جزائر انڈمان میں حبس دوام کی سزا ملی تھی۔ لیکن اٹھارہ سال قید میں گذارنے کے بعد وطن واپس آکر انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ اسی میں سید احمد اور ان کے بعض رفقا کی جامع سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ اس میں سید احمد کے بہت سے مکتوب کے متن بھی نقل کئے گئے ہیں جو مختلف اشخاص کو لکھے گئے تھے۔

محمد جعفر نے دو اور کتابیں بھی لکھیں: تاریخ عجیب معروف بہ کالا پانی اور تواریخ عجیب۔ ناموں میں یہ خفیف فرق قابل توجہ ہے۔ اصل میں بہ مادۂ تاریخ اشاعت اول الذکر جو ۱۸۸۶ء میں لکھی گئی۔ اس میں مقدمہ انبالہ کی روداد اور جزائر انڈمان تک کے سفر میں قیدیوں پر مظالم کے واقعات درج ہیں جن کا کسی اور ذریعہ سے زیادہ علم دستیاب نہیں۔ آخر الذکر کتاب مولف نے دوران قید میں لکھی تھی اور یہ جزائر انڈمان کی جغرافیائی تصویر کشی کرتی ہے۔

سیرۃ سید احمد شہید مولفہ ابوالحسن علی ندوی۔ مہر کی جماعت مجاہدین کی اشاعت سے قبل تک سید احمد کے سوانح حیات پر یہی ایک مفصل ترین تالیف تھی۔

سید احمد اور وہابی تحریک پر غلام رسول مہر کی چار جلدیں جدید ترین اور اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع تالیف ہے۔ یہ چار جلدیں جو دو ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہیں ان کے مطالعہ سے مؤلف کی صبر آزما اور جانفشاں محنت اور خلوص ظاہر ہے۔ پہلی دو جلدیں مسمّٰی سید احمد شہید ایک ساتھ مجلّد ہیں۔ باقی دو جلدیں جماعت مجاہدین و سرگذشت مجاہدین کے ناموں سے موسوم ہیں۔ مولف نے جن مآخذ کو استعمال کیا ہے۔ ان میں سے مواد کی ایک کثیر مقدار (جن میں سے بعض پر پہلی بار نظر ڈالی گئی ہے) استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر معاصر سرکاری دستاویزات پوری طرح کھنگالی نہیں گئیں۔ ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک سے متعلق وہابی تحریک پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ مولف نے ۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۷ء تک وہابی تحریک کا پورا جائزہ لیا ہے۔ اُس زمانے میں ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک ایک مہتم بالشان واقعہ تھا اور دونوں تحریک کے پہلو بہ پہلو اس پر بھی بحث کرنا تھی۔ پھر وہابی تحریک کی ناکامی کے اسباب یا مختلف میدانوں میں اس کی خدمات و اعانت کا کوئی ذکر نہیں۔

ایک پرانے اردو ماہنامہ اشاعۃ سنتِ نبویہ (جلد ۴ ۱۱ مورخہ نومبر ۱۸۸۱ء) میں جو مطبع ریاض ہند امرتسر سے طبع ہوتا تھا وہابیت پر کسی گمنام اہل قلم کے تین مقالے شائع ہوئے تھے۔ پہلے دو میں اس دعوے پر کہ سید احمد کے پیرو وہابی ہیں قانونی دلائل سے بحث کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ لوگ فی الحقیقت حنفی مسلمان تھے۔ تیسرے مقالے میں ہندوستان میں وہابی تحریک کی مختصر تاریخ لکھی ہے جو مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے: (۱) ۱۸۲۳-۳۱ء سید احمد کے ابتدائی معرکے۔ (۲) ۱۸۳۱-۴۷ء ولایت علی اور عنایت علی کی کاروائیاں، پنجاب میں ان کی گرفتاری اور پٹنہ میں ان کے اخراج تک (۳) سرحد شمالی و مغربی کو ان کی مراجعت اور مابعد کی کاروائیاں۔

معارف کے پرانے شماروں میں بھی تحریک کے کئی پہلوؤں پر کارآمد مقالات بخصوص مسعود عالم ندوی کے شائع ہوئے۔

انگریزی مطبوعہ مآخذ میں سے ہنٹر کی "دی انڈین مسلمانس" ایک بیش قیمتی تصنیف ہے۔ تالیف ہذا میں اس پر علیحدہ بحث کی گئی ہے۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں بھی

کلکتہ کی ابتدائی جلدیں بھی قابل ذکر ہیں۔ کلکتہ ریویو میں او کینیلی کے طویل معلوماتی مقالے بھی اس موضوع کے طالب علموں کے لئے گراں قدر ہیں۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی میں روٹسیک نے عرب اور ہندوستان میں وہابیت کا ایک عام جائزہ پیش کیا ہے۔ شمال مغربی سرحد پر وہابی مرکز کے خلاف فوجی معرکوں سے متعلق متعدد تحریریں ہیں، مثلاً ایچ ڈی ہیوبیٹ ریکارڈ ۱۸۶۰ء کی شمال مغربی سرحد کی قبائل کے خلاف مہموں کی روداد (ایچ ڈی بیلیو (لاہور ۱۸۶۴ء) یوسف زئیوں پر ایک عام رپورٹ) اور کرنل ایڈی کی (لندن ۱۸۹۶ء) کی داستان کے مندرجہ فوجی مہمیں جنہوں نے وہابیوں کے خلاف بھیجیں، یادداشتیں اور سرگزشتیں ہیں۔ یہ ساری تحریریں زیادہ تر وہابیوں کے خلاف کشمکش کے عسکری پہلو پر بحث کرتی ہیں۔

اس زمانے کے انگریزی اور دیسی زبانوں کے اخبارات اور رسائل بھی تحریک کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں انگلش مین میں وہابیوں پر عام مذہبی مسائل اور انگریزی حکومت میں مسلمانوں کی معاشرتی حالت پر کئی مقالے شائع کئے۔ انگلش مین نے ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو مقدمہ انبالہ پر ہربرٹ ایڈورڈز کے فیصلے پر ایک طویل تبصرہ کیا۔ وہابیوں کے خلاف مختلف فوجی مہموں کی روز بروز کی کارروائیوں پر اخبار بنگال ہرکارو میں مضامین شائع ہوتے رہے۔

ماخذ متذکرہ بالا کے جائزے[1] سے ظاہر ہوگا کہ ان کا تعلق زیادہ تر تحریک کی ابتدائی تاریخ ۱۸۳۱ء تک اور سرحدی جنگوں سے ہے۔ لیکن یہ کتاب زیادہ تر حکومت ہند اور حکومت بنگال کی اس وقت کی سرکاری رپورٹوں اور دستاویزوں پر مبنی ہے، جو اس تحریک کے تمام پہلوؤں، اس کے قائدوں، ان کی کارروائیوں اور ان کے خلاف حکومت کے طریق کار اور اقدامات سے متعلق قیمتی معلومات مہیا کرتی ہیں۔ اگرچہ جا بجا ان میں تعصب کی آمیزش بھی ہے پھر بھی وہ اس موضوع پر نہایت کارآمد اور مخصوص دستیاب مواد

---

[1] یہ فہرست جامع نہیں، یہ دکھانے کے لئے کہ ان سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کا تعلق کس زمانے سے ہے، ان چند اہم تحریرات سے اعتنا کی گئی ہے۔

جنگ پلاسی: دوسرا نہایت نمایاں سیاسی پہلو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی
عزائم اور طاقت تھا، بالخصوص مشرقی صوبہ جات بنگال اور بہار میں۔ دلّی اور اس کے
اطراف میں تاراج اور بدامنی کے ساتھ سیاسی ترکتاز کا مرکز دھیرے دھیرے مگر باقاعدگی
کے ساتھ اس مشرقی حصہ ملک میں منتقل ہوتا جاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں
انگریزوں کی آئندہ سیاسی برتری کی بنیاد یہیں رکھی جا رہی تھی۔

نواب علی وردی خاں کی لائق اور نیم خود مختارانہ نوابی کے زیر اثر ان دونوں صوبوں
کو مقابلۃً بہت کچھ صلح و امن اور خوشحالی نصیب تھی۔ بنگال سے مالگذاری کی معتدبہ باقاعدہ
ترسیل گنتی کے ان وسیع ذرائع آمدنی میں سے تھی جو متزلزل مغلیہ سلطنت کے لئے
رہ گئی تھی۔ لیکن بعض سیاسی حوادث نے جو ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی پر منتج ہوئے، مالی
طاقت کا یہ تنہا ذریعہ بھی معرض خطر میں پڑ گیا۔

اس جنگ کو بجا طور پر تاریخ ہند کا ایک یادگار واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس
کا ایک واضح نتیجہ انگریزوں کا ملک میں ایک اہم سیاسی طاقت بن جانا تھا۔ میر جعفر
ان کے ہاتھ میں عملاً ایک کٹھ پتلا بنکر رہ گیا۔ اس جنگ کے فوراً بعد نواب کی ریاست
کی لوٹ شروع ہوگئی۔ فاتح انگریز بے بس نواب پر ہر قسم کے ناقابل برداشت مالی
مطالبات عائد کرنے لگے اور اس کا خزانہ قریب قریب خالی ہوگیا۔ میر قاسم کو
مسند پر بٹھایا گیا، زیادہ تر اس لئے کہ اس سے امید تھی کہ سابق نواب سے جس مال و
دولت کے فراہم کرنے کا بجبر وعدہ لیا گیا تھا اور جسے وہ پورا نہ کر سکا تھا، یہ اسے
پورا کردیگا۔ مگر یہ نیا نواب سخت اور خمیر کا بنا ہوا تھا اور انگریز سرپرست کی خواہشات
کا ویسا غلام نہ تھا جیسا اس کا سُسرا تھا۔ گہری سازشوں اور ڈپلومیٹک گفتگو و شنید
کا ایک سلسلہ جاری ہوگیا جو آخر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں اور ۱۷۶۵ء میں دیوانی
حوالہ کرنے پر تمام ہوا۔ اس طرح ایک بار پھر اقتصادی بے چینی اور استحصال کا
ایک نیا دور شروع ہوگیا۔

تجارت پر انگریزوں کی اجارہ داری تجارت کے متفرق اقسام کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور بالعموم انگریز تاجروں کے حق میں مخصوص کر دیا۔ اس زمانہ کی اقتصادی پالیسی کی نمایاں اقتصادی استحصال سے نہایت مہیب و شدید غربت و افلاس پھیل گیا۔ اٹھارہویں صدی کی مشہور تاریخ بہار و بنگال مظفر نامہ کے مؤلف کرم علی نے اس کے تباہ کن نتائج کو جامع طور پر بیان کیا ہے:-

"انگریزوں نے جمہور رعایا کے ایک اور اہم ذریعہ معاش یعنی مختلف اقسام کی اراضی پر بھی ضرب لگائی۔ یہ اراضی کی بازیابی کے لئے مسلسل کارروائیوں سے انجام دی گئی۔ یہ کارروائیاں تدریجی اور ممتد تھیں جو پورے صوبے پر حاوی تھیں اور جن کا مقصد تھا، گذری سے بڑا حق تصرف کی بازیابی اور دوبارہ لگان عائد کرنا۔ مغل شہنشاہوں اور صوبائی گورنروں اور دوسرے حکام علی نے بہت سی معافیاں دے رکھی تھیں۔ یہ انعامات، اہل علم، مذہبی درویش کو تنخواہیں ادا کرنے کا طریقہ عام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ رعایتیں اپنے وسیع پیمانے پر بخشی گئی تھیں کہ جب انگریزوں نے بہار و بنگال کے مالیانہ کا نظم اپنے ہاتھ میں لیا تو پورے علاقہ کی بانگدی یا ست منتقل کر لی گئی۔ بے شبہ اس کے نتیجے میں بڑا انتشار و پراگندگی پھیلی۔ بہت سے لوگ جعلی وثیقوں، و سندوں سے معافیوں سے مستفید تھے۔" تاہم انگریز افسران بندوبست نے اسی اراضی پر لگان لگانے کے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ نہایت بے رحمانہ ورنہ یکا تھے خود ہنٹر کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ معافیوں کے سے ہم نے ثبوت طلب کئے مگر جائیدادوں کے قبضہ و تصرف سے متعلق کسی واضح قانون کی غیر موجودگی میں وہ اپنی جاگیروں کے حق میں ثبوت پیش نہ کر سکے۔ ان کے وثیقوں اور سندوں کو موسم کی خرابی اور دیمکوں نے غارت کر دیا ہے۔"[1]

قوانین بازیابی اراضی کے تحت بعض دعویداروں کے معائنہ سے ہی ہر ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض حالات میں جعلی معافیوں کو بجا طور پر قبضہ کر لیا گیا،

---

[1] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب ہمارے انڈین مسلمان — OUR INDIAN MUSALMAN لندن ۱۸۷۱ء ص ۱۸۲

تھی، مگر بیشتر صورتوں میں کارروائیوں کا مقصد قانون کے بہانے سے نقاب میں معافی داروں کو بے دخل کرنا ہوتا تھا۔ ایسی کارروائیاں ملک گیر معاشی مصیبت، سماجی انتشار اور سیاسی بے چینی کا باعث ہوئیں۔ ہنٹر نے نہایت رنج و افسوس کے ساتھ تبصرہ کیا کہ ان کے نتیجے میں جو گھبراہٹ اور نفرت پھیلی اس کا نقش دیہی دفتر تاریخ پر ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا۔[4] اس نے اس زمانہ میں وہابیوں کے خلاف مقدمات کے ذمہ دار افسر جیمس [illegible] کی رائے نقل کر کے ظاہر کیا ہے کہ یہ صورت حال مسلم قوم کے تنزل اور بے چینی کا دوسرا سبب تھی، اور بعد میں اسی نے ۱۸۵۷ء کی آتش فساد میں بہار میں ایندھن کا کام کیا۔[5]

یورپ کی تجارتی کمپنیوں کی آمد نے ملک کے قدیم اقتصادی نظام اور قدروں کی جڑوں پر کاری ضرب لگائی۔ ان کے ورود نے تجارت کے نئے نئے دروازے کھولے۔ پھر اس نے ایک جدید تاجر طبقے کو جنم دیا۔ اس مالدار حریص اور دنیا پرست طبقہ نے پرانے طبقہ شرفا (جو سماج کے مختلف طبقات میں ایک مدت سے عزت آبرو کے مالک تھے) کے خلاف ورثا کا مقابلہ کیا۔ سماجی امتیاز کا معیار خاندان نہیں بلکہ دولت پایا۔ اس نئے تجارتی طبقہ کے مفاد انگریزوں سے وابستہ اور اکثر و بیشتر انہیں پر دار و مدار رکھتے تھے اس لئے وہ اپنے محسنوں کے مفاد میں کام کرتے تھے یہاں تک کہ اپنے قومی مفاد کو بھی ان کے مفاد پر قربان کر دیتے۔ بنگال کے سیٹھوں کا خاندان اس حقیقت کی ایک مثال ہے۔ اس زمانہ میں یہ صورت حال ملک کی تاریخ پر بدنما دھبوں میں سے ایک ہے۔

اخلاقی انحطاط: یہ ایک تکلیف [illegible] اور تذبذب کا زمانہ تھا جب کہ قدیم معاشرہ مر رہا تھا اور جدید عہد اس کی جگہ لینے والا تھا۔ اس زمانہ میں وہ تمام معاشرتی زوال و تخریبات رونما ہوئیں جو اس حالت کا لازمہ ہوتے ہیں، تمام اخلاقی اقدار پاؤں تلے کچل دیئے

---

[5] ایضاً ص ۱۴۱، [illegible] کے کے دتا کی کتاب سیرۃ کنور سنگھ و امر سنگھ۔ پٹنہ ۱۹۵۷ء۔ ص ۹۱، ۹۲۔

گئے۔ ذاتی عیش و عشرت اور مقامی اعزاز کی خاطر عظیم قومی مصالح ٹھکرا دیئے جاتے۔ مستقبل تاریک اور برے شگونوں میں آلودہ نظر آتا تھا اس لئے ہر شخص اس فکر میں رہتا تھا کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لے۔ ایک اوسط درجہ کے شریف آدمی کی زندگی کے لئے تعیش، مےنوشی اور رقص و سرود کی محفلیں لازمی جزو بن گئی تھیں اور ان سے ادنیٰ ترطبقوں میں بھی ان سے نسبتہً پست ترپیمانے پر ان کی تقلید کی جاتی تھی۔ اُس زمانہ کی ادبیات بھی جن کی کثیر تعداد ہمارے سامنے ہیں کاہلی اور عیاشی کے مروجہ عواطف و میلانات مہیا کرتی تھیں۔ ہاں یہ یاس انگیز تصویر ذرا مدھم پڑ جاتی تھی تو اس حقیقت سے کہ اگلے زمانے کے کچھ لطیف جذبات جیسے جرأت و دلیری، وفاشعاری اور شعور عزت و آبرو اب بھی لوگوں میں موجود تھے گرچہ اُن کا نشوونما غلط طریقوں پر ہوتا تھا، چنانچہ دلیری معمولی جھگڑوں، خانہ جنگیوں پر، وفاداری چھوٹے چھوٹے مقامی معاملوں پر، استقلال و استقامت فرسودہ اور تباہ کن رسم و رواج سے چمٹے رہنے پر، سیر چشمی اسراف پر اور علم و دانش قدیم ذخیروں میں جدید معلومات کا اضافہ کرنے کی بجائے پرانے پرانے متنوں کی طویل و مذیل شرحیں لکھنے پر صرف کی جاتی تھی۔

اشاعتِ اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ: اس زمانے کی مذہبی زندگی اور بھی شرمناک تھی۔ ہندوستان میں اسلام کی نشوونما زیادہ تر اگلے صوفی درویشوں کی جانفشانیوں کا نتیجہ تھا۔ ان کی جدوجہد کا سنہرا زمانہ چودھویں اور پندرھویں صدی تھا جب کہ ان خود فراموش بے غرض پرجوش مبلغوں کے گروہ اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تمام ملک میں مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے اخلاق اور زاہدانہ طرزِ معاشرت، ان کی وسعت قلبی، انسان دوستی، خدمت خلق اور عوام کے مفت معالجہ و اعانت نے دلوں پر قبضہ کر لیا اور مقامی باشندوں کی ایک کثیر تعداد کو ان کا معتقد بنا دیا۔ یہ مبلغین بڑے وسیع النظر تھے جن کی مثالی زندگی اور مخلصانہ خدمات ان کے دین کے اختیار کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنے میں بڑا حصہ رکھتی تھیں۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ وہ بھی رخصت ہو گئے۔ ان میں سے بعض کے نام پر صوفیانہ طریقے اور خانقاہیں قائم ہو گئیں۔ جیسے جیسے فیاضانہ عطیات سے یہ مرکز مالدار ہو گئے، ان صوفیوں کا سابق مبلغانہ جوش اور خدمتِ خلق کی سرگرمی بہت کچھ ٹھنڈی پڑ گئی۔ یہ خانقاہیں ہی تھیں جو اپنے ساز و سامان اور رسومات کے ساتھ زیرِ نظر عہد میں ملک کی دینی زندگی پر حاوی تھیں۔

مذہبی بے راہروی مختلف صوفیانہ طریقوں اور خانقاہوں کی تعلیمات کا ایک لازمی جزو معرفت و وصالِ حق کے لئے بیعت و ارادت کا اصول ہے۔ کسی پیرِ طریقت کے بغیر ان میں سے کوئی مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ مرشد پر کامل توکل اور تسلیم اپنی جگہ کوئی بری بات تو نہیں مگر یہ اکثر غیر معقول حد تک عمل میں لائی جاتی تھی۔ وہابی تحریک نے اسے روحِ اسلام کے منافی قرار دیا جو پیغامِ الٰہی کو براہِ راست سمجھنے کے اصول پر زور دیتی ہے جو ارشاداتِ قرآنی پر مبنی ہے اور جس کی توضیح و تکمیل احادیثِ صحیحہ سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اسلام کے یہ دونوں سرچشمے حدیث اور قرآن عربی میں تھے، جمہور اہلِ ہند اس زبان سے ناواقف تھے۔ اس صورتِ حال نے عوام الناس کو علماء کا محتاج بنا رکھا تھا۔ ہندوستان میں قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ مشہور حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ) نے کیا۔ علمِ حدیث اگرچہ ہندوستان میں اس سے بہت پہلے رونما ہو چکی تھی لیکن حضرت عبدالحق محدث دہلوی نے سولھویں صدی ہی میں اسے روشناس کر دیا تھا۔

قوم کی دینی سماجی زندگی کے بعض حالات جو اُس وقت صورت پذیر تھے کتاب صراطِ مستقیم میں ذرا تفصیل سے واضح کئے گئے اور ان پر سختی سے تنقید کی گئی ہے:

(۱) "صوفی باصفا" ہیں۔ ان بدعات میں جو اس زمانہ میں جاری ہو گئی تھیں ایک ندائے شان اور اس کے احکام سے متعلق کلماتِ کفر کا استعمال ہے۔ جب تک مر

ان کے زبان پر لانے اور سننے سے پرہیز کرنا چاہئے اگرچہ ان کا کہنے والا نیکوکار آدمی سمجھا جاتا ہو اور خود بھی ایسے کلمات زبان پر نہ لانا چاہئیں۔ ایسی بے لگامی کبھی کوئی اچھا نتیجہ نہیں دکھا سکتی"

(۲) "طریقۂ وجودیہ[1] کے ملحدہ کی دوسری بدعت جو لوگوں میں پھیل گئی ہے اور جو صوفی طریقوں کے بڑے بڑے مرشدوں کے اقوال کے مطابق بتائی جاتی ہے وہ توحید وجودی یعنی وحدۃ الوجود کا ملحدانہ قول ہے۔ یہ صوفیہ اپنے آپ کو خدا کا جزو لاینفک یا واصل بخدا سمجھتے ہیں اور اس اتحاد و وصل سے لذت کا احساس کرتے ہیں۔ وہ شیطان کے فریب یا خود فریبی سے اپنے آپ کو حقیقت آگاہ کے باطنی علم کا مرشد سمجھتے ہیں اور بیہودہ بکواس میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں"

(۳) ملحد صوفیوں کی ایک اور بدعت جو عام طور پر مسلمانوں میں پھیل گئی ہے وہ قضا و قدر کے مسئلہ پر بحث ہے۔ تقدیر پر اعتقاد دین اسلام کے اہم اعتقادات میں سے ہے اور شریعت کی رو سے واجب التسلیم ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر بحث و تمحیص نا واجب ہے۔ شریعت نے اس باریک اور عمیق موضوع پر بحث کرنے سے منع کیا ہے۔ اس لئے تمام مسلمانوں پر اس کو کتاب اللہ اور سنت پر اکتفا کرنا اور اس سوال کی گہرائیوں میں طوفانی موجوں میں کودنے سے پرہیز کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

(۴) صوفی مشرکوں کی بدعت میں سے جو ہمارے زمانہ میں بالخصوص ہندوستان

---

[1] صوفیوں میں وجودیہ اور شہودیہ دو نمایاں گروہ ہیں۔ ہندوستان کے زیادہ تر صوفیہ وجودیہ مشرب رکھتے ہیں۔ یہ فرقہ وحدۃ الوجودی عقیدہ سے کسی قدر مختلف عقیدہ ہے۔ یہ ہمہ دوست کے قائل ہیں یعنی ہر شے خدا ہی ہے۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ ہمہ از دوست ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ خدا جزو ہر شے میں موجود ہے۔ آخرالذکر خالق و مخلوق کے وجود میں امتیاز کرتا ہے۔

میں رائج ہیں وہ انتہائی تعظیم ہے جو مرشد کے لئے اس حد تک بجا لائی جاتی ہے کہ اسے درجہ خدائی یا نبوت تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس بارے میں معتدل حدود کو سمجھنا ہے۔ ایک مرشد بے شک راہِ خدا کو پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے ...... اور کسی رہبر و مرشد کے بغیر اس راہِ حق کی دریافت مشکل سے ممکن ہوتی ہے مگر مرشد ایسا ہونا چاہئے جو شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کرے یعنی قرآن و حدیث پر پختہ ایمان کے ساتھ راہِ حق پر گامزن ہو۔[1]"

(وہابی عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل فریضہ قرآن حدیث اور شرع کا اتباع ہے۔ مرشد کا اتباع اسی حد تک کرنا چاہئے کہ اس کے اعمال شرع کے مطابق ہوں)

(۵) صوفی مشرکوں کی بدعات جو عوام کی نظروں میں خیر معلوم ہوتی ہیں ان میں سے ایک پرہیزگار اور نیکوکار بزرگوں کی قبروں پر بیہودہ رسوم ادا کرنا ہے .... اسی سلسلہ میں مُردوں سے اعانت اور مرادیں مانگنا ہے ...... ایسی چیزوں سے لوگ شرک میں آلودہ ہو جاتے ہیں ...... اللہ تعالیٰ نے واجب کر دیا ہے کہ ہدایت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہے اور فیض انھیں سے حاصل کرنا چاہئے جو زندہ ہیں۔ اگر یہ اتفاق ہو کہ کسی کو اپنے مقصد کے لئے کوئی زندہ شخص نہ ملے تو اُسے مزارات کی بجائے صرف قرآن و حدیث کی پیروی کرنا چاہئے جو تمام باریک مسائل کی کنجی ہیں:

(۶) صوفی مشرکوں کی بدعات میں سے جو مسلمانوں کے ہر طبقے اور عوام الناس میں جاری ہیں نذر و نیاز بھی ہے یعنی مُردوں کی روحوں کو آرام دینے کے لئے اشعار خوانی اور کھانے کی چیزیں چڑھانا۔ یہ شرک والحاد کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ اصولاً یہ جائز ہے اور اس کی صحیح بجا آوری شریعت پر مبنی ہے مگر عوام الناس نے اپنے تصورات و تعصبات اس میں ملا دئے ہیں اور اخلاف نے نہ

---

[1] صراط مستقیم صفحہ ۵۲-۵۳، ۵۷ تا ۶۱

(ب) ہندوستان میں وہابیت کی بنا و ارتقا

وہابیت کی بنا اور ارتقا کو صحیح عینک سے دیکھنے کے لئے ہمیں ذرا پیچھے ہٹنا اور اسلام کے بعض نمایاں پہلوؤں، عہد بعد ان کے ارتقا اور اٹھارویں صدی میں اسلامی دنیا پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا ہوگی۔

اسلام ایک طرز زندگی ہے جو ایک فرد اور جماعت کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ محض رسوم و عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک طرز معاشرت پیش کرتا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے معنی ہیں اپنی روح اور روزمرہ زندگی کی تربیت و تہذیب۔ لفظا اسلام کے معنی ہیں (خدا کی مرضی پر) سر جھکا دینا اور فرمان بجالانا۔ شروع شروع میں قبول اسلام ڈھیلی اور سہل زندگی میں جس سے قبل اسلام کے عرب خوگر تھے ایک عظیم تغیر رونما ہوا، اور اس میں ایک حد تک اندرونی ضبط اور قوت برداشت شامل تھی مگر جن لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی اور آپ کے مقرب تھے انہوں نے جو آپ کے اسوۂ حسنہ کے سرچشمہ سے سیراب ہوئے یہ تغیر پورا پورا قبول و اختیار کر لیا۔ جن لوگوں نے آپؐ کی پیروی کی ان میں بدقسمتی سے یہ تغیر اتنا کامل نہ تھا۔ کچھ قبل اسلام کے اور غیر اسلامی میلانات ان کے اندر کشمکش کرتے رہے اور آخر میں سطح پر آ گئے۔ یہ میلانات طرح طرح سے ظہور پذیر ہوتے رہے اور سلطانی طرز حکومت کی آرزو یا عربوں کے خلاف جو قرون اولی میں اسلام کے مشعل بردار تھے نسلی و قبائلی ردعمل کی شکلوں میں ابل پڑے۔

ایرانی اور ترک اثرات اسلام کی سیاسی سرحدوں کی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ عربوں کی مذہبی غیر عرب اقوام اور مختلف نئی تہذیب و تمدن سے ہوئی۔ نئی نئی تہذیبی روایات کے انجذاب سے اس ابتدائی عہد میں اسلام کی روح اور ترقی پر

ایک گہرا اثر پڑا۔ اس لحاظ سے عربوں پر مادی طور پر خوشحال، ور تمدنی طور پر ترقی یافتہ ایرانیوں کا اثر نہایت مبہم بات نہیں ہے۔ خلافت عباسی کے دور میں بہت سی ترقیات میں ایرانی اثر کے نشانات صاف نمایاں ہیں۔ ایک مکتبہ فکر کے مطابق تصوف جو ہندوستان کی دینی زندگی پر بھی چھایا رہا ہے ایرانی اثرات کے باعث تھا۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایک اور اہم حادثہ سیاسی اقتدار کا عربوں سے ترکوں میں منتقل ہونا تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی میں جب اسلام ترکوں کے وطن وسطی ایشیا تک جا پہنچا تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا قبول اسلام نسبتہً تازہ تھا۔ اسلامی حکومت کے صدیوں کے دور میں عربوں میں جو کامل تغیر عادات و کردار پیدا ہو گیا تھا وہ ترکوں کے لئے ناممکن تھا۔ ایک زبردست نسلی ملت کی حیثیت سے ترکوں نے سیاست اسلامی کی ڈوبتی ہوئی ناؤ تو منجدھار سے نکال دی لیکن اسلام کا روحانی و اخلاقی زخم ویسا کا ویسا ہی رہا اور مندمل نہ ہوا۔

اسلام ہندوستان میں ترکوں ہی کے ذریعے سے پہنچا۔ ان سے پہلے سندھ پر عربوں کے حملے جو بالکل بے نتیجہ تو نہ تھے ہندوستان کی مغربی سرحدوں تک ہی پہنچ کر رک رہے تھے۔ ان سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اسلام کے سیاسی فاتحین عرب نہ تھے بلکہ نومسلم ترک ہی تھے۔ اس لئے جو اسلام ہندوستان میں داخل ہوا وہ صرف یہی نہیں کہ غیر عرب اثرات سے متاثر ہو چکا تھا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ تھا کہ ہندوستان میں اس کا مقابلہ ایک ایسی مستحکم و مستقل تہذیب و تمدن سے ہوا جو نمایاں طور پر اس سے مختلف و متضاد اور بہت زیادہ قدیم تھا۔ جب جنگوں کی گرد بیٹھ گئی تو ہندی و اسلامی تہذیب و تمدن کے درمیان باہمی تاثیر و تاثر عمل میں آنا شروع ہو گیا۔ اس لین دین کا صحیح گوشوارہ تیار کرنا تو دشوار ہے مگر اتنا واضح ہے کہ ہندوستان میں اسلام نئے ماحول سے بہت متاثر ہوا۔

مغل حکمرانوں کی دین سے بے نیازی: یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے گرچہ اس کی کوئی معقول بنیاد نہیں کہ ہندوستان کے مسلم حکمران اسلام کے حامی تھے اور اس کی اشاعت میں ان کا بہت کچھ ہاتھ تھا۔ مگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا

جاتا ہے کہ ایک دینی حکومت کی کچھ رسمی نمائش اور ٹیم ٹام اور کسی فوجی یا دوسری مصلحت سے کبھی کبھار اس پہلو کو نمایاں کردینے کے باوجود درحقیقت سلطنت کی پالیسی خالصتہً سیاسی، لشکری یا دوسرے مصالح سے بنتی اور چلتی تھی۔ مغل سلطنت کے عروج و علو کے زمانے میں بھی مغل سلاطین خصوصاً اکبر کی مذہبی پالیسی کے بعض پہلوؤں سے نمایاں نارضامندی اور بے چینی کا احساس عام تھا۔ یہ بے چینی تنگ نظری کی بنا پر ہوسکتی ہے مگر تھی ضرور۔ یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ اسلام اپنی اصلی لنگرگاہ سے بہت کھسک گیا ہے اور اس کے اصلاح و احیاء کی ضرورت ہے۔ اور مذاہب کی طرح اسلام بھی ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی احیائی و اصلاحی تحریکوں میں اپنا حصہ رکھتا تھا۔ احیائی حرکت میں سب سے پہلے مسیح موعود کے ظہور کا عقیدہ شامل تھا جو زمانے کے موجودہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مفسدات کا قلع قمع کردیگا اور اسلام کو اس کی اصلی شان و شوکت پر لوٹا لائیگا۔ ایسی بعض تحریکوں میں اکثر سیاسی مقاصد بھی ملے جلے ہوتے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی کی دینی خدمات پہلا شخص جس نے اصلاح و احیائے دین کا جھنڈا ہندوستان میں بلند کیا سید احمد سرہندی تھا یہ مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہیں اور اکبر کے معاصر تھے۔ ہمیں ان کے دینی خیالات و نظریات کی تفصیلات سے یہاں بحث نہیں۔ پھر بھی ان کے بعض خیالات کا مختصر ذکر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی مذہبی زندگی کا مرکز تصوف تھا جس کا لوگوں کی زندگیوں اور دماغوں پر انتہائی تسلط تھا۔ تصوف ایک مشرب ہے جو خدا سے رابطہ اور اس کی معرفت کے لئے باطنی جذبات کو بیدار کرنے کا ضامن ہے — یہ دراصل شریعت کے باطنی اور اندرونی پہلو پر زور دیتا ہے۔ خدا سے ربط و وصل طریقت پر چلنے کے مختلف مدارج و منازل اور ہدایت کے کئی مقامات پر مشتمل ہوتی ہے رفتہ رفتہ طریقت نے شریعت سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی اور ہمہ اوست کا عقیدہ وجود وحدۃ الوجود کے مشہور نظریہ کی شکل میں پیدا ہوکر زور پکڑنے لگا

نے بنیاد رکھی۔ حضرت مجدد کے کاموں اور مساعی کو ان کے بیٹے اور خلفاء نے جاری رکھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ: بہر حال ان کے اصلی مشن کو شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے ہاتھ میں لیا جو اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے ذہنی سورماؤں میں سے تھے۔ اس صدی میں دو عظیم معاصر سلطنتوں (عثمانیہ اور مغلیہ) کا عام زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس زوال نے زمانہ کے بعض مسلم حقیقت شناس علما کے دماغوں کو اس مرض کے اسباب کی جستجو کی طرف مائل کر دیا۔ ان میں عرب کے محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے شاہ ولی اللہ نمایاں تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ابتدائی جمہوری روایات اسلامی کے برخلاف شہنشاہی طرز حکومت کا نفاذ اور اجتہاد کا اختتام اس افسوس ناک صورت حال کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ انہیں دو چیزوں نے مسلمانوں میں من حیث القوم خیالات کی آزادی اور نکتہ پردازی کو ماؤف کیا۔ اسلام بنی نوع انسان کو طرح طرح کی عدم مساوات سے نجات دلانے کی ایک انقلابی تحریک کے عوض کچھ بندھے ٹکے عقائد و رسوم میں منتقل و پابند ہو کر رہ گیا۔ ان کے خیال کے مطابق اسلام کی پوری عمارت کی تعمیر جو ہوئی تھی اس کے پیروؤں کے کردار و صفات پر جو آگے چل کر قرآن و احادیث پر مبنی اخلاقی و روحانی اصول کے تابع ہو گئی۔ یہ عالی خیال بلند نظر شستہ و شائستہ افراد بنی نوع انسان کی ایک اخوت کے لئے ایک زبردست اور مضبوط نظام میں متحد و مجتمع ہو گئے۔ اعضائے رئیسہ میں جب فتور ہو گیا تو سارا جسم مضمحل اور ضعیف ہو گیا تھا۔ ان حالات میں سیاسی انحطاط اور معاشرتی تنزل لازمی تھا۔ اس لئے صرف اعلیٰ طبقہ کے چند افراد پر زور دینا کافی نہ تھا بلکہ من حیث المجموع پوری ملت کی اصلاح پر زور لگانا تھا۔ اسی لئے ایک ہمہ گیر عمومی تحریک کی ضرورت پیش آئی۔ فکر و خیال کی ہمہ پہلو دار حرکت معنی خیز اور قابل غور ہے۔ اُس زمانہ کے اور حالات سے بھی اس احساس کی تائید ہوتی ہے۔

میر قاسم و ٹیپو سلطان: اسی زمانہ میں سیاسی سمندر میں مسلم سیاسی مدبرین ورزمیہ

کی ڈوبتی ہوئی کشتیوں کو پھر بحال کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ بہار میں میر قاسم اور
دکن میں ٹیپو سلطان اپنی دور فروگذاشتوں کے باوجود اس سیاسی احیاء کے زندہ نمونے
تھے۔ ان دونوں نے متفق الرائے ہو کر انگریزوں سے ان کے اعلیٰ فوجی نظام کا
مقابلہ کرنے کے لئے اپنی اپنی فوجوں کو مغربی طرز پر تربیت دلانے اور آراستہ
کرنے پر زور دیا۔ مگر انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ کوئی فرد خواہ کیسا ہی ہو مگر ایک
اپنے گروہ کا سردار ہو جو منظم ہو اور کسی فرد کا وفادار ہو نہ کہ کسی اعلیٰ مقصد کا
اُس قوم کے مقابلے میں جو اعلیٰ تنظیم رکھتی ہو اور ایک قومی مقصد کے جوش سے
سرشار ہو، اس کی ناکامی لازمی ہے۔ ان کی ناکامی ان کی ذاتی کوتاہیوں کے سبب سے
نہیں تھی۔ اصلی اسباب بہت گہرے اور دور رس تھے اور وہ تھے ہندی مسلم معاشرہ
کی تمام معاشرتی ذہنی جڑوں کو گھن لگ جانا۔ سیاسی کشمکش کی جو شاہی طبقہ کی
سربراہی میں چل رہی تھی، ناکامی نے عوام کی توجہ شاہی سرداری سے ہٹ کر دینی احیاء
واصلاح اور ملت کی تنظیم نو کی طرف منعطف کر دی۔

یہ تھا اس تحریک کا سیاسی، سماجی اور دینی پس منظر۔ اس تحریک کے پیچھے عام
معاشرتی، مذہبی زوال اور سیاسی طاقت کا غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلا جانا اس
تحریک کے سر اٹھانے کے دو اسباب تھے۔ در اصل اس تحریک کے لازمی پہلو معاشرہ
کا سدھار اور یورپی کفار سے آزادی کی بازیابی تھے۔ ان میں سے ایک کے حصول
کے لئے مغربی رسمی مذہبی بدعات سے احتراز اور دوسرے کے لئے جہاد کی
طرف رجوع کرنا ضروری تھا جس کے فوائد اور برکات کا بار بار اعلان کیا گیا۔
اس جہاد کو بہر حال عام کشمکش اور جدوجہد کے وسیع مفہوم میں سمجھنا چاہئے
نہ کہ دینی مفہوم میں۔

ے مکتوب سید احمد شہید، مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی نمبر

(۷) وہابیت کی کچھ نمایاں خصوصیتیں

سید احمد کا طریقہ محمدی: اس زمانہ میں تصوف کے چار متعارف و مستقل طریقے رائج تھے۔ چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ[1]۔ سید احمد بریلوی بیعت لینے کی ایک جدید ترکیب پر کاربند تھے۔ پہلے مذکورہ طریقوں پر پھر محمدی طریقے پر جو انہوں نے خود مقرر کیا تھا بیعت لیا کرتے۔ وہ اس کی تشریح یوں کیا کرتے کہ شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ باطنی پہلو روحانی راحت کے حصول کے لئے روح کی تربیت و تادیب سے تعلق رکھتا ہے، اور مذکورہ صوفی طریقے بھی اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ظاہری پہلو انسان کی روزمرہ کی زندگی میں صحیح اور دینی کردار بجالانا   ۔ اور محمدی طریقہ اسی کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس طرح ان دونوں طریقوں میں بیعت لینا روح کی باطنی تربیت اور روزمرہ کے کام کاج، دونوں پر محیط و مشتمل تھا۔ اس انوکھے طریقہ بیعت کی تشریح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ صوفیانہ طریقے اگرچہ ابتدا کی سرمستی و سرشاری سے معرا ہو چکے تھے پھر بھی عام دماغوں میں ان کی جڑیں گہری تھیں۔ لوگ انہیں طریقوں پر بیعت کے خوگر تھے۔ ان کا یک بیک ترک کامل ایک غیر عملی بات ہوتی سی بات ہوتی۔ طریق محمدی میں جو صحیح طرز معاشرت ملحوظ رکھا گیا تھا اس کی تفصیلات خود صراط مستقیم اور مختلف وہابی تحریروں میں کافی شرح و بسط سے درج ہیں۔ ان میں سے دو اصول بہت نمایاں ہیں۔ باری تعالیٰ پر جس کی صفات اشارۃً بھی کسی مخلوق سے منسوب نہیں کی جا سکتی ہیں، سختی سے بلا شرط و قید ایمان رکھنا اور اپنی شخصی زندگی میں عملی اخلاق پر کاربند رہنا۔

اصلاحی تحریک: یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ سید احمد شہید نے جس وہابیت کا پرچار کیا تھا وہ کوئی علیحدہ مذہب نہ تھا جیسا کہ بعض انگریز

---

[1] نقشبندیہ کی ایک شاخ حضرت مجدد کی نسبت سے مجددیہ کہلاتی تھی

مصنفوں بالخصوص ہنٹر[1] نے اشارہ کیا ہے۔ وہ بار بار وہابی تحریک کو ایک مذہب بتاتا
ہے جس کا پیغمبر سید احمد اور جس کا نیا قرآن صراط مستقیم ہے۔ اس سے یہ ثابت
ہوسکتا ہے کہ وہابیت دین اسلام میں خرابیوں کی اصلاح اور اس کی اگلی شان
و عظمت کی بازیابی کی کوشش کے عوض ایک نیا مذہب ہے۔ جیسا کہ نیبوہر[2]
NIEBUHR اور ہنٹر نے غلط اشارہ کیا ہے۔ سید احمد بریلوی اور محمد بن عبدالوہاب
نجدی کوئی بھی پیغمبری کا مدعی نہ تھا۔ یہاں عرب وہابیت پر اس کے بانی کے
کردار سے متعلق ایک مستند مورخ ہے بی فلبی کی ARABIA مطبوعہ لندن
۱۹۳۰ء کے صفحہ ۵۴ سے) کے تبصرہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ "محمد بن عبدالوہاب
کی یاد اب تک ایک عرفی نام سے زندہ ہے جو اول اول اس کے مخالفین نے
تحقیراً مشہور کیا اور بعد میں اس کے متبعین نے قبول کر لیا۔ گو آج تک وہ اپنے
آپ کو اس نام سے موسوم نہیں کرتے، وہ اس مقصد کے لئے جس کی اس نے
بنا ڈالی تھی اور اب تک زندہ ہے پچاس سال کی انتھک محنت و جان فشانی
کے بعد وفات پا گیا۔ اس نے جس مشرب کی تعلیم دی اسے ......
اسلام کی کوئی نئی تاویل قرار نہیں دیا۔ اس معلم نے کبھی پیغمبری کے رتبہ کا دعویٰ نہیں
کیا۔" اگر محمد بن عبدالوہاب پیغمبر نہ تھا تو سید احمد تو اور بھی یہ رتبہ نہ رکھتے تھے۔

وہابی تحریک کی تعلیمات: وہابی اور مسلمانوں سے حقیقتہً مختلف نہیں سوا اس
کے کہ وہ بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

(۱) توحید۔ خدا موجود بالذات اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ وہ اپنی صفات

---

[1] OUR INDIAN MUSALMANS مولفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ص ۵۱-۵۲

[2] CARSTEN NEBUHAR ڈنمارک کے ایک سائنسی مشن کا جو ۱۷۶۱ء میں یمن میں
سربراہ تھا۔ ۱۷۷۲ء میں یورپ واپس آکر تشریح کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ یہ پہلا یورپی
ہے جس نے وہابیوں کے ظہور اور ترقی کی خبریں شائع کیں۔

میں لاشریک ہے۔ روحانی بلندی اور نجات قرآن اور شریعت کے احکام کی پوری پوری بجا آوری میں مضمر ہے نہ کہ خدا کے وجود میں مخلوط ہوجانے کے متصوفانہ جذبات کے اُبھارنے میں۔

(۲) اجتہاد۔ مسلم کو جو حقِ تاویل دیا گیا ہے وہابی اس کے قائل ہیں اور اس حق پر عمل کرنے کی مصلحت پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چاروں بزرگ اماموں، امام مالک امام شافعی امام حنبل اور امام ابوحنیفہ، کے پیرو عملاً اس حق سے دستبردار ہوگئے ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب نے اس موضوع پر کئی رسالے لکھے ہیں جن میں اندھی تقلید کے حامیوں پر نکتہ چینی کی ہے۔

(۳) شفاعت۔ وہابی کسی کے لئے کسی درمیانی وسیلہ کی خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ پرہیزگار ہو اور مقرب الٰہی سمجھا جاتا ہو شفاعت کے عقیدہ کے قائل نہیں۔ انسان خود خدا سے اپنی رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے اور ہر شخص مختار ہے کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر اللہ کی عبادت کرے۔ وہ عمل پر زور دیتے ہیں۔ اصول اسلام پر زبانی اعتقاد کافی نہیں۔

(۴) بدعت وہابی دورِ حاضر کے اُن تمام مذہبی اور سماجی اعمال و رسوم کی مذمت کرتے ہیں جن کی شریعت میں کوئی نظیر یا جواز موجود نہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قبر پرستی، پیروں کی تعظیم میں مبالغہ و افراط، شادیوں میں مہر کی انتہائی گراں رقوم تقریبات جیسے ختنہ اور میلادِ نبویؐ میں زیادہ دھوم دھام اور بیوہ کے نکاحِ ثانی کا امتناع وغیرہ وغیرہ۔

کچھ عمدہ اخلاق و عادات پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی پابندی پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید تو ہے ہی ان کے ساتھ اور نیکیاں بھی حاصل کرنا ہیں جیسے انکساری قناعت اور صبر و استقلال،

لہ مسٹر حافظ وہبہ نے اپنے [illegible] وہابیت کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

اور حرص و نمود، حسد اور غرور کی بیخ کنی۔ سید احمد کی تعلیمات میں آغاز کار سے ہی جہاد بھی، جب دین و معاشرہ کی حفاظت کے لئے کوئی اور صورت باقی نہ رہ جائے، ایک اہم رکن ہے۔[1]

(د) نجدی اور ہندوستانی تحریکاتِ وہابیہ کا تقابلی موازنہ

وہابیت کا اتہام: حضرت سید احمد کا شاندار سفرِ حج ان کی زندگی کا ایک اہم اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ بعض انگریز مصنفوں نے زور دیا ہے کہ سید احمد کا سفرِ حج ان کی زندگی کا ایک انقلابی واقعہ تھا۔ ان کے خیال میں اسی دورانِ سفر میں ان کو نجدی وہابیت سے زیادہ قریب کا رابطہ ہوا۔ اس کے عقائد سے بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان میں ان کی اشاعت کی۔ ایسا ہی ایک مصنف لکھتا ہے۔ "یہی زمانہ تھا جب ایک شخص سید احمد بریلوی مکہ کے سفر سے ہندوستان کو وہ بیج لے گیا جس نے ...... ۱۲۴۲ھ میں ان کی شہادت کے بعد وہابیوں کو کوہِ سیاہ کا دشمن بخش دیا اور اطراف تک اس کی گونج یا جھنڈا پہنچ دیا" ہندوستانی وہابیت پر ایک اور مشہور تر مصنف ہنٹر لکھتا ہے۔ "سید احمد کے قیام مکہ کے دوران میں وہاں کے حکام کی توجہ ان کی تعلیمات کی ان بدو قبائلیوں کے خیالات سے مماثلت کی طرف منعطف ہوئی جن کے ہاتھوں مکہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے۔ علانیہ طور پر ان کی تحقیر کی گئی اور شہر بدر کر دئے گئے۔ اس جور و تعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستانی آئے تو ایک مذہبی خواب بیں اور مشرکانہ بدعتیوں کے مصلح کی حیثیت سے نہیں بلکہ محمد بن عبدالوہاب کے معتقد و مرید کی حیثیت سے۔[2]"

۱؎ صراط مستقیم ص ۱۰۵ تا ۱۱۵

محمد بن عبدالوہاب: ان بیانات کی صداقت کے جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ عرب میں وہابیت کی رفتار کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ عرب میں وہابیت کا بانی محمد بن عبدالوہاب تھا جو ۱۷۰۳ء میں اعینہ میں پیدا ہوا[1] اس نے ابتدائی تعلیم بصرہ اور مدینہ میں پائی۔ اُس زمانہ کا عرب معاشرہ سماجی ومعاشی بداعمالیوں میں اس سے زیادہ نمایاں طور پر مبتلا تھا جتنا ہندوستان کا معاشرہ۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ عرب اسلام کا مولد تھا جس نے عربی معاشرہ کو زمانہ جاہلیت کے معاشرہ سے پاک کیا تھا یہ حالت زیادہ افسوسناک تھی۔ عہد قبل اسلام میں اور تقصیروں کے باوجود عربوں کے پاس ایک منظم تہذیب اور پختہ لٹریچر تھا۔ لیکن اب تو یہ چیز بھی باقی نہ رہی تھی۔

محمد بن سعود: محمد بن عبدالوہاب کی معاشرہ کی اصلاح کی ابتدائی کوششوں نے اُس کو مقامی حکام کی خفگی اور عداوت کا مورد بنا دیا جو اُس کی جلاوطنی پر منتج ہوا۔ اُس نے داریہ (نجد) کے ایک ہمسایہ حکمران امیر محمد بن سعود کے دربار میں پناہ لی ۱۷۶۵ء تک سعود نے نجد کا ایک بڑا حصہ فتح کرلیا تھا جس کا وہ دنیاوی حاکم بن گیا جب کہ محمد بن عبدالوہاب دینی پہلو کا نگران بنا۔ ان دونوں نے مل کر جو نظام حکومت قائم کیا وہ قرآن وحدیث کے احکام کی سخت اطاعت پر مبنی تھا۔ ابن محمد سعود نے اسی سال وفات پائی اور اس کا بیٹا عبدالعزیز اس کا جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی نظام حکومت محمد بن عبدالوہاب کی براہ راست نگرانی میں ۱۷۹۲ء تک اس کی وفات تک چلتا رہا۔

وہابی تحریک کا عروج: اس اثنا میں عبدالعزیز کی سرپرستی میں سیاسی توسیع جاری رہی۔ یہاں تک کہ پورے نجد پر قبضہ ہوگیا۔ حجاز پر بھی حملہ کیا گیا اور بالآخر ۱۸۰۳ء میں مکہ کے مقدس شہر پر بھی قبضہ ہوگیا۔

---

[1] جے بی قلبی مذکور الصدر صفحہ ۸

اسی زمانہ میں وہابیوں نے ان بلادِ مقدسہ کو شرک وکفر کی بعض گندگیوں سے پاک کرنے کا تہیہ کرلیا اور اصلاح کی بعض حد سے بڑھی ہوئی پرجوش حرکات کا ارتکاب کیا . . . . جنھوں نے جمہور مسلمانانِ ہند میں ان کو بدنام کردیا۔ خلافتِ ترکیہ نے عرب کے بیشتر حصہ پر ان کی بڑھتی ہوئی بالادستی کو تشویشناک نظر سے دیکھا اور اپنے متصل ترکی صوبہ جات بغداد و بصرہ کے لئے ایک سیاسی خطرہ تصور کیا۔ ۱۸۰۳ء میں ایک ایرانی شیعہ نے عبدالعزیز کو قتل کردیا۔ اُس کا بیٹا سعود بن عبدالعزیز اس کا جانشین ہوا۔ ۱۸۰۶ء میں ایک بار پھر اُس نے مکہ اور مدینہ پر قبضہ کرلیا جو پہلے ترک حکام نے اس کے قبضے سے نکال لیا تھا۔ سعود نے حجاز میں اپنی طاقت مستحکم کرکے اپنے دائرہ اثر کو شام، عراق اور خلیج فارس کے علاقوں تک وسعت دینے کی کوشش شروع کردی

عثمانی خلیفہ کی مخالفت: اس وقت تک ترک حکام عرب طاقت کے اس احیائے سیاسی خطرے سے پوری طرح متنبہ ہوچکے تھے۔ عثمانی شہنشاہ نظری طور پر ملت مسلمہ کا دینی سردار و خلیفہ اور بلادِ مقدسہ مکہ و مدینہ کا محافظ و فرماں روا تھا۔ ان کا نکل کر وہابیوں کے قبضہ میں چلا جانا خلیفہ کے دینی و دنیوی اقتدار پر ایک ضرب تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے نزدیک بھی خلیج فارس میں وہابی اقتدار ایک شدید سیاسی خطرہ تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں، حکومت بمبئی کیپٹن ڈیوڈ سیٹن اور کرنل (بعد میں جنرل) سرلیونل اسمتھ کے ماتحت ایک بیڑا بھیجا جنھوں نے امام مسقط سے مل کر لڑائی کی اور وہابیوں کو شکست دی۔ ترکوں نے وہابیوں کی سرکوبی کے لئے مصر کے محمد علی پاشا سے بھی مدد لی۔ یہ ترکوں کی ایک باریک دو رخی چال تھی۔ کیونکہ وہابیوں کو شکست دینے میں خود پاشا کی طاقت کے گھٹ جانے کا احتمال تھا۔

وہابیوں کی سیاسی طاقت کا خاتمہ: محمد علی پاشا نے ۱۸۱۰ء میں اپنی تیاریاں شروع کردیں۔ حجاز کو اصلی مہم محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا کے زیرکمان بھیجی گئی جو ۱۸۱۶ء میں سوئیز سے روانہ ہوا۔ اس اثنا میں ۱۸۱۴ء سعود کا بیٹا عبداللہ باپ

کا جانشین ہوا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے ابراہیم پاشا سے شکست کھائی، گرفتار ہوا اور قسطنطنیہ بھیج دیا گیا جہاں سخت عذاب دینے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ وہابی دارالحکومت لوٹ لیا گیا اور آگ لگا دی گئی[1] حکومت ہند نے اس موقع پر ابراہیم پاشا کو مبارکباد دینے کے لئے ایک خاص قاصد بھیجا۔ تاہم حکومت برطانیہ کو اس علاقہ میں جہاں مصریوں نے وہابیوں کو برقرار کر دیا تھا مصریوں کے منصوبوں سے خدشہ پیدا ہو گیا اور کپتان جی ایف سیڈلر کو فوراً بذریعہ DARIA جانے اور عرب کے نئے حکمرانوں سے ان کے منصوبوں پر گفتگو کرنے کے لئے تعینات کیا تاکہ ان کو خلیج فارس کے سواحل پر قدم جمانے کے کسی نئے عزم سے باز رکھا جائے[2]

اس طرح وہابیوں کی سیاسی طاقت تو ٹوٹ گئی مگر جن اخلاقی اور مذہبی اصلاحات کی انھوں نے بنا ڈالی تھی وہ زندہ و پائندہ رہ گئیں۔ یہاں ان کی تفصیل سے ہمیں بحث نہیں۔

ہندوستانی اور عربی وہابیت کا موازنہ: رہا ہندوستانی وہابیت پر عربی وہابیت کے اثرات کا سوال۔ تو اس کی کوئی دستاویزی دلیل یا موثق ثبوت نہیں۔ حضرت سید احمد کی ابتدائی زندگی اس زمانہ میں گذری جب کہ عرب وہابیوں کی جدوجہد نجد تک محدود تھی۔ یہ لوگ عالمگیر روشنی میں بہت بعد میں نمایاں ہوئے۔ سید احمد کے سفر مکہ کو اکثر وہی موقع بتایا جاتا ہے جبکہ عربی اثر سے ان کا سابقہ ہوا اور متاثر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ہنٹر کا قول اوپر نقل ہو چکا۔ لیکن اس امر سے قطع نظر کر وہ بیان کو کسی دلیل سے ثابت نہ کر سکا۔ اس کے خلاف سید احمد کے دوران قیام مکہ میں عرب کے بعض علماء میں ان کی کیا عزت و احترام تھا، مثبت دلیل موجود ہے[3] مولوی عبدالحی نے وہاں کے بہت سے مقامی علما کی درخواست پر صراط مستقیم کا

---

[1] فلبی مذکورالصدر صفحہ ۱۰۲-۱۰۳۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۳

[3] غلام رسول مہر صفحہ ۲۳۶۔ سیرہ سید احمد شہید صفحہ ۲۶۶-۲۶۷

عربی میں ترجمہ کیا اور اس کے نسخے تقسیم کئے گئے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ سید احمدؒ کے سفرِ حج کے زمانے میں بلادِ مقدسہ ترکوں کے قبضے میں تھا۔ تمام نجدی وہابی شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے اور ان کی موجودگی گوارا نہ کی جاتی تھی۔ اس لئے ان سے ملنے جلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ سید احمدؒ مروجہ سماجی دینی صورت حال کا مقابلہ کرنے اور غیر مسلموں سے جہاد کرنے کی ضرورت کا احساس سفرِ حج سے پہلے کر چکے تھے۔ صراطِ مستقیم اس مسئلہ پر واضح دلیل ہے۔

نقطۂ مماثلت: حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبدا ایک ہی ہے قرآن و حدیث، دونوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصولوں کو دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مصر تھے جن میں بنیادی چیز توحید اور ترکِ بدعات پر زور دینا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی التوحید اور شاہ اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان ان بنیادی امور پر زور دینے میں متفق خیال ہیں۔

نقطۂ اختلاف: مگر ساتھ ہی ان دونوں کے درمیان کچھ اہم نقاطِ اختلاف بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نمایاں طور پر ہندوستانی تحریک کا سیاسی پہلو ہے[1] جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی سیاسی آزادی کے لئے جدوجہد پر زیادہ زور تھا۔ عرب میں دوسری صورت حال کی بنا پر یہ پہلو موجود نہ تھا۔ عرب میں سیاسی اقتدار ختم نہیں ہوا تھا اس لئے عرب کے وہابی زیادہ تر سماجی و مذہبی اصلاحات کے علمبردار تھے۔ ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرۂ امتیاز ایک مرحلہ پر مہدوی تحریک سے اس کا اتفاق تھا۔ مہدیِ موعود کے ظہور کے عقیدے سے ہندوستانی وہابیوں نے کثیر ترغیب فراہم کر لیا تھا۔ اس کے بعد سید احمدؒ نے وفات کی۔ مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔

---

[1] آیندہ ابواب میں اس نقطہ پر زیادہ وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے

لہذا ظاہر ہے کہ دونوں تحریکوں میں ظاہری تشابہ ایک مشترک ماخذِ استفاضہ اور یکساں حالات وکوائف کی موجودگی کا نتیجہ تھا نہ کہ ایک دوسرے کے تتبع و تقلید کا۔

باب ۲

سید احمدؒ بریلوی کی زندگی اور کارنامے

(۱) ابتدائی زندگی اور تبلیغی کام

سید احمدؒ بریلی کے سکونت گزیں ایک معزز و معروف مقدس خاندان کے فرد تھے۔ وہ سید محمد عرفان کے فرزند تھے اور صفر ۱۲۰۱ھ (نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیدا ہوئے۔ مورخ نگاروں کے بیان کے مطابق وہ دراز قامت، گورے چٹے، اور قوی الجثہ تھے۔ بھنویں ملی ہوئی، پیشانی کشادہ، ڈاڑھی گھنی اور بشرہ بشاش تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی۔ یہ خیال غلط ہے کہ انھوں نے مدون تعلیم زیادہ نہیں پائی۔ صراط مستقیم کے علاوہ جو انھیں کے افکار و اقوال پر مبنی ہے ہمیں ان کے لکھے ہوئے متعدد رسائل کا پتہ ہے۔ ان کے مکتوبات کا موجودہ مجموعہ جن میں سے کچھ ان کے املا کرائے ہوئے ہیں ان کے علم اور قدرتِ زبان کا واضح ثبوت ہیں۔

سید احمدؒ کے والد کا انتقال ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس کے فوراً بعد وہ روزگار کی تلاش میں لکھنو گئے، وہاں سے دلی چلے گئے۔ جہاں شاہ ولی اللہ کے فرزند اور جانشین شاہ عبدالعزیز سے ملے اور ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۶ء) کے قریب ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ وہابی تحریک کی بعض ممتاز خصوصیات اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

مخزن کی کے مولف سید احمد کی ابتدائی زندگی کے متعدد واقعات بیان کرتے

جن سے بعض مروجہ رسوم وعادات مثلاً اولیاء پرستی ان کے مزارات پر مرادطلبی اور پیروں کی غیر معتدل تعظیم وتکریم وغیرہ سے ان کا اکراہ واختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۹ء) کے شروع میں دہلی سے بریلی لوٹے اور وہاں دو برس مقیم رہے۔ اسی زمانہ میں ان کی شادی ہوئی اور ایک لڑکی مسماۃ سارہ پیدا ہوئی۔ مختصر پیمانے پر وعظ وتبلیغ بھی شروع کردی۔

فوج میں ملازمت: بریلی کے دو سال کے قیام میں سید احمدؒ نے زیادہ وقت اپنے مشن اور اس کی کامیابی کے طریقوں پر غور وفکر میں صرف کیا شروع ہی سے غیر ملکوں کے اجنبی لوگوں کو شکست دینے اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات کی غلاظتوں کو صاف کرنے کیلئے ایک نظام کے قیام کی (جو فوجی ہو تو مرجح ہے) کی ضرورت محسوس کی[1] یہ احساس ہی ان کو ۱۲۲۴ھ (۱۸۱۰ء) میں دوبارہ دہلی لے گیا اور اسی نے پھر کچھ ہی بعد ٹونک میں نواب امیر خاں کی فوج میں شامل ہونے پر آمادہ کیا۔

سید احمدؒ کے بڑے بھائی سید ابراہیم پہلے سے نواب کی فوج میں تھے۔ سید احمدؒ کی پرہیزگاری اور علم وفضل کی بنا پر ان کو فوج میں پیش امام کے عہدہ پر تعینات کیا گیا۔ اس عہدے نے ضمناً ان کو یہ موقع بھی دیا کہ اپنے مذہبی تقرر سے کام لیں، فوجیوں تک اپنی تعلیمات پھیلائیں اور اس طرح ان کے اعمال وکردار میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ مولف مخزن نے اس زمانہ میں اُن کی زندگی کے بہت سے واقعات اور سپاہیوں کی زندگی اور اعمال پر ان کی تاثیرات کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانہ میں کئی فوجی آویزشوں کے دوران ان کے محاربات کی بسم اللہ ہوئی۔

فوج میں شمولیت کا مقصد: امیر خاں کی فوج میں ان کی شمولیت کی ان کے بعض معترضین نے غلط تعبیر کی اور نامنصفانہ رائے زنی کی ہے۔ امیر خاں کی فوج

---

[1] مکتوب سید احمد، از مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی صفحہ ۱۰۲-۱۰۳

میں ان کے شامل ہونے کو ان کی مالی منفعت کی غرض پر محمول کیا اور الزام لگایا
ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے مشن کے لئے ایک فوجی نظام کی ضرورت
کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ امیر خاں کی فوج میں اس لئے شریک ہوئے تھے کہ یوں
یہ نظام ایک مسلح اور تربیت یافتہ تنظیم بن سکتا تھا اور اگر ان کے طرز فکر کے
مطابق اس کا آغاز ہوتا تو یہ معمولی جھڑپوں اور خود اپنی فوج کے قیام سے
بہت بہتر تھا۔ اس طرز عمل کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں
نے امیر خاں کے انگریزوں سے مجوزہ معاہدہ و الحاق سے اختلاف کیا اور آخرکار
انگریزوں سے ان کے الحاق کے بعد کنارہ کش ہو گئے۔ اگر سید احمدؒ کی نیت
صرف مالی منفعت ہوتی تو وہ امیر خاں کی نوکری سے علیحدہ نہ ہوتے۔ انگریزوں
کا حلیف ہو جانے کے بعد امیر خاں سے سید احمد کی امید منقطع ہو گئی اور وہ پھر
دلی لوٹ گئے۔ وہاں کے قیام میں انھوں نے تبلیغ اور بیعت لینا شروع کر دی

شاہ اسمٰعیل و عبدالحی کی بیعت:

اُس زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے داماد شاہ عبدالحی
اور بھتیجے شاہ اسمٰعیل نے سید احمدؒ سے بیعت کی۔ سید احمد کے بعد یہ دونوں
بزرگ اس تحریک کے زبردست اہم سربراہ تھے۔ دونوں بڑے پائے کے
عالم تھے اور اس زمانے کے سب سے بڑے صاحب رشد و تقویٰ خاندان
سے متعلق تھے۔ ان کے شمول نے تحریک کی وقعت کو بہت بلند کر دیا اور
اس کی بعد کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ سید احمدؒ کے ساتھ ان کی عدیم المثال
محبت و رفاقت اور ان کے ساتھ بے اندازہ وفاداری اس تحریک میں جد و جہد
ان کے مرتے دم تک جاری رہی۔ ان کے سوانح حیات علیحدہ مفصل تذکرہ
کے متقاضی ہیں۔[1] شاہ اسمٰعیل معروف بہ شہید نے ۱۲۴۶ھ میں جنگ بالاکوٹ

---

[1] [illegible] شاہ اسمٰعیل کی زندگی پر مختصر بیان [illegible] مگر وہ زیادہ مفصل نہیں۔

میں سید احمد کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ شاہ عبدالحی ان سے پہلے ۱۸۲۸ء میں
وفات پا چکے تھے۔ یہ دونوں مشہور صراطِ مستقیم کے مشترک مولف تھے۔ شاہ اسمٰعیل
بڑے کثیر التصنیف تھے، ان کے رسائل اور مکتوبات تحریک کے اغراض ومقاصد
کی بہت واضح اور زور دار ترجمانی کرتے ہیں۔ تحریک کی مدافعت میں وہ قلم
کے ویسے ہی مردِ میدان تھے جیسے مصافِ جنگ میں تلوار کے سورما۔ جنگ شنکیاری
میں جہاں انہوں نے صرف ایک درجن فاقہ زدہ مجاہدوں کے ساتھ ایک بہت
بڑی سکھ فوج کا مقابلہ کیا اور بے مثال شجاعت کے کارنامے دکھائے، اس کی
ایک دلیل ہے۔ شاہ اسمٰعیل مذہبی عقائد میں انتہا پسندی کا رجحان رکھتے اور ایک
غیر مقلد تھے۔ شاہ عبدالحی نسبتاً اعتدال پسند اور مقلد تھے۔ یہ دونوں ایک دلچسپ
تقابلی مطالعہ کے موضوع تھے۔ ایک جوشیلا زبردست دوسرا خاموش سادہ مزاج۔

تبلیغی دورے: دہلی میں مختصر قیام کے بعد سید احمد نے اپنے مرشد شاہ عبدالعزیز
سے اجازت طلب کی کہ باہر کے لوگوں کی درخواست کی تعمیل میں جو بیعت
کے خواہاں تھے مگر دلی نہ آ سکتے تھے سفر کو نکلیں۔ ان کی سیاحت زیادہ تر گنگا
اور جمنا کے درمیان دوآبہ کے علاقہ اور سہارنپور، شاہجہاں پور، پھلیت، رامپور،
مکھیشور اور بہت سے دوسرے مقامات پر مشتمل تھی۔ یہ سفر جو دراصل ایک
تبلیغی دورہ تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ہاتھ پر ایک انبوہ کثیر نے
بیعت کی اور ان کے متبعین میں ایک عظیم الشان اضافہ ہوا۔

سید احمدؒ اپنا سفر تمام کر کے دہلی واپس آئے، اور اس کے فوراً بعد اپنے
وطن بریلی چلے گئے اور سفر حج کو روانگی تک وہیں مقیم رہے۔ وہاں ان کے ساتھ
ان کے خاص رفقاء جیسے شاہ اسمٰعیل، عبدالحی اور یوسف پھولتی بھی تھے۔ بعد
کے چند سالوں میں شمالی ہند کے بعض شہروں کی ویسی ہی سیاحت کی۔ ایسے
ہی مختصر دورے میں ریاست اودھ کے وزیر نصیر الدولہ کی دعوت پر وہ
لکھنؤ بھی گئے۔ عظیم آباد پٹنہ کے ولایت علی اس زمانے میں اشرف علی کے زیر

نگرانی لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دونوں صاحب بیعت کے ارادے سے نہیں بلکہ زیادہ تر استعجاباً و امتحاناً سید احمد سے ملے۔ مگر وہ ان کی شخصیت سے پہلے ایسے متاثر ہوئے کہ اسی وقت وہیں ان سے بیعت کرلی۔ ولایت علی کا یہ فعل بعد میں عظیم آباد پٹنہ کے خاندان صادقپور کی بیعتوں کا پیش خیمہ تھا۔ اور جس نے آگے چلکر تحریک کی تاریخ پر اتنا دور رس اثر ڈالا۔

بیوگان کا عقد ثانی: اس زمانے میں سید احمد نے مسلمانوں میں بیوگان کے نکاح ثانی کی مروجہ سماجی پابندی سے بے پروائی برت کر ذاتی مثال قائم کی۔ کچھ دن ہوئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے انکی بیوہ سے نکاح کرلیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں یہ پہلا فعل تھا اور یہ ان کی جراُت ایمانی کا نتیجہ تھا۔ بعد میں سید احمد کی اس مثال کی خاندان صادقپور کے ارکان نے پیروی کی اور گرمجوشی سے رائج کردیا۔ وہ بہار میں اس سماجی اصلاح کے سرگرم حامی رہے۔ اس زمانہ کی کارگزاریوں میں ایک اور عظیم الشان کارنامہ صراط مستقیم کی تالیف تھا۔ جو اس تحریک کا سماجی و دینی منشور کہا جا سکتا ہے۔ ان تالیف سے سید احمد کے خیالات منظم نظریوں میں صاف نمایاں ہو گئے۔

سید احمدؒ کے تبلیغی سفر بظاہر دوسرے پیروں کے مروجہ سفروں کے مانند تھے جن میں بیعتیں لی جاتیں اور مذہبی اذکار ہوتے۔ مگر ان کے سفروں کی نوعیت اور تھی۔ ان سے ان کو عوام الناس سے میل جول کا موقع ملتا تھا۔ اور اُن برائیوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا جن میں مسلم معاشرہ مبتلا تھا۔ یہ چند سال خاموش مگر ٹھوس منظم تبلیغی کام کے تھے۔ متبعین کے ایک منتخب گروہ کو آنے والی کشمکش کے لئے فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

اسی موقع پر سید احمدؒ نے سفر حج میں نکلنے کا عزم کیا۔ یہ فیصلہ کچھ غیر متوقع تھا کیونکہ وہ دوسرے سفر کے لئے کافی تیاریاں کر چکے تھے، اور وہ تھا ہندوستان کے برطانوی علاقے سے ہجرت[1]۔ اس عزم کا ایک سبب شاید یہ تھا

[1] مخزن احمدی جلد ا صفحہ ۱۸

کہ اس زمانے میں دین سے سرتابی کے جو واقعات رونما ہو رہے تھے ان میں سے سفرِ حج کی راہ میں ڈاکہ زنوں کے ہاتھوں جان کے خطرے سے تنسیخ حج کا فتویٰ تھا۔ سید احمدؒ شاید چاہتے تھے کہ جیسے انھوں نے بیوگان کے نکاح ثانی کے لئے کیا تھا اسی طرح اس بدعت کو توڑنے کے لئے بھی ذاتی مثال قائم کریں۔

سید احمدؒ کا سفرِ حج: انہوں نے مجوزہ قافلہ میں شرکت کے لئے تمام ملک سے رضاکار طلب کئے۔ ان رضاکاروں کو بریلی میں جمع ہونا اور وہاں سے کشتیوں پر گنگا ندی سے کلکتہ جانا قرار پایا تھا۔ پورا گروہ چار سو افراد پر مشتمل تھا جو چھوٹے چھوٹے دستوں میں منقسم تھا۔ قافلہ آہستہ آہستہ گنگا سے سفر کرتا ہوا، اس کے ساحلوں پر اہم شہروں میں ٹھہرتا ہوا جہاں لوگوں کا بڑھتا ہوا ہجوم بیعت کے لئے جمع ہوجاتا، آگے بڑھتا گیا۔ راستے میں بہت سے عازمین حج آملے۔ یہ سفر شوال ۱۲۳۶ھ (۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء) کی آخری تاریخ میں بریلی سے شروع ہوا[1]۔ افسوس ہے کہ ہمیں سید احمدؒ کے راہ میں مختلف مقامات میں قیام کی تاریخوں اور وقت کا علم نہیں۔ صرف بعض اہم مقامات مثلاً بنارس پٹنہ اور کلکتہ کی آمد کی تاریخیں معلوم ہیں۔

چنانچہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ بریلی سے روانگی اور بعض مختصر توقفوں کے بعد قافلہ بنارس پہنچا (۹-۱۱ ستمبر ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ ۱۰-۱۲ ۱۲۳۶ھ کو بقرعید کا تہوار منایا گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ بھری برسات تھی اس لئے وہ پورے ایک مہینہ ٹھہر گئے۔ بنارس سے روانہ ہو کر وہ اسی روز زمانیہ پہنچے، وہاں ایک رات ٹھہر کر غازی پور پہنچے جہاں کئی روز رہے۔ اسی جگہ سے وہ بہار میں داخل ہوئے۔

سید احمدؒ کی کلکتہ کی دوبارہ آمد و رفت میں بہار سے گذرنے کے دوران کے

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۷۹-۱۸۰

واقعات کسی قدر شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں، اولاً اس لئے کہ تحریک کی تاریخ مابعد میں ان کی بڑی اہمیت ہے، ثانیاً اس لئے کہ سید احمدؒ کے مستند سوانح نگاروں نے ان میں سے بعض واقعات کے متعلق متضاد بیانات کے استقصا کی کوشش کی ہے۔

خاندان صادقپور کی شمولیتِ تحریک: اسی سفر کے دوران پٹنہ کے مشہور خاندان صادقپور کی بیعت ہوئی۔ یہ وہ خاندان ہے جس کی جد و جہد سید احمدؒ کی شہادت کے بعد اس تحریک کی تاریخ پر حاوی و غالب ہے اور جس نے اپنی بے مثال تبلیغی جوش سے اس تحریک کو بنگال بہار اور دکن تک پھیلا دیا۔ اور یہ پٹنہ عظیم آباد ہی تھا جہاں سب سے پہلے آئندہ کشمکش اور آویزشوں کے لئے مجاہدوں کو بھرتی کرنے اور سرمایہ جمع کرنے کی غرض سے مستقل تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پٹنہ کے ورود سے پہلے سید احمدؒ نے گنگا کے دوآبہ کے علاقے میں کئی تبلیغی سفر کئے تھے اور بہت سے لوگوں نے ان سے بیعت کی تھی لیکن اس وقت تک سید احمدؒ کی طرف سے کام جاری رکھنے کے لئے کسی شخص کو باقاعدہ نائب یا خلیفہ مقرر کرنے کے متعلق کوئی واقعہ کسی تحریر میں مذکور نہیں۔ یہ واقعہ پہلی بار پٹنہ ہی میں ظہور پذیر ہوا جہاں ایک سند کے ذریعے سے چار آدمی خلیفہ یا نائب مقرر کئے گئے۔ یہ سند اس قسم کی تنہا دستاویز ہے جو موجود ہے، جس نے خاص طور پر ان کو مجاز و مختار کیا کہ نئے آدمی بھرتی کریں اور اس تحریک کو عام طور پر بہار میں منظم کریں۔ اس تحریک کی تاریخ کے ایک باریک بین مبصر نے ایک معنی خیز تبصرہ کیا ہے: "سید احمدؒ حج سے واپس آکر پٹنہ میں سید محمد حسین اور مشتاقان جہاد کی ایک بڑی جماعت سے ملے۔ ان کے نائبین یا خلفا کی ایک عام مجلس منعقد ہوئی اور ایک عرصہ سے سوچی ہوئی مہم (سرحد میں جنگ)

میں مدافعت واعانت میں آدمی اور روپے کی ترسیل کا ایک مستقل انتظام کیا گیا[1] اس تحریک کے ایک اور تذکرہ نگار[2] نے بھی سید احمدؒ کے سفر پٹنہ کے دوران میں ان کے انتظامی کام کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "سید احمدؒ پٹنہ میں ایک مرکزی تنظیم قائم کر کے گنگا کے کنارے کنارے چلکر کلکتہ پہنچے۔ اس طرح یہ امر واضح ہے کہ سرحد پر حملہ جنگ چھیڑنے سے بہت پہلے خود سید احمدؒ نے پٹنہ کو تحریک کا پہلا منظم مرکز منتخب کر کے غیر معمولی امتیاز دے رکھا تھا۔ بعد کے چند سالوں میں پٹنہ کے وہابیوں نے اس اعتماد کی توثیق کر دی جو سید احمدؒ کو ان پر تھا۔ اور انھوں نے تحریک کی تاریخ میں زبردست حصہ لیا۔"

ولایت علی کی بیعت: خاندان صادقپور کے ایک رکن ولایت علی سید احمدؒ سے قیام لکھنو ہی کے زمانے میں ان سے بیعت کر چکے تھے۔ انھوں نے بیعت پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس نے ان کے طرز زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وہ ایک کھاتے پیتے خاندان کے فرد اور اعلیٰ معیار معاشرت کے پروردہ تھے۔ مگر اس بیعت کے بعد وہ سید احمدؒ کے رفقا میں جا رہے جہاں وہ ایک ذاتی اور معمولی رضاکار کی حیثیت سے کام کرتے تھے[3]۔ خاندان کا ایک پرانا ملازم پٹنہ سے ان کی خیریت دریافت کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اپنے آقا کو ایک مکان کی تعمیر میں مزدور کی طرح مصروف دیکھکر پہچان نہ سکا اور حیرت زدہ رہ گیا۔

مظہر علی کی بیعت! ایک اور معزز شخص جو سید احمدؒ کے دورۂ پٹنہ سے پہلے سے ان کے شناسا تھے شہر پٹنہ کے مظہر علی تھے۔ انکے قیام پٹنہ کے دوران میں سید احمدؒ ان کے گھر گئے جہاں ان کے اور افراد خاندان نے بیعت کی

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ ۱۸۷۰ء صفحہ ۸۳-۸۲ [2] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ ۱۸۸۰ء صفحہ ۳۰۵ [3] غلام رسول مہر جلد ۱ صفحہ ۱۶۹-۱۷۰، تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۱-۱۲

وہ بھی سید احمدؒ کے ایک نائب مقرر ہوئے۔ بیعت کے ان دو مخصوص واقعات
کے سوا سید احمدؒ کا پیغام اب تک بنگال اور بہار کے کسی اور حصے تک نہیں پہنچا
تھا اور شمالی ہند کے بیشتر سفروں میں یہ حصے شامل نہ تھے۔

مذہبی مذاکرے: سید احمدؒ کا اپنے دوروں میں بہار سے گزرنے اور وہاں
قیام کرنے میں ایک ہی قسم کے حالات پیش آئے۔ مختلف مقامات میں مقامی
لوگ ایک کثیر تعداد میں حاضر خدمت ہوئے اور بیعت سے مشرف ہوئے
بعض مقامات پر مذہبی مذاکرے اور خطبے قائم ہوئے۔ بعض جوشیلے اور وفا
شعار مقامی ارادت مند اصحاب منتخب ہوئے اور خلیفہ مقرر کئے گئے جنھیں سید
احمدؒ کی طرف سے بیعت لینے کا مجاز بنایا گیا۔ قافلہ آگے بڑھتا رہا اور یہ
مقامی مرید نئے پیغامات پھیلاتے پھرتے اور نئے نئے ممبر بناتے رہے۔

معتقدین میں اضافہ: اس وقت کے حالات میں سید احمدؒ کے سامنے یہی
ایک راستہ تھا۔ وہ کسی ایک جگہ زیادہ عرصہ تک ٹھہر نہ سکتے تھے اس لئے
وہ اپنا پیغام عوام الناس کے وسیع تر حلقوں میں جو ان کے دورے کی راہ
سے دور واقع تھے یہ کام مقامی خلیفوں کے سپرد کر دیا گیا تھا جو کافی احتیاط
اور توجہ سے منتخب کئے جاتے تھے۔ یہ امر تحریک کو پھیلانے اور معتقدوں
کی بڑھتی ہوئی تعداد کو پہنچانے میں مقامی خلیفوں کی بے خطا اور کامیاب
کوششوں سے عیاں ہے۔ یہ گویا گنگا کی تمام وادی میں بچھائے گئے تھے جو بنیادوں
میں اپنے حیرتناک طور سے پھیلنے والے تھے۔

بکسر میں قیام: بہار کے اندر سید احمدؒ کی جماعت کا پہلا پڑاؤ بکسر میں
ہوا جہاں مقامی قاضی نے کچھ دن قیام کرنے کی درخواست کی۔ آس پاس
کے گاؤں خصوصاً جوسا پڑا سے لوگ کثیر تعداد میں آئے اور بیعت کی۔
بعد میں یہ مقام تحریک کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ ایک رات بکسر میں ٹھہر کر
وہ چھپرہ چلے گئے۔ وہاں بھی مختصر قیام رہا۔ دوسرا پڑاؤ داناپور میں ہوا

جہاں بہت سے مقامی لوگ اور ایسے لوگ بھی جو چھاؤنی کے علاقے میں ملازم تھے ان کے ورود کے منتظر تھے۔ ان کی ایک ٹولی سید احمدؒ کے استقبال اور دانا پور تک لانے کے لئے بنارس جا پہنچی تھی۔ یہاں وہ نسبتۃً زیادہ عرصہ تک ایک ہفتہ ٹھہر گئے۔ دو معزز مقامی اشخاص شیخ علی جان اور محمد سید اپنے اپنے خاندان کے ساتھ بیعت کی۔ مولانا اسمٰعیل و عبدالحی نے کئی خطبے دیئے جن کی تاثیر سے بہت لوگوں نے راہ ہدایت اختیار کی۔

پھلواری شریف میں مذہبی مباحثہ: اسی دانا پور کے قیام کے دوران میں سید احمدؒ نزدیک کی ایک مشہور خانقاہ پھلواری شریف میں تشریف لے گئے۔ اُس وقت اس کے سجادہ نشین شاہ نعمت اللہ تھے۔ پہلے شاہ اسمٰعیل اور بعض دوسرے اصحاب ملنے گئے۔ ان کے بعد سید احمد، عبدالحی، عبدالحق اور کچھ دوسرے اصحاب پہنچے۔ شاہ ابوالحسن فرد خلف رشید و جانشین نعمت اللہ نے ان کی پر تکلف ضیافت کی۔ دوسرے دن عبدالحی شاہ اسمٰعیل کے ہمراہ پھر خانقاہ آئے اور مذہبی مباحثہ منعقد ہوا۔ سید احمد اور شاہ اسمٰعیل علمائے پھلواری شریف کے علم و دانش سے متاثر ہوئے اور اس خانقاہ کو اکثر مروجہ بدعت سے پاک پایا۔

پھلواری شریف کے اس ورود کی تاریخ میں کچھ اختلاف آراء ہے۔ سیرۃ سید احمد شہید کے مؤلف اس ملاقات کو حج سے مراجعت کے دوران میں بتاتے ہیں۔ غلام رسول مہر کا بھی کہنا ہے کہ انھیں سید احمدؒ کے پھلواری شریف جانے کی کوئی شہادت نہیں ملی ہے سوائے ان کی مراجعت حج کے دوران کے۔ مگر وہ سید احمد کے بیرونی سفر سے متعلق کچھ خاندان کے کاغذات اور روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ آخر الذکر بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سید احمدؒ کی ملاقات سے متعلق اصلی کاغذات اور اس موقع پر جو مذہبی مذاکرے ہوئے وہ خانقاہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور دیوان

ابوالحسن فردؔ کے مرتب نے ان سے کام لیا تھا۔ اس دیوان کے تتمہ میں فرد کے سوانح حیات درج ہیں اور سیداحمدؒ کے ورود پھلواری کے واقعات کے ساتھ عبدالحق کا نام بھی مذکور ہے جو سیداحمد کے ہمرکاب تھے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عبدالحق مدینہ سے یمن چلے گئے اور سیداحمدؒ کے ساتھ نہیں لوٹے، اس لئے بظاہر یہ ورود سفر میں جاتے ہوئے ہوا[1] (نہ کہ واپسی میں)۔

پھلواری کے بعد دوسرا پڑاؤ پٹنہ میں ہو جہاں قافلہ دو ہفتے ٹھہرا وہ مدرسہ گھاٹ پر اترا جو شہر پٹنہ کے مشہور مدرسہ سیف خاں کے سامنے ہے۔ نذیر حسین محدث کے سوانح نگار[2] انھیں سے روایت کرتے ہیں کہ قافلہ گول گھر کے قریب شہر کی مغربی سرحد پر اترا تھا اور اس کے قریب کے میدان (لان) میں نماز پڑھی گئی۔ اس جماعت میں ایک جم غفیر شریک نماز تھا جس میں نذیر حسین بھی شریک تھے۔ بہرحال اس مسئلہ پر مؤلف مخزن احمدی کی شہادت زیادہ معتبر ہے کیونکہ وہ خود اس قافلہ کا ایک فرد تھا اور اس کی کتاب اس واقعہ کے صرف بیس سال بعد تالیف ہوئی حالانکہ دوسری کتاب اس کے بہت بعد تالیف ہوئی۔ اس کے علاوہ مدرسہ گھاٹ شہر کے مرکز میں واقع ہے اور گول گھر شہر کی اصلی حدود سے باہر مغربی حد پر ہے۔ شہر کی بیشتر آبادی مشرقی حصہ میں آباد تھی جسے اب پٹنہ سٹی کہتے ہیں۔ شہر کا مغربی علاقہ بہت بعد کی توسیع ہے۔ سیداحمد زیادہ تر اسی مشرقی حصہ میں ٹھہرتے اور کام کرتے تھے اس لئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ قافلہ مدرسہ گھاٹ پر اترا ہوگا جہاں شہر کے علاقے میں جانا مخالف سمت گول گھر سے جانے سے سہلتر اور قریب تر تھا۔ بہرحال یہ بالکل

---

[1] تمدن ہندوستان مع ... ص ۲۰۰ ۔ [2] فضل حسین، الحیات بعد الممات، آگرہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۵-۲۸

ممکن ہے کہ پٹنہ کے قیام کے دوران میں لال میں نماز باجماعت ہوئی ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قافلہ گراں گھر ہی میں کشتیوں سے اترا ہو۔

پٹنہ میں سید احمدؒ کے پہلے ورود کے حالات میں جو ایک طرف سید احمدؒ کے دو معتبر تذکرہ نگاروں، اے ایچ ندوی اور غلام رسول مہر نے اور دوسری طرف جعفر تھانیسری اور عبدالرحیم نے بیان کئے ہیں نمایاں اختلاف ہے۔

خاص نقطۂ اختلاف یہ ہے کہ سید احمدؒ سے خاندان صادقپور کی بیعت اُن کے پہلے ورود میں ہوئی یا ان کے مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد دوسرے ورود میں۔ اس نقطے پر سید احمدؒ کا معاصر اور معتبر تذکرہ نگار، مولف مخزن خاموش ہے۔ ندوی اور مہر دونوں ان دونوں کو پہلے ورود میں بتاتے ہیں۔ مگر جعفر تھانیسری اور عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اگرچہ خاندان صادقپور کے دو معمر افراد شاہ محمد حسین اور فتح علی سید احمدؒ کے پہلے ورود میں ان سے ملے مگر ان کے مختصر قیام کی وجہ سے بیعت نہیں کی بلکہ یہ بعد واپسی سفر حج انجام پائی۔ ان دونوں مورخوں نے جو وجہ بتائی ہے وہ کچھ عجیب سی ہے۔ کیونکہ سید احمدؒ وہاں دو ہفتے قیام پذیر رہے۔ اتنے عرصے میں آسانی سے بیعت ہو سکتی تھی۔ ایک ممکن توجیہ خود ولایت علی کی اُس وقت پٹنہ میں غیر موجودگی ہو سکتی ہے۔ مولف تذکرہ صادقہ کے مطابق ولایت علی اس سے پہلے سید احمدؒ کے عظیم مشن کی تائید کو معجزہ ربانی کے بارے میں اپنے خاندان کو لکھ چکے تھے اور ان سے بیعت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر جب سید احمدؒ پہنچے تو ولایت علی پٹنہ میں نہ تھے۔[1] شاید اسی لئے اس معاملہ کو بہت زیادہ

---

[1] ولایت علی کی سید احمدؒ کے قافلہ اور اپنے گھر سے غیر حاضری بجائے خود ایک معمہ ہے۔ تذکرہ صادقہ کے بیان کے مطابق [illegible] بیعت کرنے کے بعد وہ سید احمدؒ کے ہمراہ دہلی جا رہے تھے جب وہ سید احمدؒ کے اس قافلے میں موجود نہ تھے جو دہلی سے [illegible] اس وقت پٹنہ پہنچے تھے۔ اس سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ دہلی میں رہنے کے بعد وہ [illegible] کے لئے لکھنؤ پہنچ گئے جہاں سے وہ سید احمدؒ سے ملاقات کے بعد یک بیک رخصت ہو گئے تھے۔

اہمیت نہیں دی گئی۔ جب ولایت علی کو یہ معلوم ہوا تو ان کو بڑی مایوسی ہوئی۔ سید احمدؒ کی مراجعت کے وقت تک ولایت علی پٹنہ واپس آچکے تھے اور انھوں نے اور شاہ محمد حسین نے پٹنہ سے آگے بڑھ کر مونگیر میں ان کا استقبال کیا اور اپنے صادقپور کے مکان میں ان کو لے آئے جہاں ان دونوں نے اور مولوی الٰہی بخش نے علیحدہ علیحدہ ان کی ضیافت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمدؒ کے پہلے ورود کے وقت ولایت علی کی غیر موجودگی ہی اس وقت بیعت کے عدم وقوع کا باعث ہوئی۔

اس کے علاوہ اس معاملے میں عبدالرحیم کی شہادت زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے۔ وہ اسی خاندان کے فرد تھے اور اگرچہ وہ اس واقعہ کے سولہ سال بعد پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے تعلقات ان اصحاب سے بہت قریب کے تھے جنھوں نے سید احمدؒ سے بیعت کی تھی۔ اپنے خاندان کے افراد کی جو اس تحریک کی تاریخ میں سربرآوردہ تھے تذکرہ نگاری میں ایسے مسئلہ پر غلطی نہیں کی ہوگی۔ اس کے علاوہ ہنٹر نے اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ کوئی خاص سبب بتایا ہے نہ ذریعۂ واقفیت کا اظہار کیا ہے۔

تبت کے کچھ مسلمانوں سے ملاقات: سید احمدؒ کے پٹنہ میں اقامت کے دوران ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ تبت کے کچھ باشندوں کی ایک ٹولی سے ملاقات ہوئی جس میں چند مرد اور تین عورتیں تھیں۔ یہ سب عازم سفر حج تھے مگر خرچ کے ختم ہونے سے پٹنہ میں رکے ہوئے تھے۔ سید احمدؒ نے ان کو سمجھا دیا کہ حج ان پر واجب ہے جو اس کے سفر کی استطاعت رکھتے ہوں اور چونکہ ان کو مالی تنگی لاحق ہے وہ اپنے وطن واپس جائیں۔ انھوں نے ان کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ان کی

(سید احمدؒ کی) تعلیمات اپنے ملک میں شائع کریں۔ انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کی مراجعت وطن کے لئے روپے دیئے گئے۔[1] انھوں نے اُن کو تبت میں اپنے مشن کی تبلیغ کا مجاز بھی کیا۔

قصبہ باڑھ اور سورج گڑھ میں قیام: پٹنہ کے بعد دوسرا پڑاؤ قصبۂ باڑھ میں ہوا۔ آس پاس سے بہت لوگوں نے آکر بیعت کی، ان میں سے جن کے نام لئے گئے ہیں خواجہ مولا بخش، خواجہ افضل علی، واجد علی خاں۔ شیخ سوبن اور اکرام الحق تھے۔

سید احمدؒ باڑھ کے بعد سورج گڑھ (ضلع مونگیر) پہنچے جہاں سید اور پٹھان خاندان کے بہت سے افراد سکونت رکھتے تھے۔ وہاں بہت سے سربرآوردہ لوگوں نے بیعت کی۔ ان میں سے ایک عنایت حسین تھے جو بہت بعد کے زمانوں تک وہابی فنڈ میں چندہ دیتے رہے۔ آس پاس کے گاؤں اکبر نگر، اُرین اور بیلکھتو کے بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔

راج محل میں قیام: سید احمدؒ سورج گڑھ سے مونگیر آئے اور وہاں ایک روز ٹھہرے۔ وہاں کے ایک معزز مختار زکی الدین نے بھی بیعت کی۔ پھر قافلہ بھاگلپور آیا[2] اور وہاں سامان اور رسد کی خریداری کے لئے ایک روز ٹھہرا۔ بہار میں آخری پڑاؤ راج محل میں ہوا۔ ایک شخص محمدی انصاری تھیں

---

[1] مہر جلد صفحہ ۲۰۹-۲۰ - سیرۃ صفحہ ۲۱۸-۲۱۹

[2] مخزن: بھاگلپور میں شاہ شہباز کے مشہور مزار کے موجودہ سجادہ نشین کے ماموں صادق صاحب کی شہادت کے مطابق سید احمد کی جماعت براری گھاٹ پر ٹھہری رہی۔ مرف مولانا معیب سجادہ نشین سے ملنے وہ آئے کہ اپنے مشن کی تبلیغ کریں۔ مگر شاہ صاحب راضی نہ ہوئے اور قافلہ آگے بڑھ گیا۔ خانقاہ کے کاغذات میں ذکر موجود ہے۔

[3] ان کشتیوں میں دوسرے مسافر بھی تھے۔ [4] آئندہ صفحہ کا فوٹ نوٹ ملاحظہ ہو

نے پہلے میرٹھ میں بیعت کی تھی سید احمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے گاؤں جانے کے لئے آمادہ کیا جو راج محل سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہاں اسکے تمام افراد خاندان نے بیعت کی۔ ان میں سربرآوردہ منشی شاہ محمد، منشی رؤف الدین، مخدوم بخش، حسن علی، فضل الرحمن اور عزیز الرحمن تھے۔ شاہ محمد سفر حج میں سید احمد کے ساتھ ہو گئے۔

کلکتہ میں قیام و روانگی: سید احمدؒ راج محل سے چلکر (صفر ١٢٣٧ھ مطابق ستمبر ١٨٢١ء) کو، مرشدآباد اور کٹوا (ضلع بردوان) میں مختصر قیام کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے کلکتہ میں ان کا قیام سب سے طویل تھا تین ماہ سے زیادہ۔ وہاں بھی مضافاتی گاؤں اور دور دراز مقامات جیسے سلہٹ اور چاٹگام سے لوگ بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔

کلکتہ سے روانگی کے وقت قافلہ ۷۵۰ افراد تک پہنچ چکا تھا۔ یہ دس ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر ایک ٹولی ایک ایک سردار کے ماتحت کر دی گئی تھی۔ متفرق ٹولیاں علیحدہ علیحدہ کشتیوں پر سوار ہوئیں۔ پوری جماعت گیارہ کشتیوں میں بیٹھ گئی۔ سید احمدؒ نے ان کا صرف کرایہ تیرہ ہزار روپے ادا کیا۔ اس میں سے زیادہ تر مختلف مداحوں اور متبعین نے بطور تحفہ عطیہ پیش کیا تھا۔

مراجعت ہند: حج ادا کرنے کے بعد سید احمد ہندوستان لوٹے۔ وہ بمبئی میں اترے اور چند دن وہاں مقام کر کے اسی جہاز سے صفر ١٢٣٩ھ (مطابق اکتوبر ١٨٢٣ء) کو کلکتہ پہنچے جہاں دو ماہ سے زیادہ ٹھہرے۔ ٢٩ شعبان ١٢٣٩ھ کو وہ اپنے وطن بریلی پہنچے۔ واپسی میں وہ کن جگہوں میں ٹھہرے

؎ یہ بزرگ ڈاکٹر اختر احمد اورینوی پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی کے پردادا تھے۔

؎ ملحوظ رہے کہ محمد بن عبد الوہاب ١٧٩٢ء میں وفات پاچکے تھے۔ سید احمد کی ان سے ملاقات یا استفاضہ خارج از بحث ہے (مترجم)

جہاں پہلے جا چکے تھے۔ ان میں مونگیر بھی تھا جہاں کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ مقامی بندوق ساز کارخانے توپ بندوق اور آتشیں اسلحہ کے لئے مشہور تھے۔ وہاں سے متعدد بندوقیں طمنچے اور چار نالی توپیں خریدیں۔ ولایت علی اور محمد حسین جو سید احمدؒ کے استقبال کے لئے وہاں منتظر تھے ان کو پٹنہ لائے۔

احمد اللہ کا عقد! پٹنہ میں ولایت علی نے سید احمدؒ کو اپنے گھر مدعو کیا۔ وہاں بھی خاندان کے تمام افراد نے بیعت کی۔ تیسرے روز احمد اللہ کے والد الٰہی بخش نے اپنے بیٹے کی تقریب یعنی شادی میں سید احمدؒ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ خود سید احمدؒ نے نکاح پڑھایا۔ اس تقریب میں ایک عظیم الشان ضیافت کی گئی جس میں آٹھ سو سے نو سو آدمیوں نے حصہ لیا۔ احمد اللہ کا اصلی نام احمد بخش تھا مگر سید احمدؒ نے دوبارہ ان کا نام احمد اللہ رکھا اور اسی نام سے وہ ہمیشہ مشہور رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا اصلی نام ولی بخش تھا۔ انھوں نے بھی بیعت کی اور نیا نام ولی اللہ رکھا گیا۔

خاندان صادق پور کی اہمیت: خاندان صادق پور کے ارکان کی بیعت ان کے انفرادی اور خاندانی مستقبل کے لئے ایک نقطۂ انقلاب تھا۔ تحریک کے مقصد کی تکمیل اب ان کی تمام توجہات اور طاقتوں کا مرکز بن گئی۔ وہ شمالی و مغربی سرحد کے دور دراز سنگلاخ علاقوں میں فوجی خدمات کے لئے طلب خطرناک جدوجہد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک کے بعض اکابرین اور اہم متبعین کے مختصر سوانح حیات علیحدہ علیحدہ بیان کئے گئے ہیں۔ اس مقام پر سید احمد کے اول خلیفہ یا نائب شاہ محمد حسین کے حالات ایک باقاعدہ سند یا فرمان کی بنا پر جو اس قسم کی تنہا دستاویز ہے اب تک موجود ہے۔

شاہ محمد حسین خلیفہ اول: شاہ محمد حسین شہر پٹنہ کے شاہ محمد معز کے بیٹے تھے اور ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸-۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے

چچا شاہ محمد کریم سے حاصل کی اور ان سے بیعت بھی کی۔ بعد میں اپنے پہلے مرشد کی اجازت سے سید احمد کے ہاتھ پر بھی بیعت کی۔ ان کی شادی دلویرہ (ضلع گیا) کے غلام مجتبیٰ کی دختر سے ہوئی۔ اس شادی کے ذریعے سے وہ بھاگلپور کے مشہور و معروف بزرگ ملا شہباز[1] کے خاندان سے بھی مربوط ہو گئے۔ وہ سید احمد کے اولین خلفا میں سے تھے۔

سند خلافت: وہ نایاب سند جو سید احمد نے ان کو دی تھی اس کی ایک نقل اب بھی موجود ہے۔

اس کے کچھ ضروری اجزا کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اُن لوگوں کو جو راہ خدا کے جویاں ہیں بالعموم، اور اُن لوگوں کو جو حاضر و غائب سید احمد کے خدمت میں ہیں بالخصوص معلوم ہو کہ جو لوگ بیعت کے ذریعے سے مقدس نفوس کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مرید ہو جاتے ہیں ان کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے اور یہ موقوف ہے اس کے رسول کے احکام کی پیروی پر۔ جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ رضائے الٰہی کا راستہ شریعت رسول کے اتباع کے بغیر بھی مل سکتا ہے وہ باطل پر ہے وہ فریب خوردہ ہے۔ اس کا دعویٰ غلط اور ناقابل التفات ہے۔ شریعت نبوی دو باتوں پر قائم ہے۔

اول کسی مخلوق سے خالق کی صفات منسوب نہ کرنا۔

دوم۔ ایسے رسوم و اطوار سے احتراز جو رسول اللہ اور ان کے خلفا کے زمانے میں رائج نہ تھے۔

پہلی شرط کے معنی ہیں (۱) عدم اعتقاد اس بات پر کہ فرشتے، ارواح، پیر و مرشد، استاد، طالب علم، پیغمبر یا ولی کسی مشکل کو رفع کر سکتے ہیں (۲) ان ہستیوں میں سے کسی کو کسی خواہش یا مراد کے حاصل کرنے کے لئے مدد طلب

---

[1] بھاگلپور کے ایک مشہور قدرت شاہ جہاں کے معاصر تھے۔ ان کا بنا کردہ مدرسہ آج تک موجود ہے۔

کرنے سے اجتناب (۳) اس بات سے انکار کہ ان میں سے کسی کو مدد دینے یا ضرر کو دفع کرنے کا اختیار ہے (۴) خدا کی قدرت میں ان کو ایسا ہی مجبور و بے خبر سمجھنا جیسا اپنے آپ کو..... بلکہ ان کو محض اللہ کا حبیب سمجھنا اور ان کو رضائے حق کی راہ کا محض راہنما سمجھنا۔

دوسری شرط یعنی مذہب میں کسی بدعت جدت طرازی کو دخل نہ دینے کے معنی ہیں (۱) معاشرت میں ان تمام عبادات اور رسوم و عادات پر سختی سے پابند رہنا جو عہد نبوی کے معمولات تھے (۲) ایسی بدعات سے احتراز کرنا جیسے رسوم شادی، تعظیم قبور، قبروں پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرنا، مُردوں کی برسیوں میں صرف کثیر، تعزیہ سازی وغیرہ (۳) جہاں تک ممکن العمل ہو ان رسوم کو بند کرنا...

"وہ سب لوگ جو اللہ کے طالب ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ان باتوں کو اپنے سامنے رکھیں اور ایک دوسرے سے مل کر ان پر عمل کریں۔ اور یہ عمل ...... بالخصوص شاہ محمد حسین کے تعاون سے کریں جنھوں نے مجھ سے بیعت کر کے اس کا اقرار کیا ہے اور جن کو میں نے یہ ساری باتیں پوری طرح بتا دی ہیں اور ان کو اختیار دیا ہے کہ وہ تم سے بھی ایسے قریب اور میری جگہ یہ پاکیزہ عادات و اطوار تمھیں سکھائیں۔ اس لئے شاہ محمد حسین موصوف کو مناسب ہے کہ ان احکام کو اختیار کریں جو ان کو بتا دئے گئے ہیں، اپنے جسم و جان سے خدا کی طرف رجوع کریں، اور ان احکام کے ظاہر و باطن پر عمل کر کے شرک و بدعات کی ہر گرد کو جھاڑ دیں جو اُن کے دامن پر پڑی ہو۔ اور لوگوں کو راغب کریں کہ ان سے بیعت کر کے عہد و اقرار کریں۔ خدا کرے میں اور میرے سارے رفقا اس گروہ میں شامل ہو جائیں جو توحید کے معتقد اور شریعت کے متبع ہیں"

مہر

احمد [illegible]

سندِ خلافت کی مہر کی تاریخ میں اختلاف: متذکرہ مہر پر جو تاریخ درج ہے وہ سید احمدؒ کی مراجعتِ حج کے دوران پٹنہ کے ورود کی عام تسلیم کردہ تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ شوال ۱۲۳۶ھ میں بریلی سے روانہ ہوئے تھے۔ پٹنہ کے اس ورود سے پہلے کبھی ان کا محمد حسین سے ملنا کہیں مذکور نہیں۔ اس لئے ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰-۲۱ء) کے اختتام سے پہلے ان کے بیعت لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ سید احمدؒ کے پھلواری شریف جانے کی تاریخ بھی مولانا فرد کے سوانح نگار نے[1] ۱۲۳۳ھ تحریر کی ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو یہ سند کی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر سید احمدؒ اپنے بیرونی سفر میں ۱۲۳۳ھ میں پھلواری شریف گئے تو مراجعت جب کہ محمد حسین نے بیعت کی، ۱۲۳۳ھ میں ہوئی ہوگی۔ مخزن کے زیادہ معتبر ذرائع کے مقابلے میں اس تاریخ کو قبول کرنے میں دشواری یہ ہے کہ فرد کے سوانح حیات بہت بعد کی تالیف ہے اور اس میں سید احمد کے ورود کی جو تاریخ مولف نے درج کی ہے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ بہرحال مخزن اور وقائع میں جو تاریخ مذکور ہے اسے زیادہ معتبر ماننا ہوگا۔ اس صورت میں سندِ خلافت کی تاریخ ۱۲۳۳ھ کی تاویل و توثیق کس طرح ہو؟

تاریخوں کی اس عدم مطابقت کی ایک ممکن تعبیر یہ حقیقت ہے کہ بعض ذاتی مہروں میں تاریخ کندہ ہوا کرتی تھی اور یہ کندہ تاریخیں دوسرے سال کے شروع ہوتے ہی یا اکثر کئی سال بعد تک بدلی نہ جاتی تھیں۔ اس طرح مہر اور متن کی تاریخوں میں فرق موجود ہوا کرتا تھا۔

شاہ محمد حسین کی خدمات: شاہ محمد حسین نے تحریک کی تنظیم کا کام نہایت تن دہی سے شروع کر دیا۔ انھوں نے شہر کی متعدد مساجد میں نماز جماعت اور خطبہ باقاعدہ جاری کر دیا۔ انھوں نے شہر کی بہت سی غیر آباد مساجد میں

---

[1] حکیم شعیب ص ۱۸

مسجد نمو بیبیاں کو آباد کر دیا۔[1] وہ سید احمدؒ کی تعلیمات کے خاص خاص پہلوؤں کی تبلیغ و توضیح کیا کرتے اور ان میں سے بعض پر عمل کر کے ذاتی مثالیں قائم کرتے۔

۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں ساٹھ سال کی عمر میں حج کو گئے اور دو برس بعد واپس آئے۔ انھوں نے ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ ان کے چھ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے چار الٰہی بخش کے بیٹوں سے اور دو دوسروں سے بیاہی گئیں۔ دینیات میں عالم فاضل ہونے کے علاوہ انھیں فوجی تربیت بھی حاصل تھی۔ وہ ممتاز شہسوار اور قادر انداز بھی تھے۔ وہ شاعر بھی تھے (رشی تخلص کرتے تھے) فارسی اور اردو میں شاعری کی تھی۔

پٹنہ سے چل کر سید احمدؒ نے مرزاپور، بنارس اور الہ آباد کے مختصر دورے کئے آخر اپریل ۱۸۲۴ء میں وہ بریلی واپس آئے۔ اس طرح سفر حج اور مراجعت وطن تک تین سال صرف ہوئے اور مجموعی خرچہ ایک لاکھ روپے کے قریب ہوا۔[2]

ہجرت کی تیاری: سید احمدؒ حج مراجعت کے بعد تقریباً دو سال تک زندگی کے ایک سخت ترین سفر کی تیاریوں میں دل و جان سے مصروف رہے۔ یعنی برطانوی ہندوستان کی حدود سے نکل کر شمالی مغربی سرحد کے آزاد قبائلی علاقوں کو مہاجرت، جہاں سے ان کو نئی کشمکش اور آویزش کا آغاز کرنا تھا۔ درمیانی وقفہ سید احمدؒ کے بعض ممتاز نائبین کے تبلیغی دوروں پر صرف ہوا۔ وہ آس پاس کے علاقوں میں دورے کرتے اور اپنے مشن کے اغراض و مقاصد بیان کرتے اور ہجرت میں شرکت کے لئے رضاکار تلاش کرتے۔ رضاکاروں کی ایک کثیر تعداد جو سید احمدؒ سے بریلی میں آملی اور بعد میں شمالی مغربی سرحد میں رضاکاروں کی مسلسل آمد سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی مساعی بہت کامیاب ہوئیں۔

---

[1] مقامی وہابی اب تک وہاں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ [2] مہر جلد ۱ صفحہ ۲۰۲

(ب) مہاجرت اور شمالی مغربی سرحد کی جنگی مہمیں

مجاہدین کی روانگی: حج سے واپسی کے بعد سید احمدؒ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سرحد کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ اس بخت آزما سفر کے لئے تمام سامان مکمل کر لینے کے بعد وہ جنوری ۱۸۲۶ء (جمادی ثانی ۱۲۴۱ھ) کو بریلی سے روانہ ہوئے۔ وہ دریاؤ، فتحپور، گوالیار اور ٹونک کے راستے سے چلے۔ گوالیار کے دوران قیام میں مہاراجہ دولت رام سندھیا نے اپنے محل پر مدعو کر کے ان کی ضیافت کی۔ سندھیا کے نسبتی بھائی ہندو راؤ سے طویل گفتگو رہی۔ پھر سرحد سے بھی سید احمدؒ نے ہندو راؤ کو ایک معنی خیز خط بھیجا۔ نواب ٹونک امیر خاں اور ان کے صاحبزادے وزیر الدولہ سید احمدؒ کے سرگرم متبع تھے اور تحریک کی مختلف جہت سے مدد کی تھی۔ سید احمدؒ ٹونک سے نکل کر راجپوتانہ، سندھ اور بلوچستان کے ریگزاروں سے ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء میں پشاور پہنچے۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے سیاسی حالات: احمد شاہ ابدالی کے تسلط کے بعد شمالی مغربی سرحد پر تاراج کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کے بیٹے اور پوتے تیمور شاہ اور زمان شاہ کی پے در پے حکومتیں اندرونی نااتفاقیوں، بغاوتوں اور فتنہ پردازوں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ پائندہ خاں بارک زئی کے زمان شاہ کے ہاتھ سے قتل نے طاقتور اور بااثر بارک زئی کو دشمن بنا دیا تھا۔ مقتول سردار کا بیٹا فتح خاں زمان شاہ کے بھائی محمود شاہ سے جا ملا جو کابل پر حکمرانی کر رہا تھا۔ دونوں نے زمان شاہ پر حملہ آور ہوئے اور اسے شکست دی۔ اس کے بھائی شاہ شجاع نے محمود شاہ سے کچھ دن جنگ جاری رکھی۔ آخر کار انگریزوں کے پاس پناہ لی۔ انگریزوں نے اس کو پنجاب میں بسا دیا جہاں سے اس کا بھائی زمان شاہ

بھی مل گیا۔ دونوں کو انگریزوں نے سیاسی پناہ اس لئے[1] دی تھی کہ مناسب وقت آنے پر افغانستان میں قدم جمانے کیلئے ان کے اثر سے کام لیا جا سکے۔ محمود شاہ کی کامیابیاں زیادہ تر فتح خاں کی مدد اور تعاون کی بدولت تھیں اس لئے فتح خاں کو حکومت کے معاملات میں زبردست اثر حاصل تھا۔ محمود کے بیٹے کامران کو جس نے فتح خاں کو قتل کرایا تھا یہ بات ناپسند تھی۔ فتح خاں کے بھائی جو برادران بارک زئی کے نام سے مشہور تھے وہ حکومت کے مختلف علاقے جن کے سپرد تھے باغی ہو گئے اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ صرف ہرات اور اس کے کچھ مضافات محمود شاہ کے قبضے میں رہ گئے۔ ان بارک زئی سرداروں میں سب سے مشہور یار محمد خاں، پیر محمد خاں، سلطان محمد خان اور عظیم خان تھے۔ سید احمد کے ساتھ ان کے متعدد تعلقات اور بعد میں مزاحمت آگے چلکر بیان کی جائیگی۔ ان سرداروں میں یار محمد اور سلطان محمد علاقہ پشاور کے حکمراں اور رنجیت سنگھ کے باجگذار تھے۔ وہ دل سے سکھوں کے علاقہ سرحد پر قبضہ کے خلاف تھے لیکن ان کی اندرونی رقابتیں اور باہمی حسد و کینہ سکھوں کے خلاف مل جل کر کام کرنے میں مانع تھے۔

پنجاب کے سیاسی حالات: کیپٹن الگزینڈر برنس کی معرفت کابل کے دورہ اس کے سیاسی مراسلات، پنجاب کی سیاسی حالت اور اس زمانے میں سندھ کے مغرب سکھوں کی حالت سے متعلق قیمتی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔

باہمی قبائلی جنگ و جدل کے سبب سے ایک مدت کے انتشار بدنظمی اور کمزوری کے بعد پنجاب کا زیادہ تر حصہ رنجیت سنگھ کے مضبوط قبضہ میں آ گیا تھا۔ انگریزوں سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور باہمی سیاسی مفادات کے بندھنوں سے منسلک تھے۔ موٹی اور صاف بات یہ تھی کہ ہندوستان کے شمال

---

[1] جے ڈی کننگھم کی تاریخ سکھ صفحہ ۲۱۶-۲۵۶

مشرقی سرحدوں پر روس کی چڑھائی کے خطرے سے رنجیت سنگھ کے ماتحت ایک مضبوط اور پائیدار حکومت اس خطرے کی تنہا روک تھی۔ رنجیت سنگھ بھی اس فرضی خطرے کے عمل میں آنے سے اپنے قرار و قیام کے خطرے سے واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ انگریزوں[1] کی مدد کے بغیر اس خطرے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ معاہدہ امرتسر مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء کی رو سے رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے صلح و ائتلاف قائم رکھنا اور ستلج کے بائیں کنارے پر زیادہ لشکر نہ رکھنا اور سس ستلج کے امان دادہ سرداروں کے خلاف یورش نہ کرنا منظور کرلیا تھا۔ اس کے صلے میں اس کو ستلج کے پار علاقے میں توسیع کا کھلا میدان دیا گیا تھا۔ رنجیت سنگھ انگریزوں سے کھلی آمیزش کے خطرات سے واقف تھا اس لئے زندگی بھر معاہدات کی دفعات کا احتیاط سے پابند رہا، اگرچہ فریقین کے اپنے اپنے حلقۂ اثر کی توسیع کے لئے دونوں میں بہت کچھ بدگمانیاں موجود تھیں۔

ماورائے ستلج کا علاقہ متفرق پٹھان سرداروں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بٹا ہوا تھا جن کا حلقہ اثر اور وفاداری ہمیشہ بدلتی رہتی اور نہایت پیچیدہ، وقتی و عارضی ہوا کرتی۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور برادران بارکزئی مذکورالصدر تھے۔ باقی اگرچہ برائے نام سکھوں کے ماتحت یا زیر دست تھے لیکن ہمیشہ ان کے ساتھ "مارو اور بھاگو۔ باؤ" (گوریلا) کی چال چلا کرتے تھے۔ اس علاقے پر سکھوں کا قابو کسی پائیدار سول (ملکی) حکومت سے زیادہ فوجی قبضے کی قسم کا تھا۔ جب جب قبائیلیوں سے ٹیکسوں یا جرمانوں کی تحصیل کے لئے کوئی مہم بھیجی جاتی تو یہ قبائل اپنی مخفی پناہگاہوں میں جا رہتے۔ اور سکھ ان کے گاؤں کو آگ لگا کر اور برباد کرکے انتقام لیتے۔ ان جفاکش جنگ آزمودہ قبائیلیوں کی جنگی صلاحیت بہت اچھی تھی اور شاید سید احمد کا اس علاقہ کو اپنی جدوجہد کا صدر مقام منتخب کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ ان علاقے میں مع کشمیر سکھوں

---

[1] ایم گریگور کی تاریخ سکھ ص ۲۰۳ - ۲۰۴

ہوتی اگر سیداحمدؒ کے متبعین اس پسپائی میں سہارا نہ دیتے اور ان قبائلیوں کو بہت زیادہ جانوں کے اتلاف سے نہ بچاتے۔ یہ وقوعہ سیداحمدؒ کی سرگزشت سے براہِ راست تعلق تو نہیں رکھتا مگر اس لئے یہاں اس کا ذکر کیا گیا کہ یہ سیداحمدؒ کی جنگی مہمات کے منصوبے میں نقطۂ انقلاب کا حکم رکھتا ہے۔ انہوں نے بڑے دُکھ اور مایوسی کے ساتھ اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ قبائلی جو ان سے آملے تھے ان کی نیّت نہ ہی صاف تھی نہ مطمح نظر میں وسعت و خلوص تھا۔ ان میں سے اکثر کا مقصد حقیر اور ذلیل تھا۔ وہ صرف تاخت و تاراج اور لوٹ مار کے خواہاں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سیداحمدؒ کی تمام جدوجہد میں یہ ایک زہر ثابت ہوا۔ سیداحمدؒ کے جاں نثار متبعین کے گروہ جنہیں "ہندوستانی مجنون" کا لقب دیا گیا اور ان حریص زر قبائلیوں کے مطمح نظر اور نیتوں کے فرق نے ہمیشہ سیداحمد کے فوجی موازنہ و مقابلہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ ناچار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تحریک کی پوری سیاسی اور فوجی نگرانی اور اختیار خود سنبھال لیں۔ اس کے معنی تھے ایک غایت درجے کا مذہبی و سیاسی فیصلہ، یعنی امامت کا اعلان۔

امامت کا اعلان: اسلامی قانون کی رو سے جہاد کی نگرانی و رہنمائی کے لئے ایک امام کا انتخاب ضروری تھا۔ امام کو چند صفات سے متصف ہونا چاہئے جن کی تفصیلات سے ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں۔ سرحد کی فوجی صورت حال ایک ایسے ہادی کی متقاضی تھی جسے کامل اور مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ چنانچہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ ہجری (فروری ۱۸۲۷ء) کو سیداحمد امام منتخب کئے گئے۔ مسلمانانِ ہندوستان کے نام ایک گشتی چٹھی شائع کی گئی جس میں جنگ حضرو تک کے تمام واقعات کا خلاصہ اور ان حالات کی شرح تھی جو امام کے انتخاب کے متقاضی تھے۔ یہ چٹھی[1] ہندوستان

[1] مکتوبات سیداحمد منقولہ سوانح صفحہ ۲۵۰، ۲۴۸-۲۵۰

کے مختلف مراکز میں روانہ کی گئی۔ اس مکتوب میں سید احمدؒ نے لکھا تھا "اس صورتِ حال میں
سب سے عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں مواقع (اکوڑہ و حضرو) پر مجاہدین نے ایک
بے سر کی فوج کا سا برتاؤ کیا اور کوچ کرنے اور لڑنے میں بھی غیر منظم طریقہ برتا۔
اس لئے اس وقت وفادار متبعین، سادات، علمائے شریعت، شرفا و عمائدین اور
جمہور مسلمانان میں سے جو لوگ حاضر تھے سب نے فیصلہ کیا کہ امام کے انتخاب
کے بغیر جہاد کی کامیاب تنظیم اور بے اعتقادی و پراگندگی کا دفعیہ ناممکن ہے" بعض
علما اس تحریک کی تنقیص پر آمادہ ہو گئے اور گھر واپس جاکر اس فیصلے کو خود
مختارانہ اقتدار پر قبضہ کرنے سے تعبیر کیا۔ لیکن جیسا کہ بیان ہوا تحریک کی
اصل غرض کے لئے یہ ضروری تھا، ورنہ یہ غرض معمولی فروعی جھگڑوں کی کھینچ
تان میں کھو کر رہ جاتی۔

قبائلیوں کی بیعت: امامت کے اعلان کے ساتھ متعدد معتقد سرداروں اور اسی
ہزار قبائلیوں نے بیعت کی۔ پشاور علاقے کے کمانڈر برادران بارک زئی نے
بھی خطوط کے ذریعے بیعت کی اور امداد و تعاون کے پیغام بھیجے۔ سید احمدؒ
کے بعض متبعین شروع سے ہی ان دونوں بھائیوں کے خلوص نیت پر شبہہ
کرتے تھے۔ مگر سید احمدؒ نے ان کی زبان پر اعتماد کر لیا۔ انہوں نے تصور
کیا کہ یہ سردار برسوں کے داخلی جھگڑوں اور سکھوں کے ہاتھوں شکستیں کھا کھا
کر احساس کمتری اور کسی معین مقصد کے عام فقدان کے احساس میں مبتلا
تھے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف فتحیابی حاصل کرنے کے لئے آپس میں متحد و منظم
ہو جانے کے بعد ان میں عام خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی اور ان کی متزلزل
وسعت مضبوط ہو جائیگی۔

سرداران پشاور کی علیحدگی: پشاور کے سردار اور دوست قبائلی سرداروں
کے ایک جلسے میں طے پایا کہ قبائلیوں اور ہندوستانیوں کی متحدہ فوج کے ساتھ
سکھوں کے خلاف اقدام کیا جائے۔ چنانچہ دونوں نوشہرہ کی طرف چل پڑے جہاں

اُس وقت تک بدھ سنگھ نے اپنی چھاؤنی لگا رکھی تھی پھر شیدو کی جنگ میں پشاور کے سرداروں نے جن کو بدھ سنگھ سے درغلا کر اپنی طرف ملا لیا تھا، سید احمدؒ کے ساتھ غداری کی اور ان کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستان سے آدمیوں اور سامان کی آمد میں زیادہ وقفہ ہو جانے سے فاقہ اور پریشانیوں کی نوبت آگئی۔ سید احمدؒ نے اپنا پہلا صدر مقام ہنڈ ترک کر دیا اور کچھ عرصہ تک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے یہاں تک کہ آخر میں وہ پنجتار[۱] جا ٹھہرے۔ اسی اثنا کے زمانے میں ولایت علی کے چھوٹے بھائی طالب علی نے جنہوں نے شیدو کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور اکیس برس کے نوجوان تھے پنجتار میں وفات پائی۔

قبائلی علاقوں میں تبلیغی دورے: جنگ کے بعد سید احمدؒ نے آس پاس کے قبائلی علاقے بنیر اور سوات کے تبلیغی دورے کئے۔ انہوں نے لوگوں کو رغبت دلائی کہ ان کے مشن میں شریک ہوں اور اس علاقے میں جو سماجی و مذہبی بدعات پھیلی ہوئی ہیں ان سے تائب ہو جائیں۔ انہوں نے چترال، کشمیر، بخارا اور دوسرے ہمسایہ علاقوں کے حکمرانوں کو بھی خطوط لکھے۔ ان کو ہزارہ کے علاقے کے سردار کی طرف سے بھی تعاون کی سلسلہ جنبانی اور پیغام موصول ہوا جس میں مشہور سکھ جنرل ہری سنگھ نلوا اور گورنر ہزارہ کی ظالمانہ حکومت سے بے چینی کا اظہار تھا۔ ہزارہ کشمیر کی سرحد پر واقع ہے اور اگر اس پر قبضہ کر لیا جائے تو کشمیر کا راستہ کھل جائے۔

کشمیر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ: سید احمدؒ کے نقشۂ جنگ میں کشمیر کو نمایاں جگہ تھی۔ اس پر قبضہ ہو جانے سے ان کو کثیر سامان، مسلمانوں کی بھاری آبادی اور قدرتی مدافعت کا ایک مضبوط خطہ ہاتھ آجائیگا۔ جو سکھوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ ہوگا اور بعد کی فوجی کارروائیوں کے لئے ایک بیس کا کام دیگا

[۱] یہ قصبہ [illegible] تبلیغی علاقے کا صدر مقام [illegible] شہر کو [illegible] تباہ کر دیا تھا موجودہ شہر [illegible] آباد ہوا۔

جن کی خوش حالی اور ترقی کے وہ خواہشمند تھے ان کو بہت ناپسند تھا مگر درانی سرداروں کے عثمان زئی کی طرف بڑھنے سے اُن کا ہاتھ قوی تر ہوگیا۔ انہوں نے اس متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے اور آئے دن کی شرارتوں کی اس بنیاد کے ہمیشہ کے لئے استیصال کیلئے خیبر کے علاقے کے بعض قبائل کے تعاون سے درانی سرداروں کے مرکز پشاور پر قبضہ کر لیا۔ کچھ قاصد جن میں پٹنہ کے مظہر علی بھی شامل تھے ان کے پاس ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے روانہ کئے گئے۔ عثمان زئی کی جنگ (مئی ۱۸۲۸ء) میں درانی سرداروں کو شکست ہوئی۔ مگر پشاور کی طرف پیش قدمی قبائلیوں کی بدعہدی کے سبب سے جن سے اعانت کی امید تھی ایک بار پھر ملتوی کرنا پڑی۔

پنجتار میں دینی اجتماع۔ قبائلی سرداروں کی بار بار بدعہدی اور سماجی مذہبی مفسدات کے جاری رہنے کے پیش نظر سید احمدؒ کو یقینی ہوگیا کہ مقامی لوگوں کے چال چلن میں اخلاقی و مذہبی اصلاح جاری کرنا لازمی ہے۔ اس کے بغیر یہ لوگ تحریک کے صحیح معنی کبھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ تحریک کے مخلص وفادار ہوں۔ چنانچہ پنج تار میں (فروری ۱۸۲۹ء) ایک عظیم مذہبی مجمع منعقد ہوا جس میں اور دن کے ساتھ فتح خاں پنجتاری، زیدہ کے اشرف خاں اور کھادے خاں بھی موجود تھے۔ تمام حاضرین سے۔ زیر نور اس مضمون کا عہد لیا گیا کہ وہ اپنی اپنی قمرو کو شریعت کے مطابق چلائینگے اور مروجہ رسوم و عادات جیسے شراب نوشی، خاندانی جھگڑے، سودخواری کثرت از دواج، متوفی مورث کی بیوی اور بچوں کی اس کے بھائیوں میں تقسیم وغیرہ ختم کردینگے۔ اسلام کے فرض احکام جیسے صوم و صلوٰۃ پر بھی بہت زور دیا گیا۔ مگر اس خصوص میں کامیابی کی وسعت محدود رہی۔

فتح ہنڈ: اب پنج تار سید احمدؒ کی جدوجہد کا صدر مقام ہوگیا تھا ہنڈ کے کھادے خاں کو یہ ناگوار ہوا۔ اس انتقال مکانی کو اس نے اپنی تحقیر تصور

کیا۔ وہ سید احمدؒ کے بعض اور کاموں سے غیر مطمئن تھا۔ ہندوستان سے آنے والی رضاکاروں کی جماعت کو جس کو اسکی قلمرو سے گذرنا پڑتا تھا، ستانا شروع کیا۔ اس نے سید احمدؒ کے دو اہم اور زبردست حامیوں اشرف خاں اور فتح خاں سے بھی چھیڑ خانی شروع کی۔ آخر میں اس نے جنرل ونیٹورا سے نامہ و پیام شروع کیا جو سکھ دربار کی طرف سے مالگذاریاں وصول کرنے کو مقرر بھیجا گیا تھا۔ کھادے خاں نے اُس کو پنجتار پر حملہ کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ مگر یہ حملہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کے فوراً بعد سید احمدؒ نے بالآخر کھادے خاں سے نبٹنے کا پختہ ارادہ کر لیا بعد میں ہونے والی ہنڈ کی جنگ (اگست ۱۸۲۹ء) کھادے خاں نے شکست کھائی اور مارا گیا۔

یار محمد کا خاتمہ: یہ شدید اقدام سید احمدؒ کی مرضی کے خلاف کیا گیا۔ مگر کھادے خاں کی مسلسل زیادتیوں اور سینہ زوریوں اور دشمنوں کے ساتھ اس کے ساز باز نے کوئی اور چارۂ کار باقی نہ چھوڑا تھا۔ چونکہ اسے دو سال بعد پشاور کی فتح کے وقت وقوع پذیر ہونا تھا، اس لئے سید احمدؒ نے ہنڈ کا نظم حکومت اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا۔ اس کے برخلاف ان کی خواہش تھی کہ یہ نظم کھادے خاں کے کسی قرابتمند کو منتقل کر دیا جائے۔ مگر ان قرابتمندوں نے یار محمد خاں کے ساتھ الحاق کی کوشش کی مگر وہ بھی سید احمدؒ کی پالیسیوں سے رضامند نہ تھا۔ اُس نے وہابیوں کی موجودگی سے جسے وہ ان وادیوں کو سید احمدؒ کے زیر اثر آجانے کا موجب سمجھتا تھا نجات حاصل کرنے کا ایک عمدہ موقع تصور کیا۔ یار محمد نے ہنڈ کے غیر مطمئن سرداروں سے ملکر سید احمدؒ کے خلاف چڑھائی کی۔ مگر ان حلیفوں نے شکست کھائی اور یار محمد جنگ زیدہ (ستمبر ۱۸۲۹ء) میں مارا گیا[۱]۔ پشاور میں دستور کا

---

[۱] مہر جلد ۲ صفحہ ۲۵-۲۶-۵۳-۱۱۲-۱۳۶

مالیانہ اور مشہور گھوڑی لیلی کے جس کا رنجیت سنگھ سخت دلدادہ تھا۔ مطالبہ کے مشن پر ناگہانی آمد نے اسے وہابیوں کے ہونے والے حملے سے بچا لیا[51]

تسخیر کشمیر کے منصوبہ کی ناکامی: سید احمدؒ کا ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ کشمیر کو آزاد کرا کے اسے اپنا مستقل مستقر بنا دیں۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے شہزادہ کو جائزہ کی مہم پر ۱۸۲۷ء میں ہزارہ تعینات کیا گیا۔ مگر سید اداوی کے ملک کے سرداروں کی مخالفت نے ان کو فی الوقت اس مہم کو ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا۔ یار محمد کی شکست کے بعد سید احمدؒ کے قدم وادیوں میں ایک حد تک مضبوط ہو گئے تو انھوں نے کشمیر کی طرف پھر توجہ مبذول کی۔ جنگ زیدہ کے فوراً بعد ہی ان کو کشمیر کے ایک مقامی سردار سے یہ پیغام موصول ہوا کہ تربیلا میں سکھوں کی فوجی چوکی میں کوئی فوج موجود نہیں اور آسانی سے اس پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سید احمد کھابل کی طرف بڑھے جہاں کے مقامی سردار نے ان سے آملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر سکھ کماندار ہری سنگھ کو مجوزہ حملے کی بو لگ گئی اور فوراً تربیلا واپس آ گیا۔ اس طرح حملہ کی تجویز دھری کی دھری رہ گئی۔

سرداران ستھانہ کا ایثار: کھابل کی اقامت کے دوران میں سید احمدؒ کی ملاقات ستھانہ[52] کے سید سرداروں سے ہوئی۔ اس مقام کو سرحد پر وہابیوں کا اہم ترین مرکز ہونا مقدر تھا۔ سید خاندان وہابیوں کی محبت اور وفاداری میں ثابت قدم رہا اور اپنی تمام مادی املاک ان پر سے قربان کر دی۔ خود غرضی اور تعصب و تنگ نظری کی پھیلی ہوئی فضا میں ان کی یہ وفاداری در

---

۵۱ میگریگور جلد ۱، صفحہ ۱۹۰ ۵۲ ستھانہ تربیلہ کے مقابل میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ یہ سادات کے ایک مقدس خاندان کا مقام تھا۔ یہ لوگ سرحد پر وہابیوں کے بڑے سرگرم معاون سرپرست تھے۔ بعد میں یہ وہابی جدوجہد کا مرکز بن گیا۔

اور جان نثاری ایک روشن مثال تھی۔ سید اکبر شاہ جس سے سید احمدؒ کی پہلے سے خط و کتابت بھی آپ سے ملنے کھابل آیا اور ستھانہ میں آپ کو مدعو کیا، جہاں پہنچ کر اس کے خاندان والوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس نے سید احمدؒ کو مقامی سرداروں کے تعصب و تنگ نظری اور تلوّن مزاجی سے مطلع کر دیا اور مشورہ دیا کہ ان پر اعتماد نہ کریں۔

پائندہ خاں کی شکست و اطاعت: اس اثنا میں آمب کے سردار پائندہ خاں تناولی کی طرف سے پیغامات وصول ہوئے جن میں سید احمد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کا کردار بھی انقلابی حوادث سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کی گدی نشینی بھی اس علاقے میں سکھوں کی آمد کے ساتھ ہی عمل میں آئی، اور ان کے مقابل اپنی گدی پر مضبوطی سے جما رہا۔ وہ بہادر اور تیز طبع تھا مگر ایک چالاک موقع شناس دشمن کے مقابلے میں برسوں مسلسل اور غیر مساوی جنگوں نے اس کے لطیف پہلوؤں کو بہت مدھم کر دیا تھا، اور اسے ہر چیز اور ہر شخص سے مشتبہ بنا دیا تھا۔ اس کی ریاست کشمیر کے ایک فوجی اہمیت کے رستے پر واقع تھی، اس لئے سید احمدؒ کشمیر کی طرف مجوزہ پیشقدمی میں اس کی حمایت حاصل کرنے کے خیال سے اس سے ملے۔ شاہ اسمٰعیلؒ کے زیر کمان پہلے ایک ہراول دستہ بھیج دیا گیا۔ پائندہ خاں نے بہر حال آمب کے راستے سے کشمیر پر دھاوا کرنے کی تجویز سے اس لئے اختلاف کیا کہ ایسا کرنے سے سکھ خلاف ہو جائیں گے۔ ایسے شخص کی طرف سے جس نے ساری زندگی سکھوں سے مقابلہ لڑنے میں گذاری ہو یہ عذر سخت حیرتناک تھا۔ آخر سید احمدؒ نے زبردستی ادھر ہی سے گذرنے کا فیصلہ کر لیا، اور آمب کی جنگ میں پائندہ خاں کو شکست ہوئی۔ تو ایک عہد نامہ مورخہ مارچ ۱۸۳۰ء کی رو سے وہ نہ صرف راستہ دینے ہی پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ تعاون پر بھی راضی ہو گیا۔ دریائے سندھ کا مشرقی

علاقہ اسی کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا اور کشمیر اور پشاور کی فتح کے بعد جاگیریں دینے کا وعدہ بھی کر لیا گیا۔ آمب کے سردار سے یہ شرائط قبول کرا کے سید احمدؒ نے کشمیر کی طرف بڑھنے کی تیاریاں شروع کر دیں کشمیر سے متصل وادی کاغان میں کوئی کے ضامن شاہ سے بھی مدد اور تعاون کی پیشکشیں وصول ہوئیں۔ پھلیرا کی طرف بڑھنے کی رائے ٹھہری۔ یہ دستہ سید احمدؒ کے بھتیجے سید احمد علی کی کمان میں تھا۔ سکھوں نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ بھاری نقصان ہوا جس میں دستہ کے سردار بھی شامل تھے (۱۸۲۹ء)

رنجیت سنگھ کی پیشکش: متبعین سید احمدؒ کی کارروائیاں اس وقت تک لاہور دربار میں خاصی پریشانی کا باعث ہو چکی تھیں چنانچہ رنجیت سنگھ نے شیر سنگھ الارڈ اور ونیچورا[1] کے ماتحت ایک فوج روانہ کی ساتھ ہی سید احمدؒ کے پاس ایک وزیر منگھ اور عزیز الدین[2] شامل تھے۔ اس نے دریائے سندھ کے پار کا علاقہ سید احمدؒ کو پیش کیا اس شرط پر کہ وہ دریا کے جنوب و مشرق اپنی ترکتاز موقوف کر دیں۔ مگر سید احمدؒ نے یہ پیشکش نامنظور کر دی کیونکہ اس کی رو سے ان کو اپنے اصل ارادہ یعنی انگریزوں کے خلاف اقدام میں تعدیل و تخفیف سے کام لینا پڑتا۔

اُس وقت تک پنج تار سے آمب تک سارا علاقہ سید احمدؒ کی حلیفی میں تھا یا ان کے قبضے میں محفوظ تھا۔ مگر مذہبی و سماجی اصلاح کے اقدامات نے سرداروں اور جاگیردارو

---

[1] یہ دونوں بھاڑے کے یورپی سپاہی ۱۸۲۲ء میں رنجیت سنگھ کی ملازمت میں داخل ہوئے ونٹورا کو رسالے کی کمان دی گئی اور آلارڈ کو پیدل فوج کی ان کی تنخواہ پچاس ہزار سالانہ مقرر ہوئی۔ یہ ماہر سپاہی تھے و سکھ فوج میں ترتیب و تربیت اور نمایاں مہارت کا ذریعہ و آلہ بنے تھے۔ ونیچورا VENTURA کی ملازمت الارڈ ALLARD کی علیحدگی کے بعد تک جاری رہی۔ انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد معاہدہ میں یہ شرط بھی داخل کی گئی کہ انگریزوں کی اجازت کے بغیر کوئی یورپی یا امریکی سکھ فوج میں نہیں رہیگا۔ ایم گر گوجیدا ص ۱۹۰ - ۱۹۱

[2] فقیر عزیز الدین رنجیت سنگھ کے وسیع ترین درباریوں اور مشیروں میں سے تھے۔ اور اکثر اہم خفیہ مشن پر بحیثیت سفیر بھیجے جاتے تھے۔

میں بے چینی پیدا کر دی۔ وادیوں کے بعض سرداروں نے عُشر (۱/۱۰ دہ یک) کی موجودہ رقم بھی ارسال نہیں کی۔ لہٰذا بقایا عُشر کی تحصیل اور احکام شریعت کی پابندی عائد کرنے کے لئے ایک مہم روانہ کی گئی۔ یہ بہت حد تک کامیاب رہی۔ مگر ہوتی مردان کے احمد نے مخالفت کی لیکن جب اس کو قلعہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو پشاور بھاگ گیا جہاں سلطان محمد خاں سردار پشاور اور یار محمد کے بھائی کے ساتھ سید احمدؒ کے خلاف فوج کشی کے لئے سازباز شروع کی۔

سلطان محمد کے دل میں اپنے بھائی یار محمد کی موت کے بعد سے اس کے فاتح کے خلاف ایک تلخی مخفی تھی۔ اس سے کچھ دن پہلے وہابیوں کے ایک چھوٹے سے دستہ پر جو قلعہ ہنڈ پر قابض تھا حملہ کر دیا تھا۔ پھر اُس نے سید احمدؒ کے منتشر پنج تار پر جو اس وقت غیر محفوظ تھا حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ بہرحال سید احمدؒ ہزارہ واپس آئے اور سلطان محمد واپس چلا گیا۔ احمد کے بہکانے سے وہ ایک بار اور سید احمدؒ کے خلاف نکلا۔ چنانچہ مایار کی جنگ، سلطان محمد کی شکست اور بعد میں پشاور پر دھاوا اور قبضہ یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے وقوع میں آئے (اکتوبر ۱۸۳۰ء)

سلطان محمد سے حسن سلوک: فتح پشاور کے موقع پر سید احمدؒ کا کردار بے غرضانہ بلند نظری کی ایک روشن مثال ہے وہ پشاور پر قبضہ کر کے اپنی چھوٹی سی فرماں روائی کی بنیاد ڈال سکتے تھے۔ مگر ان کا مقصد مختلف اور بلند تر تھا اس نے پشاور کی حکومت سلطان محمد کو واپس کر دی۔ اس فیصلہ نے ان کے رفقا میں اُس وقت بھی بے اطمینانی پیدا کی اور اس کے بعد سے دوسرے بھی اس پر نکتہ چینی کرتے آئے۔ اگرچہ بعد کے واقعات نے سید احمدؒ کے متبعین کی بے اطمینانی کا استصواب کیا، مگر ان کا فیصلہ احول اور حالات وقت کے لحاظ سے بالکل درست اور ان کے اعلیٰ اغراض و مقاصد کے مطابق تھا۔

کوئی اور طریق عمل سلطان محمد کے ساتھ طویل عداوت پر منتج ہوتا اور ایسی تباہ کن اور دیرپا جنگ کا سلسلہ چھڑ جاتا جو اصل مقصد کو پسِ پشت ڈال دیتا۔

پشاور میں دینی حکومت کا قیام: حکومت پشاور پھر قائم ہو گئی۔ سید احمدؒ کے متبعین میں سے چند اشخاص حکومت کو احکام شرع کے مطابق چلانے کے لئے پشاور میں متعین کئے گئے۔ مظہر علی پشاور کے قاضی مقرر ہوئے اور بہت سے چند اور اشخاص کا ایک گروہ جس میں قمرالدین بھی تھے ان کے ساتھ متعین ہوا۔ مایار کی جنگ اور پشاور کی تسخیر وہابیوں کے اثر اور سید احمدؒ کے حینِ حیات میں سیاسی توسیع کی نشان دہی کرتی ہے۔ بڑے بڑے ذی مرتبت مقامی سرداروں کی سرکوبی کی گئی اور اب سید احمدؒ اطمینان سے سکھوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کر سکتے تھے۔

مجاہدین کے خلاف سازش: مگر وہابیوں پر ایک سخت مصیبت نازل ہونے والی تھی۔ رقبۂ اثر کی وسعت کے سبب سے وہابیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مختلف جگہوں میں جن میں پشاور بھی تھا، تعینات کر دی گئی تھیں۔ سلطان محمد اور بعض اور قبائلی سردار اپنی فطرت کے مطابق خفیہ طور پر انہیں ٹولیوں پر حملہ کرنے کی سازش کر رہے تھے جنھیں نے اپنی عالی حوصلگی اور سیر چشمی سے انھیں ان کا اقتدار واپس دلایا تھا۔ عوام الناس کو وہابیوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے بعض سماجی اصلاحات جو نافذ کی گئی تھیں اور ان کے خلاف بعض بے بنیاد بناوٹی الزامات سے کام لیا گیا۔ تمام جگہوں میں جہاں جہاں وہابیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں منتشر تھیں ایک خفیہ ناگہانی انقلاب کا انتظام کیا گیا۔ ابتدا پشاور سے کی گئی جہاں مظہر علی قاضی شہر اور دوسروں کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح اور ٹولیوں پر حملہ کر کے فریب سے قتل کر دیا گیا۔ چند آدمی جو بچ گئے تھے یہ داستانِ غم سنانے کو پنجتار پہنچے۔ سید احمدؒ اس سے پہلے اسی قسم کی حرکات سے بے نفسی سے ہمیشہ اس امید پر چشم پوشی کرنے اور

معاف کر دینے کی کوشش کرتے رہے کہ شاید وہ ان کو راہ راست پر لے آ سکیں گے اور اخلاقی ترغیب اور مذہبی تعلیمات سے برضا و رغبت ان کا تعاون حاصل کر سکیں گے۔ مگر یہ انتہائی دغابازی ان کے لئے بھی برداشت سے زیادہ ثابت ہوئی۔

مظفر آباد پر حملہ: ۱۸۳۰ء کے آخر میں سید احمدؒ آخری بار پنج تار سے رخصت ہو کر وادی کاغان کے شمال کو چلے گئے۔ دوسرے سال دس جنوری میں وہ راج دواری پہنچے۔ یہ حربی نقطۂ نظر سے ایک اہم جگہ تھی۔ پکھلی کی وادی کے تمام درّے نظر آتے تھے۔ اس نے فوراً ہی اجد شکیاری سے کچھ بالاتر ایک درہ بھوگرمنگ جو سکھوں کی ایک فوجی چوکی تھی فتح ہو گیا۔ اس جگہ سے ایک بدست کردہ سردار زبردست خان کی اطلاع پر کہ وہ غیر محفوظ ہے ایک اور دستہ مظفر آباد بھیج دیا گیا۔ اس دستہ نے چھاؤنی کے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور سکھوں کی چھوٹی سی ٹولی پر بھی جو بھاگم بھاگ مظفر آباد واپس پہنچی تھی اور گڑھی میں پناہ لے رکھی تھی، حملہ کیا گیا مگر قبضہ نہ ہو سکا کیونکہ مقامی حلیف زبردست خان اور دوسروں کی طرح آخری گھڑی میں ڈگمگانے لگا۔ سید احمدؒ نے اس دستے کو بالاکوٹ بلوا لیا جہاں وہ اپریل ۱۸۳۱ء کو آ گئے تھے۔

شیر سنگھ مظفر آباد پر حملہ کی خبر سن کر فوراً پشاور سے واپس آ گیا۔ لیکن یہ سن کر کہ دشمنوں نے اسے چھوڑ دیا ہے اس نے پہلے گڑھی حبیب اللہ پر مورچہ سنبھالا، پھر بالاکوٹ کی طرف بڑھ گیا جہاں سید احمدؒ خود موجود تھے۔ بظاہر وہ پوری وہابی طاقت کا جو وہاں موجود تھی مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ سید احمدؒ نے بھوگرمنگ، راج دواری، مظفر آباد وغیرہ سے اپنے تمام منتشر دستے بالاکوٹ بلوا لئے تھے جو ان کی زندگی کی آخری جنگ کا منظر بننے والا تھا۔

باب ۳

جنگ بالاکوٹ اور فرائضی تحریک

(۱) جنگ بالاکوٹ

منظورہ[۱] اور وقائع کے بیانات کی بنیاد پر غلام رسول مہر نے اس مشہور جنگ کے مفصل حالات مرتب کئے ہیں۔ یہ حالات اس وقوعہ سے متعلق مکمل ترین اور معتبر ترین ہیں۔ پھر بھی یہ دونوں مآخذ بعض جزئیات خصوصاً جنگ کے آخری چند گھنٹوں کے وقوعات، سید احمدؒ کی شہادت، ان کی نعش کی شناخت اور تدفین وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں بتاتے۔ اور یہ خاموشی قدرتی بھی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اکثر رفقا جو ان کے ہمدوش لڑ رہے تھے شہید ہو چکے تھے۔ جو چند افراد بچ رہے تھے اپنے اپنے مشاہدات کو ذہن میں تازہ و مجتمع کرنے کو جمع ہوئے وہ بہت بعد میں۔ اس کے علاوہ ان میں سے کسی کا بیان چشم دید نہیں۔

جنگ بالاکوٹ کے متعلق اہم دستاویز: خوش قسمتی سے اس واقعہ کی ایک غیر شائع شدہ روایت ہمیں دستیاب ہو گئی ہے۔ یہ رنجیت سنگھ کے دربار کے ایک وقائع نویس کی رپورٹ میں شامل ہے۔ لدھیانہ کے پولیٹیکل اسسٹنٹ سی آر ویڈ نے ان رپورٹوں کے اقتباسات حکومت ہند کو بھیجے تھے۔ اور آخر میں اس [illegible]

۱؎ منظورہ اور وقائع کے مختصر نام گذشتہ اوراق کے حواشی میں بار بار آئے ہیں۔ منظورہ سے مراد ہے منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء مرتبہ سید جعفر علی ساکن مجھولی ضلع گورکھپور، یہ بالاکوٹ کے مجاہدین میں سے تھے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ (مطابق سنہ ۱۸۷۲ء) میں وفات پائی۔ وقائع سے مراد وقائع احمدی ہے جو سنہ ۱۲۷۰ھ کی تالیف ہے۔ ان کے قلمی مخطوطات سے مہر صاحب نے اپنی کتاب سید احمد شہید میں استفادہ کیا ہے۔ مؤلف کا نام مذکور یا موجود نہیں۔ (مترجم)

قیمتی بیان جو تواریخ کے مؤلف مہتاب سنگھ نے دیا ہے، اور پھر ۱۸۵۴ء میں تالیف ہوئی اور جو ۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ریونیو افسر کی حیثیت سے ہزارہ میں متعین تھا، ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔

سطور ذیل میں ہم نے پہلے وقائع اور منظورہ کی بنیاد پر مہر نے جو حالات لکھے ہیں ان کی تلخیص کی ہے پھر تواریخ ہزارہ اور وقائع ذلیبی کی رپورٹ میں مندرج روایات کا پورا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ ان تینوں ذرائع کے تقابلی مطالعہ سے ان اہم واقعات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملیگی۔

بالاکوٹ کا محل وقوع: شیر سنگھ اور سید احمد کی فوجیں دریائے کنہار کے پار ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ بالاکوٹ کا گاؤں دریا کے مغربی کنارے پر ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ شیر سنگھ کی فوج کا پڑاو بالاکوٹ سے تھوڑی دور مشرقی کنارے پر تھا۔ شیر سنگھ دو راستوں سے بالاکوٹ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ بالاکوٹ کے بالمقابل مشرقی کنارے سے دریا پار کرکے، (۲) مٹی کی طرف سے بالاکوٹ کے مغربی پہاڑ پر چڑھکر بالاکوٹ پر چڑھائی کرکے۔ اس نے پہلا راستہ اختیار کیا۔

سید احمد کی فوجی حکمت عملی: مٹی کوٹ پہاڑی کے دامن اور بالاکوٹ کے آباد حصہ کے درمیان کھیتوں کا ایک نشیبی علاقہ تھا۔ سکھوں کے اقدام کو روکنے کے لئے اس نشیبی علاقہ میں بہت پانی چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے دلدل بنا دیا گیا تھا۔ سید احمدؒ نے پہاڑی پر جانے والی پوشیدہ پگڈنڈیوں کی نگرانی کے لئے ایک مختصر سا دستہ متعین کر دیا تھا، مگر یہاں بھی غداری اپنا کام کر گئی۔ پوشیدہ پگڈنڈیوں کا پتہ سکھوں کو بتا دیا گیا اور کسی کمک کے پہنچنے سے پہلے ہی فوراً دستہ کو اچانک زیر کر لیا گیا۔ وہابیوں کے نقشۂ جنگ پر یہ بہت بڑی مصانباتی ضرب تھی، کیونکہ اس کے فوراً بعد سکھ تمام پہاڑی پر چڑھ دوڑے جو بالاکوٹ پر سایہ فگن تھی۔ جب جنگ کی صبح طلوع ہوئی سید احمد نے اپنے آدمیوں کو تھوڑا

کہ سکھوں کو پہاڑی سے نیچے اترنے اور دلدلی کھیتوں سے گزرنے دیں۔ جب سنگھ ہانپتے ہوئے بلندی پر پہنچے جہاں مکانات واقع تھے اُس وقت وہابی فائر شروع کرنے والے تھے۔ اُس وقت کے حالات کے پیش نظر یہ بہترین تدبیر تھی جو اختیار کی جا سکتی تھی۔ جب سکھ پہاڑی سے اترنے لگے تو وہابی، منصوبہ کے مطابق اپنی جگہ پر جمے رہے۔ اس کے بعد سید احمدؒ خود ابتدا کر کے اپنے رفیقوں کے ساتھ پہاڑی کے دامن کی طرف جھپٹ پڑے۔ اب جنگ شروع ہوئی۔ وہابیوں کی مختصر فوج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئی۔ جنگ جم کر ہوئی اور دست بدست۔ سید احمدؒ پہاڑی کے دامن میں بہادری سے لڑتے ہوئے گر گئے۔ کسی نے اُن کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جو مجاہدین ان کے ساتھ لڑ رہے تھے وہ ان کے ساتھ شہید ہو گئے۔

جنگ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بروز جمعہ واقع ہوئی۔

سید احمد کی شہادت: جنگ کے بعد شیر سنگھ نے اپنے دشمن کی لاش کی تلاش کی۔ اس کے سامنے ایک بے سر کی لاش لائی گئی جو سید احمد کی بتائی گئی۔ اس نے اس کی شناخت کرانے کی کوشش کی۔ بعد میں سر بھی مل گیا اور شیر سنگھ نے ان کی لاش کو دریا کے کنارے دفن کرا دیا۔ دوسرے دن لوٹتے ہوئے اس نے دریا کو عبور کیا۔ اس کے دوسرے دن بعض الائیوں نے جو پیچھے رہ گئے تھے لاش کو قبر سے نکال لیا اور دریا میں پھینک دیا۔ سر اور دھڑ بعد میں دریا کے رخ پر دو مختلف جگہوں پر پائے گئے اور سر گڑھی حبیب اللہ میں اور دھڑ تلہٹہ میں دفن کر دئے گئے۔ اُس منحوس دن کے واقعات کی پوری پوری تحقیقات کے بعد بالاکوٹ میں موجودہ قبر کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ مگر یہ متیقن نہیں کہ یہ قبر ٹھیک اسی مقام پر واقع ہے جہاں سے دھڑ کھود کر نکالا گیا تھا۔

تواریخ ہزارہ کی روایت: تواریخ ہزارہ میں یہ واقعات یوں بیان کئے گئے ہیں:۔

غدارانہ قتل کے بعد سید احمدؒ نے پنجتار چھوڑ دیا اور حبیب اللہ خان گڑھی والے ان کو [illegible] دور لے گیا جو سکھوں سے بیزار تھا۔ سید احمدؒ [illegible]

وزیر سنگھ دنگھری کلیا، سادھو سنگھ نہال اور رتن سنگھ کو سنگھو کے دستے لیکر گڑھی حبیب اللہ کی طرف پیچھے ہٹ جانے۔ ان سب کی مجموعی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی۔ بالاکوٹ سے مغرب چند میل پر گڑھی پہنچ کر مہان سنگھ نے قلعہ فتح گڑھ کی مرمت شروع کردی۔ مرمت جاری ہی تھی کہ ایک افواہ پہنچی کہ سید احمدؒ کے لوگ دریا عبور کر کے اچانک حملہ کرنے والے ہیں۔ سکھ بدحواس ہوگئے۔ انھوں نے خندقیں کھودیں اور اُن کو خاردار جھاڑیوں سے گھیر لیا اور توپیں چھوڑ چھوڑ کر نرسنگھے پھونک پھونک کر اور آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر شور غل مچا دیا۔

شیر سنگھ کی گڑھی حبیب اللہ کی جانب پیشقدمی، اُسی وقت انھوں نے ایک تیز رو قاصد بھیجکر اپنی حالت زار کی خبر دی اور اسی رات کمک طلب کی شیر سنگھ نے فوراً اپنی فوجوں کو گڑھی حبیب اللہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ دوسری صبح کو پریشان حال لوگوں نے جنھوں نے رات سخت اضطراب میں گذاری تھی کمک کی صفوں کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔

آئندہ سولہ دنوں میں قلعہ کی پوری مرمت ہوچکی تھی۔ اس کے بعد سکھوں نے اپنا ڈیرا بالاکوٹ سے چھ میل پرے دریا کے مشرقی کنارے پر منتقل کردیا۔

دونوں فوجوں کے کمانڈر اپنی اپنی چھاونیوں سے جن کے درمیان ندی بہ رہی تھی ایک دوسرے کا بغور نظارہ کر رہے تھے۔ شیر شاہ وقتاً فوقتاً اپنے افسروں کے ساتھ گھوڑے پر بالاکوٹ کے مقابل جاکر دوربین سے دشمن کا ملاحظہ کرتا۔

سید احمد کی ایک جنگی چال: ایک روز سید احمدؒ ایک چال چل گئے۔ انھوں نے اپنی جائے قیام کے سامنے کچھ غلے کے دانے بکھر دئے جن کے چننے کو چڑیوں کا ایک بڑا جھنڈ اُس جگہ جمع ہوگیا۔ ساتھ ہی انھوں نے سکھوں کی چھاؤنی کے پاس ندی کے پار پانسو سپاہی بھیج دئے کہ جھاڑیوں میں چھپ جائیں۔ جب شیر سنگھ نے دشمن کے کیمپ کے روزانہ ملاحظہ کے دوران دوربین سے دوسری طرف چڑیوں کے ایک بڑے جھنڈ کو منڈلاتے دیکھا تو سمجھا کہ وہاں شاید اُس جگہ کو

چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے۔ اُس نے ایک نگران ٹولی کو دوسری طرف دیکھنے اور رپورٹ کرنے کو بھیج دیا۔ سید احمد نے جن سپاہیوں کو اُدھر گھات لگانے کو بھیجا تھا انھوں نے اُس ٹولی کو گھیر لیا۔ اس میں سے صرف دو آدمی ندی تیر کر پار ہوئے۔ دوسرا اپنی ڈرگت منائی۔

سکھ فوج کا ماڑی کوٹ پر قیام: شیر سنگھ نے پھر مشورہ کیا کہ سید احمد پر کس طرح حملہ کیا جائے۔ طے پایا کہ فوج کا ایک حصہ تو اپنی جگہ پر رہے اور ایک ہزار توپچیوں کا محفوظ دستہ قلعہ اَرَی کے تھانیدار تیک سنگھ کے ساتھ کیمپ کی حفاظت کرے۔ بقیہ فوج نے ایک محفوظ مقام پر ندی پار کی اور بائیں طرف سے گذر کر ماڑی کوٹ کی پہاڑی پر جم گئی۔

ہزارہ اور شنکیاری کے محفوظ دستے بھی ایک دردستے سے ٹکرائی ہو کر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہابیوں کی وہ چھوٹی سی ٹولی جو چوٹی کو جانے والے پوشیدہ راستے کی حفاظت کے لئے تعینات تھی مغلوب کرلی گئی اور اس میں سے تین چار شہید ہو گئے، باقی بھاگ نکلے۔ سید احمد نے ایک امدادی ٹولی بھیجی جو اتنی دیر سے پہنچی کہ اس تھوڑی سی حفاظتی ٹولی کی کوئی مدد نہ کر سکی، وہ لوٹ آئی۔ سکھوں نے پہاڑی کی چوٹی پر رات گذاری۔

چوٹی پر پہنچ کر سکھوں کو ایک سخت پریشانی کا سامنا ہوا۔ کہیں پانی دستیاب نہ تھا۔ مگر ان کی خوش قسمتی سے بادل گرجا اور اُن کے کیمپ پر اولے برسے۔

دوسری صبح کو حملہ شروع ہوا۔ پہلے فیصلہ ہوا کہ ایک چھوٹے سے دستے سے چوٹی کی حفاظت کی جائے چنانچہ ہزارہ کی فوج کے ساتھ مہان سنگھ اور جوالا سنگھ بھڈانا کے چچا لکھمیر سنگھ وہابیوں پر حملہ کرنے کے لئے بھیجے گئے، بقیہ فوج چوٹی پر رہے اور حالات کے مطابق کمک بھیجتی رہے۔ جب حملہ آور ٹولیاں نیچے اُتریں شیر سنگھ اٹاری والا نے کہا کہ فتح کی (اگر حاصل ہوئی) رپورٹ کرتے ہوئے یہ اچھا نہیں معلوم ہوگا کہ صرف یہی دو مہاندے تھے نہ شکست کی

رپورٹ میں یہ اچھا معلوم ہوگا۔ علاوہ بریں اگر انھوں نے شکست کھائی تو بچے ہوئے آدمیوں کا دشمنوں کے مقبوضہ علاقے سے ہوکر دہور تک پہنچنا ناممکن ہے اس لئے ان کا ایک ساتھ حملہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔

آغاز جنگ: مٹی کوٹ پہاڑی کے دامن میں کچھ نشیبی زمین تھی اس کے بعد ایک بلندی پہ بالاکوٹ کا گاؤں واقع تھا جس میں سید احمدؒ اور ان کے رفقا تیر کمان اور زنبورک لئے تیار بیٹھے تھے۔ فریقین کے درمیان توپ اندازی کا تبادلہ شروع ہوا سکھ کشمیر سے ایک توپ اٹھا لائے تھے۔ انھوں نے اسے نصب کر کے گولے برسانے شروع کر دئے۔ صبح سے دوپہر تک گولوں کا تبادلہ تیزی سے جاری رہا۔ مہان سنگھ اور جوالا سنگھ دونوں سرداروں کے علمبردار وہابیوں کے گولوں سے مقتول ہوئے۔ اور جھنڈے گرنے لگے۔ دوسرے سکھ ان کو اٹھانے کو تیزی سے جھنڈوں کو گرتا دیکھ کر بالاکوٹ میں جتنے وہابی تھے۔ باہر نکل آئے۔ سید احمدؒ اور خود مولوی اسمٰعیل نے حملے کی رہنمائی کی اور اس نشیبی زمین کی طرف جھپٹے جو فریقین کے درمیان واقع تھی۔ اور چلائے کہ دشمن پسپا ہو رہا ہے اور تم کو حملہ کرنا چاہئے۔ اور وہابی بھی اس پہاڑی کی طرف بڑھے جہاں سردار اتر سنگھ کلیان دالا اور گورمکھ سنگھ لہنا کی سپاہ ایک طرف جمی ہوئی تھی۔ مہان سنگھ اور کنور شیر سنگھ کی سپاہ بھی وہاں آپہنچی اور جنگ میں شریک ہوگئی۔

سکھوں کی پسپائی: سکھوں نے پہلے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ شیر سنگھ نے اپنی تلوار کھینچ لی اور چاہتا تھا کہ خود میدان جنگ میں گھس پڑے لیکن مہان سنگھ اور دوسرے سرداروں نے اسے تنہا جانے کو منع کیا۔ لیکن اس نے ان کا کہنا نہ مانا اور سکھوں کو آگے بڑھنا شروع کیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے سکھوں کو گالیاں دیں ان پر پتھر پھینکے اور پھر میدان جنگ میں ڈھکیل دیا۔

مجاہدین کی شہادت: اس نے شیام سنگھ اور پرتاب سنگھ کے پاس قاصد بھیج کر توپیں جلانے کا حکم دیا اور دوسرا قاصد اسی پیغام کے ساتھ اتر سنگھ کے پاس

بھیجا۔ انھوں نے گولہ باری شروع کردی۔ اُس نشیبی زمین میں خلیفہ[۱] سید احمدؒ کے ساتھ ۱۸۷ وہابی گر گئے۔ چار سو ہندوستانی بھی جو سید احمدؒ پر جان چھڑکتے تھے گر گئے۔ سید احمدؒ کی نعش میں داہنے ہاتھ اور سینہ پر بائیں پستان کے نیچے گولی کے نشان تھے۔

بقیہ وہابیوں نے جن کی تعداد کوئی اَسّی ہوگی تین بار اپنے سردار کی نعش اُٹھا لانے کی کوشش کی مگر سخت گولہ باری کے سبب سے ناکام رہے۔ آخر ایک وہابی ان کا سر کاٹ کر اٹھا لے گیا۔ (یہ بالکل ناقابل قیاس ہے۔ مسلمان لاش کے مسخ اور قطع و برید کو گناہ سمجھتے ہیں۔ سید احمدؒ کا کوئی متبع اپنے عزیز جاں سردار کی نعش کے ساتھ یہ سلوک روا نہ رکھ سکتا تھا) اُس شخص کے گولی لگی اور سر کو لیکر آگے بڑھنا ناممکن دیکھکر اس نے اس کٹے ہوئے سر کو سرسوں کے انبار میں چھپا دیا۔

سکھ گاؤں میں داخل ہوئے اور سید احمدؒ اور دوسرے لوگوں کے گھروں کو آگ لگادی۔ آٹھ زنبورک، ایک ہاتھی، دس گھوڑے اور دس خچر پکڑے گئے۔

سید احمدؒ کی لاش کی شناخت: شیر سنگھ نے میدان جنگ کے معاینے میں سید احمدؒ کی نعش دیکھی اور اسے کسی معزز کی نعش سمجھکر اپنے کیمپ میں لے گیا اور اپنے آدمیوں سے اس کی شناخت کا انتظام کرنے کو کہا۔ نواب خاں تناولی کو جو دو تین برس سید احمد کے ساتھ رہ چکے تھے شیر سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ سر کے بغیر شناخت دشوار ہے لیکن بتایا کہ سید احمدؒ کے جسم پر کچھ امتیازی نشانات تھے۔ اُن کے پاؤں کے سب ناخن ناقص تھے۔ چنانچہ کفن ہٹانے پر سب ناخن واقعی ناقص پائے گئے۔ پھر بھی کچھ شبہہ باقی رہ گیا تھا۔ اس اثنا میں عالم خاں تناولی ایک ملازم نے آگے بڑھکر کہا کہ "میں سید احمدؒ کے سر کا پتہ بتا سکتا ہوں اگر پچیس روپے کا انعام عنایت ہو۔" شیر سنگھ نے جھٹ اُسے پچیس روپے دے دئے اور ۲۵ سوار اور ۲۵ پیادے اس کے ہمراہ تعینات کردئے۔ اس نے چھپایا ہوا سر بتادیا۔ جب سوار سید احمدؒ کا سر لئے واپس جارہے تھے کچھ سپاہی

اُسے غلطی سے وہابی سوار سمجھکر مشتعل ہونے لگے۔ بعد میں جب ان کی شناخت ہوگئی تو سب نے چین کی سانس لی۔ سر دھڑ کے پاس رکھ دیا گیا۔ نواب خان تنولی کو پھر بلایا گیا اور انھوں نے ٹھیک ٹھیک شناخت کرلی۔ نعش چند مسلمانوں کے حوالہ کردی گئی جو سکھ فوج کے نوکروں میں سے تھے۔ وہ تمام رات قرآن شریف پڑھتے رہے اور دوسرے دن نعش کو شیر سنگھ کی اجازت سے کنہار ندی کے کنارے ایک قبر میں دفن کردیا۔ دوسرے دن شیر سنگھ رخصت ہوگیا اور دو سردار رتن سنگھ اور لکھمیر سنگھ کو حکم ہوا کہ اپنی زیر نگرانی سارا سامان گڑھی حبیب اللہ کو منتقل کردیں اور تمام فوج ندی عبور کرے تو یہ بھی اسی کے پیچھے چلے جائیں۔ شیر سنگھ کی عدم موجودگی میں ان دونوں سرداروں نے آپس میں یہ سازش کی کہ سید احمد نے اپنی زندگی بھر ان کو بہت تکلیفیں دیں۔ اب اگر ان کی میت قبر میں رہنے دی جائے تو مسلمان اسے ایک مرکز پرستش بنالیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ اسے قبر سے نکالکر ندی میں پھینک دیا جائے۔ سات آٹھ نہنگ[1] بھی پاس ہی کھڑے تھے دونوں سرداروں نے ان کو پچیس روپے دئے اور کہا کہ اگر تم خلیفہ سید احمد کی نعش کو قبر سے نکالکر ندی میں پھینک دو تو یہ بڑے پُن ثواب کی بات ہوگی۔ انھوں نے فوراً تعمیل کی اور نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ندی میں پھینک دی۔ اس کے بعد دونوں سردار نوشہرہ کی طرف کوچ کرگئے اس کے بعد شیر سنگھ کے ساتھ لاہور میں داخل ہوئے۔

خلیفہ[1] سید احمد اور کنور شیر سنگھ کے درمیان جنگ ٢٧ رجب کو ١٨٨٧[2] میں مطابق ٧ مئی ١٨٣١ء کو ہوئی

(تمام شد بیان تواریخ ہزارہ)

---

[1] اس کتاب میں سید احمد کو خلیفہ ہی سے ملقب کیا گیا ہے۔ (مترجم)

[2] درحقیقت مسودہ میں ١٨٣٠ء درج ہے۔ مشتبہ یہ کاتب کا سہو ہے کیونکہ مذکورہ سمت سال ١٨٨٧ جو مطابق ہی درج ہے ١٨٣١ء سے مطابقت رکھتا ہے نہ کہ ١٨٣٠ء سے

ویڈ کی روایت :-

ویڈ نے دیسوہا چھاؤنی سے ۷ارمئی ۱۸۳۱ء کو ایک مراسلہ میں وقائع نویس کی رپورٹ مورخہ ۱۰رمئی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:-

"کنور شیر سنگھ اور بھیم سنگھ (؟) مہان سنگھ، گورنر کشمیر کے مراسلات اس مضمون کے پہنچے ہیں کہ سید احمدؒ کے دو بھد میں دشوار گزار پہاڑیوں میں ہونے کی اطلاع ملنے پر ان لوگوں نے اپنے پڑاؤ سے چل کر اُن پر حملہ کر دیا۔ ریاست کی فوجیں ان پہاڑیوں کے استحکامات اور دروں سے ناواقف تھیں اس لئے ان کو شکست ہوگئی اور تین سو آدمی ہلاک اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ اس لئے آویزش کو جاری رکھنا ناممکن دیکھ کر وہ سات آٹھ کوس پیچھے ہٹ گئیں اور چھاؤنی قائم کی۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا ارادہ فوراً حملہ کرنے کا تھا مگر ان کی چھاؤنیوں میں غلہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ ایک روپے میں ۵ سیر ہے۔ یہ خبر سنکر مہاراجہ نے اپنے نجومیوں سنکرناتھ اور دینا سودن کو بلا بھیجا اور حالات بتا کر ان سے احکام نجوم سے یہ معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی کہ آیا کنور شیر سنگھ اپنے مجوزہ حملہ میں کامیاب ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم حساب لگا کر عرض کر دیں گے۔"

ویڈ نے مزید لکھا کہ متذکرہ اطلاع بھیجنے کے بعد دربار میں خطوط موصول ہوئے جن میں مذہبی دیوانوں کی کامل شکست کا اعلان کیا گیا تھا۔ "سید احمدؒ نے ایک مستحکم مقام بالاکوٹ میں چھاؤنی ڈالی تھی۔ شیر سنگھ وہاں جاکر حملہ آور ہوا۔ سید احمدؒ نے اپنی جگہ چھوڑ کر حملہ کا مقابلہ کیا اور مغلوب ہو گئے ...... سید احمدؒ کی نعش کی شناخت کی گئی اور سکھوں نے اس کو جلا دیا۔"

وقائع نویس کی رپورٹ: بعد میں محمد بن چھاؤنی سے ایک خط مورخہ ۱۸رمئی ۱۸۳۱ء میں وقائع نویس کی ایک اور رپورٹ مورخہ ۱۴رمئی ۱۸۳۱ء یوں نقل کی "کنور شیر سنگھ کا ایک مراسلہ موصول ہوا کہ سید احمدؒ نے دو تین ہزار آدمی کے ساتھ جن میں زیادہ تر لوگ دون کے کسان تھے مدکوٹ (؟ بالاکوٹ) میں ندی کے پار پڑاؤ کیا۔ وہ اکتوبر ۸ رتاریخ

کو دوپہر کے وقت گاؤں کے بعض زمینداروں کی مدد سے پرتاپ سنگھ، ہاری سنگھ، رتن سنگھ گھر جاکر اور دوسرے سرداروں کی فوجیں بیک جن میں پانچ ہزار آدمی تھے اور ایک پایاب نالہ پار کر کے دشمن کو اچانک آلیا، اور اُس کو ہر طرف سے گھیر کر لاٹھیوں سے تلواریں کھینچ لیں اور سید کو اُس کے پانسو آدمیوں سمیت قتل کر دیا اور اس کے خیموں، سامان، ہاتھی، متعدد برزوں، اونٹ، آلات، اور تلواروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کی فوج کے باقی لوگوں نے بھاگ کر جانیں بچائیں۔"

تواریخ ہزارہ کی روایت جس کی طرف کوئی اعتنا نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ منفردہ اور وقائع اور بعد کی دوسری شرح شدہ کتابوں کے بعض مبہم مقامات کی توضیح کرتی ہے۔

یہ بیگٹ اور میسن کے بیان کی توثیق کرتی ہے کہ سکھوں نے وہابیوں کے پہلے حملے کے دوران کیا کیا پسپائیاں اور آفتیں جھیلیں۔

یہ سید احمدؒ کے محفوظ مقام سے نکل کر نشیبی زمین میں مانی کوٹ کے دامن کے نزدیک سکھوں سے ٹکر لینے کے اچانک اور عجیب فیصلے کی توضیح بھی کرتی ہے۔ غالباً یہ سکھوں کے دو گرتے ہوئے جھنڈوں کا منظر تھا جس نے وہابیوں کو یہ سمجھ کر کہ سکھ پسپا ہوا چاہتے ہیں شدت سے حملہ آور ہونے کی ہمت دلائی۔

مہر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلے منصوبے کا ایک بیک ترک کر دینا حیرت انگیز تھا، اور سید احمدؒ کے بعض رفقا کا خیال تھا کہ وہابیوں کی شکست کا سبب یہی ہو۔ لیکن مہر نے ان کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے اور یہ رائے قائم کی ہے کہ منصوبہ غالباً اس لئے ترک کیا گیا کہ سکھ جنوب سے بھی چڑھائی کرنے لگے اور دریا پار سے بالا کوٹ پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ تواریخ ہزارہ میں ان دونوں واقعات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اگرچہ وہ ہر جہت سے جنگ کی تفصیلات سے بہت معمور ہے۔ مہر خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کا تذکرہ مفروضہ واقعات پر مبنی تو نہیں مگر صورت حال کی تشریح کے لئے بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔ مگر

تواریخ ہزارہ میں دوسرا سبب بیان کیا گیا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔

منظورہ اور وقائع سے ظاہر ہے کہ دونوں فوجیں دریا کے پار کچھ دیر تک ایک دوسرے سے مقابل رہیں۔ مگر یہ ماخذ ٹھیک وقت نہیں بتلاتے۔ منظورہ سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ شیر سنگھ کے آنے کے بعد گڑھی کی مرمت پر سولہ دن صرف ہوئے اور اس کے فوراً بعد جنگ چھڑی۔

یہ مسودہ اُن کی معین تعداد بھی بتاتا ہے جو سید احمدؒ کے آخری چند گھنٹوں میں ان کے دوش بدوش لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

وقائع نویس کی رپورٹ میں سکھوں کی پسپائی کا جس میں تین سو سپاہی ہلاک ہوئے جو ذکر ہے، وہ واقع ہوئی ہو گی مہان سنگھ کی سپاہ سے جھڑپ کے دوران میں جب گڑھی کی مرمت ہو رہی تھی۔

جنگ کی تاریخ کے بارے میں تینوں ماخذ تین مختلف تاریخیں بتلاتے ہیں گو ان میں بہت زیادہ فرق زمانی نہیں۔ مہر کی بیان کے مطابق ۶ مئی، تواریخ ہزارہ کے مطابق ۷ مئی اور وقائع نویس کی رپورٹ کے مطابق ۸ مئی آخرالذکر کی تاریخ تحریر ۱۰ مئی ۱۸۳۱ء ہے اور زمانہ وقوعہ سے قریب ترین ہونے کے سبب سے سب سے زیادہ اقرب الی الصواب۔

(ب) سید احمدؒ کی سرحدی جنگوں کے سیاسی نتائج

سکھوں کی تاریخ پر عام تالیفوں میں سید احمدؒ اور سکھوں کے درمیان جنگوں کے واقعات کی طرف یا تو زیادہ اعتنا نہیں کی گئی یا بالکل ترک کر دیئے گئے۔ اس کا سبب ایک تو اس موضوع پر انگریزی میں مواد کی نادستیابی ہے۔ پھر بھی جو منتشر حوالے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمدؒ کی کارروائیوں اور مساعی پر سکھ دربار نے جو دھمکی دی تھی وہ بالکل بے معنی نہ تھی۔ اگرچہ سید احمدؒ براہِ راست سیاسیات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے ان کی جنگوں کا ایک اہم سیاسی نتیجہ ضرور ظاہر ہوا۔

رنجیت سنگھ کی سندھ سے دلچسپی: ۱۸۰۹ء کے معاہدہ کے وقت سے ہی رنجیت سنگھ کی نظریں سندھ اور خاص کر کے شکار پور پر گڑی ہوئی تھیں۔ حکومت برطانیہ اوّل اوّل اس سلسلے میں سکھوں کے عزائم اور حرکات کو دور سے دیکھتی رہی، اس معاملے میں اس کی اپنی کوئی خاص پالیسی نہ تھی۔ پی این کھیرا نے اپنی مختصر مگر عمدہ تالیف میں صورت حال کو جامعیت سے یوں بیان کیا ہے:-

"۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۰ء تک کا ایک عشرہ (۱۸۲۵ء میں ایک معمولی استثنا کے ساتھ) عدم مداخلت اور نگرانی و چشم گماری میں امتیاز رکھتا ہے (یعنی ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی پالیسی)۔ ۱۸۲۵ء سے جب کہ رنجیت سنگھ کی فوج خوب منظم تھی، لارڈ ولیم بنٹنگ کے اوائل عہد تک جب کہ حکومت برطانیہ نے اپنی عدم مداخلت کی پالیسی بدل کر پرامن تجارتی منصوبے کی خاطر سندھ میں دلچسپی لینا شروع کی۔ اس وقت رنجیت سنگھ سندھ پر حملہ کر سکتا تھا اور شاید اس ملک کا ایک حصہ لے بھی لیتا، اور برطانیہ کی مداخلت درکنار کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔"[1]

---

[1] پی این کھیرا BRITISH POLICY TOWARDS SIND UP TO ANNEXATION, 1843 لاہور ۱۹۳۱ء صفحہ ۸

یہ واقعہ ہے کہ برطانیہ کو اُس وقت تک سندھ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رنجیت سنگھ نے یہ محسوس کر کے اپنی مجوزہ فوج کشی کے لئے اس بہانے سے تیاریاں بھی شروع کر دیں کہ وہ خراج وصول کرنا ہے جو امیروں نے حکومت افغان کو ادا کیا، حالانکہ رنجیت سنگھ اس حکومت کی وراثت کا مدعی تھا۔ مگر صوبہ شمالی مغربی میں ایک نئے خطرے کے رونما ہو جانے سے اُس کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ سکھوں کے ایک زبردست دشمن سید احمد نے مسلح مخالفت شروع کر دی اور کئی سال تک اس سکھ راج کی تمام تر توجہ اپنی طرف جذب رکھی۔ اس طرح گرچہ سید کو کنور شیر سنگھ نے ۱۸۳۱ء میں شکست دی اور قتل کیا مگر سندھ کو تتار کے پنجے سے بچانے والے بالواسطہ وہی تھے[2] ۱۸۳۲ء تک جب کہ رنجیت سنگھ نے اس خطرے سے نجات پائی تو اس نے دیکھا کہ سندھ کے متعلق انگریزوں کی نیت بدل گئی ہے۔

سید احمد کی شہادت پر رنجیت سنگھ کا اظہار مسرت: سید احمدؒ کی شکست اور شہادت سے رنجیت سنگھ کو بڑا اطمینان ہوا۔ ویڈ نے اپنے متذکرہ مکتوب میں لکھا ہے[1]:
"رنجیت سنگھ اپنی اس فتح پر پھولا نہ سماتا تھا جس نے اس کی حکومت کو دائمی خلفشار اور بے چینی سے نجات دلائی۔ اس نے اس واقعہ کی یاد میں توپوں سے سلامی دینے اور شہر امرتسر میں چراغاں کرنے کا حکم دیا۔ جو قاصد یہ خوشخبری لایا تھا اُسے ایک جوڑا سونے کے کنگن قیمتی تین سو روپیہ، ایک پگڑی اور شال کا جوڑا عنایت ہوا۔ کنور کو ایک خط میں اس کے خط کی رسید، اُس کے اعلیٰ کارناموں کا اعتراف اور اُس کے واپس آنے کے بعد مزید جاگیر کا وعدہ تحریر کیا۔ گووند گڑھ کے گورنر فقیر امام الدین کو بھی ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ قلعہ کی ہر توپ سے گیارہ گیارہ گولوں کی سلامی داغی جائے۔

حکومت ہند نے بھی اپنے پولیٹیکل اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ گورنر جنرل کی طرف

---

[1] ایضاً صفحہ ۹ – ۲۰۷

سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اس فتنے کی آگ کے ٹھنڈی ہوجانے پر جو اس شخص
(سید احمد) نے برانگیختہ کر رکھی تھی مبارکباد پیش کر دے۔

نظریہ غیبوبت سید احمد: سید احمدؒ کی زندگی کے آخری لمحات سے متعلق واقعات
راز میں ملفوف رہے۔ اس لئے ان کے واقعی خاتمہ کے متعلق ایک نزاعی بحث پیدا ہوئی
جو کچھ مدت تک جاری رہی۔ سب سے آخر میں ان کو ایک گھمسان دست بدست
معرکہ میں لڑتے دیکھا گیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہوگئے۔ کسی نے ان کو گرتے ہوئے
اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس لئے وہابیوں کے ایک طبقے میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا
تھا کہ سید احمدؒ شہید نہیں غائب ہوگئے ہیں اور آئندہ کسی وقت پھر ظاہر ہوں گے۔
منطق اور عقل کی روشنی میں سید احمدؒ قطعاً اسی جنگ میں شہید ہوگئے۔ مگر بالاکوٹ
کے باقی ماندہ لوگوں اور ان کے بہت سے رفقا و متبعین کے لئے یہ ناگہانی
شدید ضرب ناقابل برداشت تھی۔

انھوں نے ایک مقصد عالی کے حصول کے لئے اپنی تمام زندگی
اللہ کو قربان کر دی تھی اور سید احمدؒ کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کر رہے
تھے۔ لیکن اب قسمت کی ہوشربا ناگہانی برگشتگی سے سب مٹ چکا تھا۔

غیبوبت کے نظریے کا یہی منظر ہے۔ دراصل یہ ایک جذباتی ردعمل تھا
ان کے مادی حرکات و سکنات کے منظر سے ان کے محبوب مرد راہنما کے یک
بیک اٹھ جانے اور مر جانے پر یقین کرنا ان کے لئے دشوار تھا۔ یہ نظریہ ان کے اس
راسخ عقیدے کا ایک مقدس سایہ بھی تھا کہ سید احمدؒ جسمانی طور پر فنا ہوگئے ہوں
تو ہوگئے ہوں مگر ان کا مشن فنا نہیں ہو سکتا۔

ہٹلر اور سبھاش چندر بوس کی موتیں ہمارے عصر کے واقعات ہیں۔ ان کی
موتیں بھی پردۂ راز میں مخفی تھیں۔ اول الذکر کی موت کے متعلق حکومت ہند
کی مسلسل تحقیقات کے باوجود ان دونوں لیڈروں کے مومنوں کے ایک

طبقے میں ان کی زندگی کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔ اگر محض سیاسی لیڈروں کے لئے ایسی محکم وفاداری و جاں نثاری ہو سکتی ہے تو ایسے شخص کے لئے جو صرف سیاسی لیڈر نہیں بلکہ حسنات و خیرات کا کامل نمونہ تھا اس کے متبعین میں جو گرم جوشی اور سرشاری محبت و عقیدت پیدا ہوئی ہوگی قیاس کی جا سکتی ہے۔

عقیدۂ ظہور ثانی: صادق پور کے ارکان خاندان خصوصاً ولایت علی پر انگریز اور ہندوستانی مصنفوں نے سید احمد کے ظہور ثانی کے عقیدہ کی اشاعت[1] پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ اُن پر اس عقیدے کی اشاعت میں دانستہ بے ایمانی کا الزام عائد کیا گیا ہے کہ ولایت علی نے اس مقصد سے یہ قدم اُٹھایا ہے کہ تحریک کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو پھر اُبھارا جا سکے اور اس جد و جہد میں اپنی سرداری بحال رکھی جائے[2]۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ عقیدہ ایک وقتی ہیجانی ردعمل تھا۔ اس پر سختی نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس تحریک کی خدمات جو ولایت علی اور ان کے بھائی عنایت علی نے انجام دیں وہ اتنی ٹھوس تھیں کہ اتنے سے موہوم فائدہ کے کمزور سہارے کی محتاج نہ تھیں۔

امتداد زمانہ کے ساتھ جو تمام زخموں کو مندمل کر دیتا ہے اس عقیدے پر ایقان کی شدت بھی ہوتی گئی۔ ایک دستاویز[3] مورخہ ۱۸۴۵ء میں خاص طور پر مذکور ہے کہ ۱۸۳۹ء کے قریب جب عنایت علی نے اول اول اس تحریک کی قیادت سنبھالی تو اس عقیدے کی بنیادی اہمیت باقی نہ رہی تھی۔ اگر لوگوں کا میلان ہوتا تو یہ عقیدہ رکھ سکتے تھے ورنہ نہ تو اس پر کوئی جبر تھا نہ اس عقیدے کے منکروں پر کوئی الزام عائد کیا جاتا۔ خود سوانح احمدی کے مؤلف (جعفر تھانیسری) جو شروع میں یہ عقیدہ رکھتے تھے، امتداد زمانہ کے ساتھ اس سے دست بردار ہو گئے۔

---

[1] رسالہ دعوت ولایت علی مشمولہ رسائل تسعہ

[2] "آور انڈین مسلمانز" مؤلفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ ۴۸-۴۹۔

[3] پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کا مخطوطہ مکتوبات سید احمد صفحہ ۲۲۰۔ سوانح صفحہ ۱۷۹-۱۸۰

سید احمدؒ معرکۂ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے اور ان کے چیدہ رفقا بھی۔ مایوسی اور انتشار و پراگندگی کی ایک مختصر مدت کے بعد شیخ محمد ولی پھولتی سردار منتخب ہوئے اور تمام حاضرین سے بیعتیں لیں۔ وہابیوں کا ایک اور گروہ جو جنگ بالاکوٹ کے موقع پر مظفرآباد میں تعینات تھا وہ بھی واپس آگیا اور شیخ محمد پھولتی کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

آئندہ چند برسوں میں وہابی جگہ جگہ مارے پھرے اور اپنے ذرائع کو دوبارہ درست اور منظم کرنے کے لئے مختلف سرداروں سے مدد طلب کی، مگر قبائلی سردار زیادہ تر فاتی اور مقامی مصالح کے تابع تھے۔ وہ تو اپنے اپنے علاقوں اور حدود اثر کی توسیع کے لئے وہابیوں کی خدمات کے خواہاں رہتے تھے، کیونکہ وہ منظم، تربیت یافتہ اور جنگ آزمودہ لوگ تھے۔

وہابیوں کو پائندہ خاں کی پیشکش: بالاکوٹ کے بعد وہابیوں کا پہلا پڑاؤ ایک مقام نندھیار میں تھا جہاں وہ کوئی دس مہینے رہے۔ اس کے سردار کو بددل اور نامددگار پاکر وہ پنج تار منتقل ہو گئے جو سید احمد کی زندگی تک ان کی قومی کارگزاری کا مرکز رہ چکا تھا۔ مگر وہاں بھی وہی دشواریاں پیش آئیں۔ تو امب کے سردار پائندہ خاں کی امداد اور مہمان نوازی کی پیشکش پر وہ امب کو منتقل ہو گئے۔ اس سے پہلے ۱۸۳۰ء میں پائندہ خاں سید احمد سے شکست کھا چکا تھا، لیکن اب اس نے مصالحانہ رویہ ظاہر کیا اور وہابیوں کو اپنی قلمرو میں اقامت کے لئے مدعو کیا اور اگرور کے سردار کے مملوکہ علاقے میں جستی کا قلعہ اور ملحقہ زمینیں دیں۔ بظاہر یہ اعانت کے علامات تھے لیکن درا صل وہ ایک پتھر سے دو چڑیوں کا شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اور اگرور کے سردار میں پرانی عداوت چلی آتی تھی۔ اس کی بہن اگرور کے سردار سے منسوب تھی۔ مگر دونوں کے درمیان کچھ تنازع کے سبب سے شادی ملتوی ہوتی چلی آتی تھی۔ جب وہ سید احمد کے ہاتھوں شکست کھا کر نکل بھاگا تو اس کا خاندان پیچھے رہ گیا اور سید احمد کے قبضے میں آگیا اسے انہوں نے کشادہ

دلی سے اگرور کے سردار کے حوالہ کر دیا کہ اسے پائندہ خاں کے پاس پہنچا دے۔
سردار اگرور نے خاندان کو پائندہ خاں کے پاس بھیج تو دیا مگر اس کی بہن کو جو اس سے منسوب تھی اپنے پاس روک رکھا۔ اس حرکت پر پائندہ خاں نے اسے کبھی معاف نہ کیا اور اس سے اپنی مخفی عداوت برقرار رکھی۔ اب وہابیوں کو اس سردار کی قلمرو سے متصل ایک قطعۂ زمین دیکر اسے توقع تھی کہ ان کے درمیان نزاع پیدا ہو جائیگا۔ اور وہابی اس کی سرکوبی کرینگے اور اس کشمکش میں خود بھی کمزور ہو جائیں گے۔ وہ اپنے اس منصوبے میں قریب قریب کامیاب ہو چکا تھا۔

وہابیوں کا ستھانہ میں قیام: وہابیوں نے اس کے منصوبے کو بھانپ کر اس کی دعوت رد کردی اور اپنے پرانے دوست اور محسن ستھانہ کے سید اکبر شاہ کی طرف چلے گئے۔ (۱۳۱) ہالس لکھتے ہیں انکو اپنے دہشت زدہ اور غیر منظم گروہ کو از سر نو منظم ...... کرنے کے لیے ستانے اور دم لینے کا وقفہ مل گیا۔ شیخ محمد پھولتی نے پورے گروہ کو دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جن کو جدا جدا علیحدہ کام سونپ دیے گئے۔ جب وہابی ستھانہ میں جم گئے تو شیخ پھولتی بنیر میں تخت بند چلے گئے اور سید احمدؒ کے افراد خاندان کو ستھانہ لے آئے۔ یہ افراد ستھانہ میں باقی افراد خاندان سے جو وہاں مقیم تھے جا ملنا چاہتے تھے۔ شیخ محمد کی سازشی کوششیں اس کام کی طرف مرکوز تھیں جو انھوں نے ۱۸۲۴-۲۶ء میں انجام کو پہنچایا۔ اس لئے انھوں نے آئندہ ہونے والی جنگ میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا اور یہ کام دوسری جماعت نے نصیر الدین منگلوری شاہجہاں پوری کے زیر قیادت انجام دیا۔

وہابیوں اور فتح خاں کی لڑائی: وہابیوں کو ستھانہ میں ایک عارضی پناہ گاہ مل جانے کے بعد بھی چین نہ ملا۔ کئی قبائل وہابیوں کی شکست اور تباہی کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ وہ ان کی خفیہ سازشوں اور مخاصمانہ منصوبوں کا شکار رہے۔ مغرب میں فتح خاں کا علاقہ تھا۔ وادیوں کے قبائلی ۱۸۳۰ء میں وہابیوں کے

مگر اس کو شکست ہو گئی۔ وہ اُدھر سے دوسری بار گذرتے ہوئے بقایا خراج کی
ادائی کا سوال اُٹھایا۔ امرا یوں بھی شجاع کے مطالبہ سے جان بچانے کو شکارپور
سکھوں کے حوالہ کر دینے کے امکان پر غور کرنے لگے۔

رنجیت سنگھ کا امرا سے خراج کا مطالبہ: رنجیت سنگھ نے جنوب مشرق میں
۱۸۰۹ء کے انگریز سکھ معاہدے سے مات کھا کر اپنی سیاسی حدود کو جنوب
مغرب (سندھ) کی طرف وسیع کرنا چاہا۔ تالپوروں نے شکارپور کلہوڑوں سے چھینا تھا
اس لئے رنجیت سنگھ نے کلہوڑوں کے ایک نمائندہ عبدالنبی کو آگے چل کر تالپوروں
کے خلاف کھڑا کر دینے کی غرض سے اپنی جنوب مغرب سرحد پر متعین کر دیا۔ کپتان
ویڈ نے اپنی رپورٹ مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۳۱ء میں بڑی سیاسی چابکی سے اپنی
حکومت کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ جنگ بالاکوٹ کے فوراً بعد رنجیت سنگھ
سندھ کے علاقے کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اُس نے لکھا کہ "سید نے رنجیت سنگھ
کے سلطنت کو پانچ سال تک الجھائے رکھا تھا۔ اب سید کی شکست اور فنا کے بعد
سکھ اپنی فوجی کارروائیوں کے لئے آئندہ میدان کی تلاش میں ہیں ...... اور
یہ میدان شکارپور کی طرف ہے۔ ...... سندھیوں سے اس کے حاصل کرنے
کے لئے یا نواب بہاولپور کو (جو ستلج کے مغرب میں واقع ہے) قابو میں لانے
کے لئے رنجیت سنگھ آرزومند رہا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ اُدھر اپنی فوج
روانہ کر دے۔ پانچ برس ہوتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے امرائے سندھ
کے ایلچیوں سے جو دربار میں حاضر تھے اُس خراج کا مطالبہ کیا تھا جو امرا حکومت
افغانستان کو ادا کیا کرتے تھے۔ دلیل یہ تھی کہ حکومت کابل کے زوال کے
بعد سے اس سلطنت کا سب سے بڑا حصہ اُسی کو منتقل ہوا تھا اور وہ اس حصہ
کا وارث ہے۔"

مزاری قبیلہ: امرائے سندھ دل سے سکھوں سے مقابلہ کرنے کے خواہاں تھے۔
کھلم کھلا مقابلہ کے لئے نہ ان کے پاس وسائل تھے نہ طاقت۔ بہرحال ان کو مزاریوں

سب سے بڑا مقصد باہمی مفاہمت قائم کرنا اور کل ہمسایہ طاقتوں کے درمیان امن اور توازن پیدا کرنا ہے۔ اس بیان میں چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت کی مرضی ظاہر کر دی جاتی بجائے اس کے کہ خود غرضانہ طور پر اس بات کا اظہار کیا جاتا جو یقیناً وہاں جہ کے لئے پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی جس کا تعاون حاصل کرنے کی مجھ سے توقع کی جاتی تھی اور جو رضا جوئی کے سوا اور کسی صورت سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ انگریز رنجیت سنگھ کی نیت سے چوکنا ہونے کے ساتھ کھلم کھلا اس سے عداوت مول لینا نا پسند کرتے تھے۔ انگریز وسط ایشیا میں روس کی مفروضہ پیش قدمی کو جو اس زمانے میں حقیقی اور قریب الوقوع معلوم ہوتی تھی مقابلہ کرنے کے لئے رنجیت سنگھ کی امداد اور تعاون کی بڑی قدر و قیمت سمجھتے تھے۔ اسی امکان کے پیش نظر انھوں نے افغانستان کے دو خارج الوطن حاکموں شاہ زماں اور شاہ شجاع کو سیاسی پناہ دے رکھی تھی جن کے ذریعے سے وہ افغانستان میں اپنا اثر وسیع کرنا چاہتے تھے۔ اور وہی انگریزی اور روسی شہنشاہیت کے درمیان استخوان نزاع تھا۔ چنانچہ یہ دونوں عظیم طاقتیں سندھ کو ہڑپ کرنے کی نیت رکھتی اور ایک دوسرے پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ درحقیقت ٹھیک ٹھیک یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ انگریز سکھوں کے پہل کر بیٹھنے کے خوف سے سندھ کے الحاق کے لئے کتنے مستعجل اور بے چین تھے۔

نصیرالدین اور مزاری قبیلہ: یہ تھی سندھ کی سیاسی صورتِ حال جب کہ نصیرالدین وہاں پہنچے۔ انھوں نے مزاریوں کو قیمتی حلیف پایا خصوصاً اس لئے کہ وہ سکھوں سے گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ نہ سکھوں کے زیر اثر تھے نہ انگریزوں کے۔ یہ سید احمدؒ کی شہادت کے بعد بھی ان کے متبعین کے اس عزم کی مزید مثال ہے کہ وہ ایسی ہندوستانی طاقتوں سے اتحاد سے باز رہیں جو انگریزوں کے ماتحت ہوں۔ وہ ایسی طاقتوں سے اتحاد کو ترجیح دیتے تھے جو ذرائع کی قلت کے باوجود انگریزوں کے خلاف ہوں۔

مزاریوں کی سکھوں سے تصادم: چنانچہ نصیرالدین نے مزاریوں کی سرزمین میں سکونت

اختیار کرلی جو خیر پور کی سرحد پر واقع تھی اور موجودہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے جنوب مغرب سے مربوط تھی۔ نومبر ۱۸۳۷ء میں انھوں نے سکھوں سے قلعہ روجھان اور کاہن میں ہونے والی جنگوں میں ان کی سپاہ نے مزاریوں کی غداری سے شکست کھائی۔ ان مزاریوں نے ملتان کے سکھ گورنر دیوان ساون مل کی وساطت سے سکھوں سے صلح کرلی تھی۔

نصیرالدین کی روانگی افغانستان: شمالی مغربی سرحد کی معمولی حرکات پھر ظہور پذیر ہو گئیں۔ وہابیوں سے ان کے متلون مزاج اتحادیوں نے علیحدگی شروع کردی۔ یہ سرحدی قبائل کی طرح غیر تربیت یافتہ لوگ تھے جن کے پاس سکھ دربار سے مقابلہ کرنے کے لئے نہ وسائل تھے نہ تنظیم۔ پہلے ہی دھنسوڑے کی یورش کے بعد اور پھر ساون مل کی ترغیب سے انھوں نے سکھوں سے صلح قبول کرلی۔ ورنہ وہابیوں کو ادھر ہی چھوڑ دیا۔ قدرتاً نصیرالدین سخت دشواری میں پڑ گئے۔ اکثر مقامی سردار جن سے پناہ یا مدد طلب کی جاتی وہ ان کے (وہابیوں کے) وجود ہی کو سیاسی پریشانی سمجھتے۔ اس لئے نصیرالدین افغانستان چلے گئے۔ وہاں کے کچھ سرداروں سے وہ خط وکتابت کر چکے تھے۔

انگریز افغان جنگ میں نصیرالدین کی شرکت: اس اثنا میں انگریزوں اور امیر افغانستان دوست محمد امیر افغانستان بارکزئی کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ جو واقعات پہلی انگریز افغان جنگ کا باعث ہوئے اور انگریزوں کی بے اعتدالی اور بلاسبب خصومت "اینہمہ روز آمدت کہ معلوم عوام است" اس لئے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جنگ کے موقع پر دوست محمد نے تربیت یافتہ وہابیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانا اپنے لئے بہتر سمجھا۔ چنانچہ اس نے نصیرالدین کو دعوت دی اور وہ ایک ہزار سپاہ کا ایک دستہ لیکر کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے خود دادور کے قریب پڑاؤ کیا اور تین سو سپاہیوں کی ایک ٹولی کو غزنین کی مدافعت کے لئے آگے بھیج دیا۔ لیکن جب انگریزوں نے اس کے قلعے پر یورش کی تو وہ لڑتی ہوئی گر گئی۔ نصیرالدین کی کارروائی نے ایک بار پھر یہ حقیقت نمایاں

مقدمات دائر کر دیے۔ ۱۸۴۶ء میں پنج گچھیہ میں ڈنلوپ کے کارخانے پر حملہ کر کے لوٹ لیا گیا۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۸ء تک فریقین کے درمیان مقدمات اور جوابی مقدمات کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ آخر دادو میاں ریاستی قیدی کی حیثیت سے علی پور جیل میں نظر بند کر دیے گئے۔

تیتو میر: بعد کے مرحلوں میں فرائضی تحریک اور میر نثار علی عرف تیتو میر[1] کے زیر قیادت ایک مقامی معاصر تحریک میں ضم ہو گئی۔ نثار علی ضلع بارا سیٹ کے ایک گاؤں چاند پور کے باشندہ تھے۔ وہ ایک اوسط درجہ کے زمیندار خاندان کے فرد تھے اور جوانی میں ان کا کردار متنازع تھا۔ دلی کے شاہی خاندان کے کچھ افراد سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ سفر حج میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں سید احمد سے ملاقات ہو گئی اور ان کے مرید ہو گئے[2]۔ ۱۸۲۷ء میں ہندوستان واپس آ کر وہ اپنے پرانے مسکن سے قریب حیدرپور میں سکونت پذیر ہو گئے اور اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی جن کی امتیازی خصوصیت سید احمد کے نظریوں سے مماثلت تھی۔ انھوں نے کامیابی کے ساتھ کلکتہ کے شمال اور مشرق کے اضلاع کے دورے کیے اور کثیر التعداد پیرو بنا لیے۔ بہت جلد پیروؤں کی ایک کثیر تعداد جمع کر لی اور چوبیس پرگنہ، ندیا اور فرید پور کے تین ضلع ان کے زیر اثر آ گئے۔

تیتو میر کی اصلاحی سرگرمیاں: دادو میاں کی طرح نثار علی نے بھی مظلوم کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھا لیا جس کو منظم   اور متحد کرنے   اور بے حسی سے بیدار

---

[1] اس تحریک کا مفصل بیان ایک دستاویز "ہندوستان کے وہابیوں کی تاریخ" کلکتہ ریویو جلد ۱۰۱ ص ۱۴۷ تا ۹۲ اور ای تھورنٹن E. THORNTON کی تاریخ ہندوستان ۱۸۴۲ء جلد ۵ صفحہ ۱۰۹ تا ۸۲ میں مذکور ہے۔ [illegible] کی سوورڈس ریبیلینس آف انڈیا۔ کلکتہ ۱۸۵۵ء صفحہ ۹۳ میں بھی اس طرح کا بیان ہے۔

[2] اور انڈین مسلمان صفحہ ۴۲، مخزونہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۹، مخطوطہ تاریخ احمدی مملوکہ یونیورسٹی لائبریری مغربی پنجاب میں بھی نثار علی کے خروج کا ذکر موجود ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس مخطوطہ کے شروع کے اجزا مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔

ان کو نرکل بڑیا میں الیگزینڈر کے دستے کی شکست کی خبر بھی ملی۔ اس سے کچھ دیر مفسدوں کے خلاف اقدام کرنے میں متامل رہے مگر آخر کار وہ آگے بڑھے۔ یورپی صاحبان ہاتھیوں پر اور پیچھے پیچھے برق انداز یوں وہ نرکل بڑیا میں وارد ہوئے جہاں ایک ہزار مضبوط فسادی تیتومیر کے ماتحت باقاعدہ صفوں میں تیار نظر آئے۔ سرکاری دستے نے دور اندیشی کو بہادری کا بڑا حصہ سمجھکر مراجعت کا فیصلہ کر لیا۔ مگر پیٹھ پھیرتے ہی ان پر حملہ شروع ہوگیا۔ معمولی جھڑپ کے بعد جس میں چند برق انداز مارے گئے دستہ اپنی کشتیوں کی طرف واپس دوڑا اور اپنی حفاظت میں کچھ بندوقیں چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر کشتیوں تک پہنچ جانے کے بعد بھی ان کا تعاقب کیا گیا۔ یورپی کشتیاں دوسرے کنارے پر چھوڑ کر اپنے ہاتھیوں کی طرف دوڑے جو ایک میل دور کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے مولناتھ کارخانے کی طرف مراجعت کی جو کوئی پچیس میل دور تھا۔ ایک ہاتھی، کشتی کشتیاں اور دوسرے ساز و سامان فسادیوں کے ہاتھ لگے۔ اس کے بعد وہ ہوگلی کارخانہ پر حملہ کرنے چلے۔ اس کے منیجر کو گرفتار کر لیا اور تیتومیر کے سامنے لائے جس نے کامل اور غیر مشروط تسلیم ورضا کا مطالبہ کیا۔ وہ ہوشیاری سے راضی ہوگیا اور آئندہ انھیں کو حاکم ہندوستان مانکر[1] نیل کے بیج لگانے کو تیار ہوگیا۔ اس وقت تک متاثرہ اضلاع میں سبھی حکام کامل طور پر شکست کھا چکے اور مفلوج ہو چکے تھے۔ کچھ دنوں کے لئے متعلقہ اضلاع میں فسادی ہی برسر اقتدار رہے۔

غلام معصوم کی شکست و خاتمہ: اس درمیان میں الیگزینڈر اپنی جان بچا کر کلکتہ آیا۔ اب حکام کی آنکھوں میں حالت کی خطرناکی نظر آئی اور فوری اقدامات کئے۔ ایک فوج جس میں دیسی پیدل فوج کی دس رجمنٹیں شامل تھیں، گھوڑے سوار توپخانہ کچھ توپوں اور کچھ محافظ سپاہ۔ ہدایت کی گئی کہ براسیٹ میں الیگزینڈر سے جا ملیں۔ وہ یہ سب ملکر ۱۶ نومبر ۱۸۳۱ء تک نرکل بڑیا پہنچے۔ فوج بانس کے قلعہ کی طرف بڑھی۔ وہاں ایک

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱، صفحہ ۱۸۳

فرائضی و وہابی تحریک پر اوکینلی کی رائے: اس مسئلہ پر اوکینلی نے اخبار ہندو پیٹریوٹ مورخہ ۲ اگست ۱۸۷۰ء سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے۔ اخبار کا بیان ہے:-

"فرائضی اور وہابی جیسی جماعتیں اگر خود ایسی عظیم تحریک کے چلانے کی طاقت نہ رکھتی ہوں تو اتنا تو کر سکتی ہیں کہ تمام بے چینیوں اور منافرتوں کے عناصر کو جمع کر دیں جن کی تعداد موجودہ کم عقل گو فیاض اور شاندار حکومت میں بہت زیادہ ہو چکی ہے۔۔۔ ۔۔۔فرائضی اگرچہ بنگال کا ایک طبقہ ہے، کہا جاتا ہے کہ باہر کے کسی دیسی ریاست سکے لوگ ہیں .... بنگال میں بیچ سول گاؤں ہیں جہاں حکومت و پبلک ان کے نظام، ان کی سیاست اور مذہب سے بالکل بے خبر ہے۔ یہ بے خبری بڑی غفلت کی نشان دہی کرتی ہے۔"

فرائضی تحریک اور بارہ سینٹ کے خروج کو غلطی سے وہابیوں کی بغاوت سمجھ لیا گیا ہے۔ ان کو عام وہابی تحریک کے زیادہ کشادہ ذہن متفرعین سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ فرائضی جماعت وہابی تحریک سے پہلے وجود میں آئی اور وہابی تحریک کے بہت سے بنیادی اجزا اس میں موجود تھے یہ رفتہ رفتہ وہابی تحریک میں جذب ہو گئی۔ اور اس کی تبلیغ اشاعت کے لئے خصوصاً بنگال میں راستہ بنا دیا۔ یہ واقعہ قابل غور اور معنی خیز ہے کہ بارہ سینٹ کے خروج اور بنگال میں عنایت علی کے تبلیغی دورے کا زمانہ ایک ہی ہے[1]

فرائضی خروج کی اصل وجہ: اس نقطہ پر کہ یہ خروج خالصتہ فرقہ وارانہ یعنی مذہبی تھا کچھ توضیح کی ضرورت ہے۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ اس واقعہ کا صرف ایک ذکر جو ہم تک پہنچا ہے وہ متعصب حکام کے اس وقت کے چند خطوط اور جیمس اوکینلی کے ایک مقالہ پر مبنی ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ ہمیں

---

[1] آگے تفصیل آتی ہے

[2] THE SEPOY MUTINY AND REVOLT OF 1857 S.M.R صفحہ ۲۸[illegible]

دستیاب نہیں۔ بہرحال انھیں ذرائع سے کچھ واقعات فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ اس تحریک
کا اصل اہم پہلو یعنی یورپی مزارعین سے اس کی آویزش مورخوں کی نظر سے اوجھل ہے۔
یا اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ فتنے جتنے رقبوں پر پھیلے ہوئے تھے ان
میں اضلاع ندیا اور بارہ سیٹ کے حصے نیل جیسی کے کارخانوں سے بھرے ہوئے
ہیں اور بانگنڈی کی سلسلت ایجنسی (بنگ کی کوٹھی) سے دور نہیں[1] مقامی کسانوں پر
ان نیل کے زمینداروں کے مظالم سے انیسویں صدی کی اقتصادی تاریخ کے طالبعلم
کم واقف ہوں گے۔ یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ ان باغیوں کے خلاف پہلی کوشش
خود نیل زمینداروں نے انجام دی تھیں۔ انھیں کے مسلسل اصرار سے حکام نے باغیوں
کے خلاف قدم اٹھائے ان کی عرضداشتیں ہی اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ خروج
نیل کے کاشتکاروں کے خلاف تھا۔ اور تیتو کے مخالفین اس کی زد پڑتی تھی جیسا کہ
ان واقعات کے تذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہے نیل کے زمینداروں کی فوج کے ساتھ جو پہلی
جنگ ہوئی تھی اس میں اسے شکست ہوئی تھی اور ان کی ناکامی کے بعد باقاعدہ سرکاری
فوج بھیجی گئی تھی جس نے کام ختم کر دیا۔ کمپنی کے قانون کے التوا کا اعلان ایک
دوسرا اہم معنی واقعہ ہے جو قابل غور ہے۔ یہ واقعات تحریک کے مقاصد سے
میل نہیں کھاتے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ تمام تر صرف ہندوؤں کے خلاف تھے

یہ خروج دراصل ناجائز استحصال کرنے والے ڈھیٹ اور بے رحم نیل
کاروں اور زمینداروں کے ایک نمائندہ طبقے کی لوٹ کھسوٹ کے شکار مظلوم
کاشتکاروں کی جدوجہد تھا۔ ان زمینداروں کو بندوبست دوامی کے بخشے ہوئے
حقوق ملکیت کی وجہ سے یہ عقیدہ راسخ تھا کہ کاشتکاروں کے ساتھ بے دھڑک جو سلوک چاہیں
کریں۔ نوٹ کلکٹر مجسٹریٹ نے ان کے خروج پر اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ
زمینداروں کو جو اختیارات حاصل ہیں ان سے کام لیکر اپنی رعایا میں ایک نمائشی

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱۵ صفحہ ۱۸۰

کچہری کھڑی کر کے جس بہانے سے چاہیں جو فیصلہ نافذ کر دیں۔"

ڈاکٹر چودھری نے ہندوستان میں مختلف تحریکات مخالف برطانیہ کی نوعیت پر اپنے پر از معلومات مقالہ میں فرائضیوں کے متعلق نہایت صحیح تبصرہ کیا ہے کہ "یہ وہابی[۵۵] سماجی و اقتصادی اعتبار سے مجبور کاشتکاروں کے طرفدار تھے جن کو انھوں نے اونچے طبقوں[۵۶] کے مظالم سے بچانے میں مدد دی۔"

اس سلسلے میں ایک اور بات خاص طور پر قابل غور ہے یہ خروش انگریزوں کے ماتحت نوکری اور انگریزی عدالتوں میں جانے سے انکار کر کے عوام میں عدم تعاون کا احساس بیدار کرنے کی کوشش بھی تھی۔ یہ معنی خیز اقدام تھا ایک اصول کی جس کی بنیاد پر ہندوستان کی آئندہ تحریک آزادی کی ایک عالیشان عمارت کھڑی کرنا تھی۔

---

۵۵ گورنمنٹ آف بنگال، جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ [illegible]

۵۶ انھوں نے یہ لفظ وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے جس میں غیر [illegible] بھی داخل ہیں۔

۵۷ ایس۔ بی۔ چودھری، صفحہ [illegible]

باب ۴

ولایت علی و عنایت علی

(ا) ولایت علی اور عنایت علی کے کردار اور جد و جہد

وہابی تحریک کی تاریخ کم سے کم ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۸ء تک بہت زیادہ حد تک خاندان صادقپور پٹنہ سٹی کے ولایت علی و عنایت علی کی جد و جہد کی تاریخ ہے۔ اس مشن کی ترقی و سربلندی کے لئے ان کے بے نفسانہ جوش اور تحریک کی خدمت میں ان کی طرح طرح کی قربانیوں کی سر ولیم ہنٹر نے بھی کھلے دل سے تحسین کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ان تھک مبلغوں کی حیثیت سے اپنی ذات سے بے پروا، بے داغ زندگی، انگریز کفار کے قلع قمع کرنے پر وقف اور رنگروٹ مہیا کرنے کے لئے ایک قاعدہ نظام قائم کرنے میں قابل تعریف ماہر کے لحاظ سے یہ پٹنہ کے خلفا اس جماعت کے مثالی نمونہ نظر آتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا زیادہ تر حصہ بہت پاک تھا، اور اپنے ہزاروں ہموطنوں کو ایک صاف زندگی اور اللہ تعالیٰ کے زیادہ سچے اور پاک تخیل پر ابھار دینا انھیں کا حصہ تھا۔"[1]

ولایت علی کے ابتدائی حالات: یہ دونوں صادقپور پٹنہ سٹی کے فتح علی کے فرزند تھے۔ بڑے بیٹے ولایت علی ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے

---

[1] آور انڈین مسلمانز صفحہ ۲۸

ان کا قد اوسط، رنگ سانولا اور نقش و نگار بھاری تھا۔ داڑھی رکھتے تھے۔ بھنویں جڑی ہوئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر وہ لکھنؤ بھیج دیے گئے جہاں رنگ محل[1] کے عالم اشرف علی سے تعلیم حاصل کی۔ یہیں وہ سید احمدؒ سے ملے اور بیعت کی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے افراد خاندان کو بھی سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آمادہ کیا۔ جب سید احمدؒ پٹنہ سے رخصت ہوئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔

ولایت علی کی بیوہ سے شادی ولایت علی کی پہلی شادی پندرہ سال کی عمر میں بیبی امیرن دختر مقصود علی ساکن قصبہ لبنا پھلواری ضلع آرہ سے ہوئی۔ وہ لاولد وفات پا گئیں۔ ولایت علی نے دوسری شادی اپنے حیدرآباد دکن کے قیام میں ایک مقامی امیر مرزا وحید بیگ کی بیٹی سے کی۔ اس شادی سے ان کے کئی اولاد ہوئی۔ ان میں ایک عبداللہ تھے جو مشہور جنگ امبیلہ میں وہابیوں کے سردار تھے۔ پھر نکاح بیوگان کی سنت کو جاری کرنے کے لئے انھوں نے الٰہی بخش کی بیوہ دختر سے بھی شادی کی۔ یہ مقامی مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں اور اعلیٰ سماجی رتبہ والوں میں نکاح بیوگان کی پہلی مثال تھی۔ اس وقت اس شادی نے بڑی سنسنی پھیلا دی مگر انھوں نے اپنے عقیدے کی پختگی کا جرأت سے مظاہرہ کر دیا۔

عنایت علی کے ابتدائی حالات: چھوٹے بھائی عنایت علی ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کا قد بھی اوسط اور رنگ گورا تھا۔ داڑھی رکھتے تھے۔ وہ مضبوط اعصاب اور خوبصورت ڈیل ڈول اور پرکشش شخصیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ بعد میں وہ شہر پٹنہ کے ایک ممتاز رئیس اور تفسیر کے عظیم استاد سید محمد مسافر کے شاگرد ہوئے۔ ان کی پہلی شادی سید محمد مسافر کی دختر آمنہ سے ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد پندرہ سال تک جب کہ وہ زیادہ تر بہار اور بنگال میں تبلیغی دورے میں مصروف تھے کوئی شادی نہیں کی۔ الٰہی بخش

---

[1] یہ ایک مشہور اسلامی تعلیم گاہ تھی۔

کے فرزند اکبر علی کی وفات کے بعد ولایت علی نے عنایت علی کی شادی اکبر علی کی
بیوہ اور محمد حسین کی دختر بی بی شریفن سے کر دی، جو اپنے شوہر (عنایت علی)
کے ساتھ جسور میں مفیض الدین کے گھر میں رہتیں اور ہمیشہ شوہر کے تبلیغی دوروں
میں ان کے ساتھ رہتیں۔ مفیض الدین نے بھی اپنے خاندان کے اور افراد کے ساتھ
سید احمد سے بیعت کی تھی اور سرحد پر اُن سے جا ملے۔

عنایت علی کی زندگی اور جدوجہد اُس جوش اور جرأت کے لئے نمایاں ہے
جس کا انھوں نے اس تحریک کے مقصد کے لئے ثبوت دیا۔ وہ دو دور افتادہ مقامات
شمالی و مغربی سرحد اور مشرقی بنگال میں بیک وقت کام کرتے تھے۔ ذل الذکر میں
جہاد کرنے اور جنگ کی نگرانی کرنے میں اور آخر الذکر میں تبلیغ کرنے اور نئے
رنگروٹ بھرتی کرنے میں مصروف رہے۔

ولایت علی اور عنایت علی کی مراجعت ہند: سرحد پر کچھ دن قیام کے بعد سید احمدؒ
نے دونوں بھائیوں کو تبلیغ اور انتظامی کام کے لئے ہندوستان میں تعینات کر دیا۔
بدقسمتی سے ہم ان کے ہندوستان کو مراجعت کی صحیح تاریخ سے واقف نہیں۔
سید احمد نے پٹنہ کے قائدین کے نام اپنے ایک مکتوب میں علی برادران کے
ہندوستان میں متعین کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اُس وقت سے لیکر ۱۸۳۹ء میں عنایت علی
کے سرحد جانے تک دونوں بھائی مشرقی اور جنوبی ہند کے اکثر حصوں میں تنظیمی
اور تعمیری کاموں میں مصروف رہے۔

دونوں بھائی اول اول سید احمدؒ کی رفاقت سے جدا ہوئے اور سرحد سے
چلے آنے پر دل سے راضی نہ تھے مگر سید احمدؒ نے یہ کہکر ان کو آمادہ کر لیا کہ وہ ان
کو بیج کی طرح باہر بکھیر رہے ہیں۔ ان کی یہ پیش گوئی لفظ بلفظ صادق آئی۔ ور
بعد کے سالوں میں ان کی مساعی بار آور ہوئیں۔ وہ ہندوستان سے آدمیوں اور
روپے کی ڈاک چوکی کے ایسے نظام کی تکمیل کے لئے معمار ثابت ہوئے جو حیرتناک

مہارت کے ساتھ آنکھوں میں خاک جھونکنے میں عرصہ دراز تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ ان کے کارناموں کے دو اہم ذرائع معلومات سوانح احمدی اور تذکرہ صادقہ ہیں۔ آخر الذکر میں ولایت علی کے جو حالات مذکور ہیں وہ زیادہ تر اول الذکر کے بیانات پر مبنی ہیں جو ایک عام قسم کا مجمل تذکرہ ہے۔ اس میں ترتیب زمانی بہت کم ہے، مثلاً ولایت علی کے اپنے والد کے انتقال کی (۱۸۳۱ء میں) خبر سنتے ہی پٹنہ واپس آتے ہی ان کے مشاغل کے سلسلہ میں صاحب سوانح نے سید عباس اور زین العابدین کی آمد کا ذکر کیا ہے جو مبارز الدولہ کی سازش کے بعد حیدرآباد سے نکل بھاگے حالانکہ یہ واقعہ بہت بعد ۱۸۳۹ء کا ہے مگر ۱۸۳۱ء کے واقعات کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

ہند میں تبلیغی و تنظیمی سرگرمیاں: اس زمانے میں علی برادران کی جدوجہد خالصتہ تبلیغی تھی۔ وہ مقصد کو آگے بڑھانے والے بے غرض اور جوشیلے کارکن تھے۔ اپنی افتاد طبع اور تقاضائے حالات سے یہ دونوں بھائی اپنی کارروائیوں کی کوئی یادداشت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے اس پہلو پر ان کے متعلق وہابیوں کی دستاویزات یا گورنمنٹ کی تحریرات سے ہمیں بہت کم اطلاعات دستیاب ہوئی ہیں۔ سرکاری تحریرات کا ذکر اس وقت کرتے ہیں جب ان کی باغیانہ کارروائیوں کی طرف حکومت کی توجہ منعطف کرانا ہوتی ہے۔ مگر یہ کارروائیاں بعد کی ہیں جو ۱۸۴۰ء سے ظہور میں آئیں اور اسی کے بعد سے ہمیں زیادہ مکمل حالات ملتے ہیں۔

سید احمدؒ نے ولایت علی کو سید کرامت اللہ اور عبدالقادر بہاری کے ساتھ بمبئی اور دکن میں کام کرنے کے لئے متعین کیا۔ بمبئی میں انھوں نے محمد علی رامپوری کو اپنی جگہ دیدی جو مدراس چلے گئے۔ وہ ابھی دکن ہی میں تھے کہ بالاکوٹ کی تباہی کی المناک خبر پہنچی۔ قریب قریب اسی وقت ان کے والد فتح علی بھی پٹنہ میں وفات پا گئے۔ اس لئے وہ مدھیا پردیش (صوبہ متوسط) کے راستے سے پٹنہ چلے گئے۔ عنایت علی باپ کے مرض کی خبر سنکر پہلے ہی پٹنہ آ چکے تھے۔

پٹنہ میں وہابی تحریک کی تنظیم نو: پٹنہ پہنچ کر ولایت علی نے تحریک کی تنظیم نو اپنے ہاتھ میں لی۔ بہت سے لوگوں نے ولایت علی کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ انھوں نے مقامی مسجد تموبیاں کو جو پٹنہ میں وہابیوں کا ایک اہم مرکز تھی محمد حسین کے ذمہ کیا، اور اضلاع میں مظفر پور، دربھنگہ، اور چھپرہ میں بھی تحریک کی ذمہ داری انھیں کو سونپی شہر کی ایک اور مسجد فخر الدولہ[1] میں نماز جمعہ دوبارہ جاری کی۔ ان کے گھر میں بھی مجلسیں ہوتیں جہاں سادہ اور آسان زبان میں قرآن وحدیث کی تعلیم دی جاتی اور دینی وسیاسی مسائل پر وعظ ہوتے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ احکام الٰہی کو آپ سمجھ لیں۔ قرآن مجید کو براہ راست خود سمجھنے اور درمیانی علما سے جن کے پھیلائے ہوئے رسم ورواج کے خلاف یہ تحریک شروع کی گئی تھی، آزاد اور بے نیاز ہو جانے پر زور دیا جاتا تھا۔ ان مجلسوں میں عورتیں بچے اور ان پڑھ بھی شریک ہوتے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ قرآن اور قطب الدین دہلوی کا ترجمہ مشکوٰۃ دہلی سے منگوا کر حاضرین مجلس میں ان کے نسخے کثیر تعداد میں تقسیم کئے جاتے۔

ولایت علی دوروں پر بھی نکلتے۔ اکثر اوقات کسی خاص جگہ پر کئی کئی مہینے اقامت کر لیتے اور کسی ایک آدمی کو منتخب کر کے اس کو ہمخیال بنانے اور تربیت دینے پر تمام تر توجہ صرف کرتے اور مقامی تنظیم اُس کے سپرد کر دیتے۔ ان دوروں میں ان کو ہر شعبۂ زندگی کے آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا، کسانوں سے کھیتوں میں اور جولاہوں سے ان کے کرگھوں پر۔ انھوں نے بہار شریف کا دورہ بھی کیا جو ایک بڑا صوفیانہ مرکز تھا اور وہاں بھی اپنے پیغام کی اشاعت کی کوشش کی۔

عنایت علی کا دورۂ بنگال: عنایت علی نے شمالی مغربی سرحد سے لوٹنے کے بعد بنگال کے مشرقی اضلاع کے بے شمار گاؤں میں بڑے وسیع پیمانے پر تبلیغی دورے کئے۔ اس زمانہ کی پولیس کی رپورٹوں سے بھی ان کے کاموں کی مفصل اور مستند

---

[1] یہ مسجد تھانہ چوک(؟) پٹنہ سٹی سے تھوڑی دور مشرق میں واقع ہے۔

اطلاعات دستیاب ہیں[1]۔ مارچ ۱۸۴۳ء میں ہی زیریں صوبوں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکومت کو مسلمان "ملاؤں" کے ایک جتھے کی موجودگی کی رپورٹ[2] دی تھی جو بارہسیٹ جسور پٹنہ اور راجشاہی وغیرہ اضلاع کے چکر لگاتے پھرتے، سکھوں اور حکومت کے حلیفوں کے خلاف جہاد کا وعظ کرتے' اس غرض سے رنگروٹ اور روپے فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس گروہ کا سردار ایک پٹنہ کا باشندہ عنایت علی نامی ہے۔ رپورٹ میں مزید یہ بھی درج ہے کہ رنگروٹ حاصل کرنے میں ان کو زیادہ کامیابی تو نہ ہوئی مگر روپے کی تحصیل زیادہ کامیابی سے جاری ہے۔"

عنایت علی کے متعلق سپرنٹنڈنٹ پولس کی رپورٹ: اسی افسر نے بعد میں ایک اور رپورٹ ملاؤں کے دوسرے سربراہوں کے متعلق ارسال کی تھی جس میں ان کی تبلیغ کے اغراض و مقاصد اور عوام میں ان کی تبلیغ کو بے اثر کرنے کی مساعی کی اطلاع دی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا[3] کہ عنایت علی کے علاوہ کرامت علی[4] اور زینودین (زین العابدین) حیدر آبادی بھی اضلاع مذکورہ میں کام کر رہے ہیں۔ رنگروٹوں کے لئے ان کی اپیل کا خیر مقدم حوصلہ افزا ہوا۔ انھوں نے جنگی پور کے پاس ضلع مرشد آباد کے ایک گاؤں نارائن پور کو تاکا ہے جہاں یہ لوگ سرحد کی طرف روانہ ہونے سے پہلے جمع ہوتے ہیں۔

---

[1] حکومت بنگال، محکمہ عدلیہ، فائل نمبر ۱۲/ ۲۰۷ مورخہ ۲۹ مئی ۱۸۴۳ء۔ ان دستاویزات پر جو اطلاعات مبنی ہیں وہ پہلی بار شائع کی جا رہی ہیں۔ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء میں اوکینیلی کے مقالات کی بنا پر مبہم طور پر اتنا معلوم تھا کہ عنایت علی اس وقت مشرقی بنگال میں اپنا کام کر رہے تھے۔ مگر اب تک ان ابتدائی ذرائع معلومات سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ خود وہابی ذرائع بھی عنایت علی کی کارروائیوں کے اس پہلو پر زیادہ معلومات بہم نہیں پہنچاتے۔

[2] ڈبلو ڈمپیر سپرنٹنڈنٹ پولیس صوبہ زیریں کا مراسلہ بنام ایف جے ہیلیڈے سکریٹری حکومت بنگال محکمہ عدالت نمبر ۸۱/۵ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۴۳ء، [3] ایضاً مراسلہ ۲۸۰ مورخہ ۵ اپریل ۱۸۴۳ء۔

[4] جونپور کے متوطن تھے ۱۸۰۰-۱۸۷۳ء۔ ابتدائے عمر ۸ سال میں سید احمد کی بیعت کی۔ بنگال میں متعین ہوئے اور بڑے پیمانے پر تبلیغی کام کرتے رہے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ اطلاع بھی دی کہ مشرقی اضلاع کی مسلمان آبادی زیادہ تر "فرائضی یعنی وہابیوں پر مشتمل" ہے۔ یہ لوگ باہم نہایت متحد جوشیلے مذہبی ایک خاص سردار کے ماتحت، ہماری سرکار کے دشمن ہیں اور ان پر نہایت مستعدی سے کڑی نظر رکھنا ہے ان صوبوں میں اگر کسی شورش کا خطرہ ہے تو اسی گروہ کے مذہبی جنون کی برانگیختگی سے ہے[1]

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مزید لکھا کہ متعلقہ اضلاع کے مجسٹریٹ بالخصوص مرشدآباد کے مجسٹریٹ ان لوگوں کے اجتماع اور ان کی ایسی احمقانہ تبلیغات پر کڑی نظر رکھنے کے اقدامات کر رہے ہیں۔ اگر کسی جبر و تشدد کی ضرورت دیکھی گئی تو "ان کو مرعوب کرنے کے لئے فوراً طاقت استعمال کی جائیگی۔"

ایک اور خط میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ رپورٹ بھی کی ہے کہ عنایت علی کچھ عرصہ سے بنگال کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اپنے متبعین سے روپیہ جمع کر رہے ہیں اور نیز علم جہاد اور سید احمدؒ کے ظہور ثانی کے عقیدوں کو امداد کے حصول کے لئے استعمال کر رہے ہیں .... بہرکیف وہ اس حصہ ملک کو چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے ہیں۔"

ایک اور مراسلہ میں حکومت کو رپورٹ دی کہ میں نے مجسٹریٹ بھاگلپور کو لکھکر یہ دریافت کیا ہے کہ پتہ لگائیں کہ کوئی گروہ ان کے ضلع سے گذر کر شمال مغربی سرحد کی طرف جا رہا ہے۔ مجسٹریٹ کے جواب سے معلوم ہوا کہ ضلع باراسیٹ، جسور، میمن سنگھ اور راجشاہی سے کوئی ایک ہزار آدمی مختلف گروہوں میں مکہ کی طرف جا رہے ہیں۔

انگریزی حکومت کی پولس کو ہدایات: حکومت نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی ان تمام رپورٹوں

---

[1] سپرنٹنڈنٹ پولیس نے وہابی اور فرائضی تحریکوں کے نمایاں پیرووں، اور نظریوں میں تشابہ دیکھ کر یہ گہری نظر کا ثبوت دیا ہے۔ یہ فرائضیوں کی ڈالی ہوئی داغ بیل تھی جس نے بعد میں بنگال میں وہابیوں کا تحریکی کام آسان کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بعد کے ایک مراسلہ مورخہ اپریل ۱۸۶۳ء میں کرامت علی اور عنایت علی کے درمیان احکام عبادات کے فرق سے دونوں کے متبعین کے فرق کی نشاندہی بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ کرامت علی کے متبعین عنایت علی کے متبعین سے جن کی تعداد زیر بحث حصہ مذکورہ اضلاع میں زیادہ ہے۔"

کے جامع جواب میں وعظ و تبلیغ کو زیادہ اہمیت نہ دینے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ مریدوں کو بالخصوص اور عوام کو بالعموم ترغیب و ترہیب پر مشتمل ایک تحریری ہدایت نامہ جاری کرے کہ اگر کوئی ایسا بیہودہ فعل یا نقض امن کی حرکت عمل میں آئے جس میں وہ یا ان کے متبعین آلودہ ہوں تو وہ ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔ مختلف اضلاع کے مجسٹریٹ اپنے اپنے ضلعوں میں ایسی ہی کارروائی کریں اور مناسب مواقع پر بلوؤں اور شورشوں کے نتیجے سے صحیح وقت پر متنبہ کردیں۔ ان کو یہ فہمائش بھی کی گئی کہ وہ اپنے اضلاع میں ایسی کارروائیوں کی ہفتہ وار رپورٹیں بھیجتے رہیں اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایسے مقامات کا ملاحظہ کرتا رہے جن پر شک و شبہہ ہو۔ ضلع کے عوام الناس کو بھی کسی غیر معمولی اجتماع سے متنبہ کردیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ ہدایت بھی کردی گئی کہ اس معاملہ کی تحقیقات کے نتیجوں سے وقتاً فوقتاً حکومت کو مطلع کرتا رہے[1]۔

بنگال میں عنایت علی کی حکمت عملی: اس زمانے میں بنگال میں عنایت علی کا سب سے بڑا کام دیہاتیوں میں بلدیاتی اور اجتماعی روح کا نشو و ارتقا، حکومت کی مسلسل نافرمانی اور حکومت کے بعض انتظامی نظاموں بالخصوص عدالتوں کے خلاف ہڑتال کی پالیسی تھی۔

عنایت علی بنگال میں جو وہابی مشنری بھیجتے تھے کنیلی ان کی تعلیم کے ایک بہت اہم پہلو پر زور دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "جو لوگ اس ملک سے ہجرت کرکے جہاد میں شریک ہونے سے مجبور ہوتے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ مجہول منادمت کریں، اور اپنے کافر حاکموں سے تمام تعلقات منقطع کرلیں تاکہ حکومت کے اندر حکومت کے بالکل خلاف ایک طاقت قائم کرلیں۔ کافروں اور ان کی عدالتوں سے جو سود کی ڈگری دیتی ہیں اجتناب کرنا چاہئے۔ اور بھائی بھائی کے درمیان شکایات کا فیصلہ منفی مدرسہ

---

[1] یہ طرز فکر اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی جیسے حیدرآباد سازش کے موقع پر حکومت کے طرز عمل کے مطابق ہے مگر یہ ان کا طرز عمل بہت سے متضاد ہے جو حکومت نے اس خطرے کے خلاف انتقامی قدامات کے متعلق اختیار کئے شاید یہ بحث حاکم کے سامنے ایک جرأتمندانہ عزم کی نمائش ہے۔

اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ پٹنہ واپس آگئے۔ اس طرح ان کے کارناموں کا ایک حصہ تمام ہوا جو زیادہ تر ایک مستقل اور مضبوط اندرونی تنظیم پر مشتمل تھا۔

سکھوں کے مقبوضات کی انگریزوں کو منتقلی: ان دونوں کے کارناموں کا دوسرا اور زیادہ عملی حصہ رنجیت سنگھ کی موت کے فوراً بعد سرحد پر شروع ہونے والا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت اور اس کے بعد پنجاب میں عام خانہ جنگیاں جو پہلی انگریز سکھ جنگ کا باعث بنیں سرحد پر علی برادران کی کارروائیوں کا پس منظر تھیں۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کے معاہدے کی رو سے سکھوں نے جالندھر دوآب انگریزوں کے حوالہ کیا اور ۱۵۰۰ ملین (ڈیڑھ کروڑ روپے) کا تاوان نقد دینے پر راضی ہوگئے۔ خزانے میں اتنی رقم موجود نہ تھی اس لئے دریائے سندھ اور بیاس کے درمیان پورا کوہستانی علاقہ مع کشمیر اور بالائی ہزارہ ۱۰ ملین (ایک کروڑ روپے) رقم تاوان کے عوض انگریزوں کی نذر کرنا پڑا۔ باقی رقم معاہدہ کی توثیق کے وقت ادا کرنا تھی۔ واگذاشتہ رقبے میں سے دریائے راوی کے مغرب اور دریائے سندھ کے مشرق کا علاقہ ہزارہ اور کشمیر سمیت گلاب سنگھ کے ہاتھ ساڑھے سات ملین (پچھتر لاکھ) نانک شاہی روپے پر فروخت کرنا پڑا۔ اس رقبے میں بالائی ہزارہ بھی شامل تھا۔ دوسری طرف زیریں ہزارہ کے کئی مقامی پٹھان قبائلی سکھ حکومت کے کامل انہدام اور خاتمہ کا یقین کرکے نیم آزاد سے ہوگئے اور سکھوں کی سرپرستی اور بالادستی سے کامل طور پر آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے لگے۔ بالائی ہزارہ میں بھی گلاب سنگھ سے حاصل کئے ہوئے علاقے پر کوئی دسترس نہ رکھتا تھا۔ وہ وہاں تک کشمیر پر مکمل قبضہ کئے بغیر پہنچ بھی نہ سکتا تھا۔ مگر امام الدین گورنر کشمیر نے لاہور سے ایک خفیہ ہدایت پر کشمیر گلاب سنگھ کو قبضہ دینے سے انکار کردیا۔[1] چنانچہ عملی طور پر کشمیر اور بالائی ہزارہ دونوں

---

[1] جے ڈی کننگھم، تاریخ سکھ، کلکتہ ۱۹۰۲ء، تتمہ صفحہ ۲۷۱

قبضے سے باہر تھے اور بے چینی اور بغاوت سے بھرے ہوئے تھے۔ دونوں جنگوں
میں سکھوں کی مخالفت کے مرکز بن گئے۔ ان مرکزوں کی قیادت بالائی ہزارہ میں
عنایت علی کے اور زیریں ہزارہ میں کبیر شاہ کے ہاتھوں میں تھی۔

نئے حاصل کردہ علاقوں میں اقتصادی اور انتظامی معاملات میں برائے نام
امن قائم کرنے کے لئے ایبٹ کو ہزارہ میں متعین کیا گیا۔ ساتھ ہی دربار لاہور کا
ریزیڈنٹ ہنری لارنس ایک چھوٹا سا دستہ لیکر جموں کی طرف بڑھا۔ وہاں سے
اس نے ہربرٹ ایڈورڈز کو امام الدین کے پاس بھیج دیا اور امام الدین کو ہموار
کر کے آمادہ کر لیا گیا کہ کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دے۔

ولایت علی کی روانگی سرحد: اسی نزاع اور بے امنی کے زمانے میں سید زمن
شاہ[1] نے ولایت علی کو لکھ کر دعوت دی کہ آئیں اور سید احمد کے کام کا ٹوٹا ہوا
رشتہ پھر ہاتھ میں لیں کیونکہ حالات سازگار ہیں۔ چنانچہ ولایت علی نے
اپنے چھوٹے بھائی کو بنگال سے بلا لیا جہاں وہ اس وقت مصروف تبلیغ تھے۔
عنایت علی کوئی دو ہزار متبعین کی جمعیت کے ساتھ پٹنہ آ گئے۔ حکومت کے شبہ
سے بچنے کے لئے پوری جمعیت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ دی گئی۔ ہر ایک
ٹولی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پٹنہ سے کوچ کرتی رہی اور تقریباً پانچ
مہینوں میں روانہ ہو گئی۔ روانگی کا یہ سلسلہ جولائی ۱۸۴۶ء میں شروع ہوا مگر
خود ولایت علی کچھ بعد نومبر میں روانہ ہوئے اور ۱۸۴۷ء کے اوائل میں سرحد
پہنچے۔ جو لوگ ان کے ہمراہ تھے ان میں سے جگدیش پور کے ولی داد علی ایک نمایاں شخصیت
تھے۔ یہ سید احمد کی شہادت کے وقت اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک سرحد میں تھے

---

[1] زمن شاہ پسر حسن علی شاہ جو وادی کاغان کے سردار وہابیوں کے مستقل حامی اور
بالاکوٹ اور بالائی ہزارہ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں ان کے مددگار تھے۔ ۱۸۵۸ء میں وفات
پائی۔ ان کے بھائی زبردست شاہ بھی وہابیوں کے زبردست حامی تھے۔

مگر کمک کے انتظام کے لئے وہ لوٹ آئے تھے۔

فتح خاں کی شرانگیزی: سید احمد کی شہادت (۱۸۳۱ء) اور عنایت علی کی روانگی (۱۸۴۴ء) کے درمیانی وقفے کے واقعات کو انگریزی مصنفوں نے اختصار سے بیان کیا ہے۔ بیلو کے بیان کے مطابق فتح خاں پنجتاری جو اُس وقت تک تحریک کا مددگار تھا اب مخالف ہو گیا تھا اور ستھانہ میں وہابیوں کی مختصر ٹولیوں کو ستا رہا تھا۔ چنانچہ عنایت علی اور مقصود علی آدمیوں اور روپے کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ پٹنہ سے روانہ ہوئے پکھلی میں اولاد علی مل گئے انھوں نے اُس علاقہ پر قبضہ کر لیا اور خراج لگا دیا۔

بالاکوٹ سے سکھوں کا اخراج: اوکنیلی کے بیان کے مطابق مولوی قاسم پانی پتی جو نصیر الدین کی سندھ فوج میں تھے کاغان چلے گئے۔ وادی کاغان کے دونوں سردار ضامن شاہ اور اس کے بھائی نوبت شاہ ان کے مرید ہو گئے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف خلفا کے نام خط لکھ کر ان کو سید احمد کے قریب الوقوع ظہور ثانی کی یاد دلائی اور آنے کی درخواست کی۔ عنایت علی پٹنہ سے آئے اور سکھوں کو بالاکوٹ سے مار بھگایا۔ عنایت علی کے ہمراہ زین العابدین بھی گئے۔ اور نجف خاں کاغانی کی امداد میں جو اپنی مملکت سے محروم کر دیا گیا تھا سکھوں سے ایک جھڑپ میں حصہ بھی لیا۔ اس کے فوراً بعد نجف خاں اور زین العابدین میں سید احمد کے ظہور ثانی کے دقیق مسئلہ پر غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ زین العابدین کلکتہ واپس چلے گئے۔ تحریک کے ایسے معتمد متبع کا انحراف اس کے مستقبل پر ایک مہلک ضرب تھی لیکن بیلو اور اوکنیلی کا متفقہ بیان ہے کہ تمام مشکلات پر غالب آ گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں تحریک سید احمد کے زمانے سے زیادہ بہتر تنظیم یافتہ ہو گئی۔

[illegible] کے مطابق وہابیوں نے سکھوں کی فوج سے [illegible] چھین لیں اور [illegible] کے قلعوں میں [illegible] دیں اور ان پر قبضہ کر لیا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بعض خفیف فرقوں کے سوا یہ سارے متفرق بیانات ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

رضاکاروں کو تحریک میں شرکت کی دعوت: اس موضوع پر زیادہ معتبر اور اہم تر اطلاع ایک مشترکہ مکتوب[۱۵] مورخہ ۹ ذیقعد ۱۲۶۲ھ (۲۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء) سے ملتی ہے جو پٹنہ، جیسور، فرید پور، باراسیت، ڈھاکہ، کلکتہ، رامپور وغیرہ ہم کے معتبر اشخاص نے مل کر لکھا تھا۔ غالباً یہ ایک قسم کی عام روداد تھی جو برطانوی ہند میں اس تحریک کے پیروؤں کے نام سرحد سے بھیجی گئی تھی، اس میں وہاں کے تمام وقائع بیان کیے گئے اور اندرون ملک سے رضاکاروں کو دعوت دی گئی تھی کہ آئیں، تحریک میں شریک ہوں اور فتح و نصرت میں جس کا وقت قریب ہے حصہ لیں۔ اسی مضمون کے خط اور مقامات پر اور اشخاص کے نام لکھے گئے ہونگے۔ افسوس ہے کہ ہمیں اب یہی ایک خط اس موضوع پر دستیاب ہے۔ یہ دسمبر ۱۸۴۵ء سے اکتوبر ۱۸۴۶ء کے مفصل واقعات بتاتا ہے۔

امارت عنایت علی: یہ حالات اس بیان سے شروع ہوتے ہیں کہ عنایت علی نومبر ۱۸۴۵ء میں (ذیحجہ ۱۲۶۱ھ) کو مجاہدوں، سرداروں اور علما کی طرف سے جو بابی ریاست میں دفر تھے امیر منتخب ہوئے۔ ضامن شاہ کاغانی نے بھی اپنی اطاعت پیش کی۔ امارت ہاتھ میں لیکر عنایت علی نے سپاہ کی تعیناتی اور اپنے ساز و سامان کی دوبارہ تنظیم شروع کی۔ اس کے کچھ ہی قبل بالاکوٹ پر سکھوں سے لیکر

---

۱۵ یہ مکتوب پٹنہ یونیورسٹی لیبریری کے مخطوطہ مکتوبات سید احمد کا آخری حصہ ہے اور صفحات ۲۲۰-۱۹ پر پھیلا ہے، غلام رسول مہر نے بھی اس کا حوالہ دیا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ ان کو اس کا ایک نسخہ مسعود عالم ندوی مرحوم سے دستیاب ہوا اور انھوں نے اسے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد سے حاصل کیا تھا۔ حیرت تو یہ ہے کہ ندوی مرحوم نے اسے خود اس تحریک پر اپنی مختصر تصنیف میں پورا استعمال نہیں کیا۔ مہر کی کتاب جلد ۲ جزو ثالث کے ابواب ۳-۵ اسی دستاویز پر مبنی ہیں۔

قبضہ کیا جا چکا تھا۔ محرم ۱۲۴۲ھ (دسمبر ۱۸۲۵ء) میں گڑھی حبیب اللہ پر اچانک حملہ کیا
گیا، فتح گڑھ کا محاصرہ کیا گیا اور ایک مہینے میں اسے فتح کر لیا گیا۔ لاہور میں مرکزی
حکومت کی کمزوری اور بدنظمی سے ان مضافاتی علاقوں کے قلعوں میں متعین فوج
غیر یقینی نازک صورت حال سے دوچار تھیں اور ان میں سے اکثر قلعے چھوڑ کر نکل
رہی تھی۔ عنایت علی نے کئی سکھ کمانداروں کو پیغام بھیجے کہ اطاعت قبول کریں۔ ان
میں سے کچھ نے مصالحتی عبارت میں جواب دیا اور بعض نے مخاصمانہ الفاظ میں۔ مگر
تھوڑے عرصے میں پکھلی، دھمتاور[1]، اگرور[2]، تناول اور ہزارہ کے کوئی بائیس قلعے
فتح ہو گئے اور اسلحہ اور دوسرے سامانوں کی کثیر مقدار پر قبضہ ہو گیا۔ بہت سے
دولتمند ساہوکار گرفتار کر لئے گئے۔

معرکۂ نوشہرہ: اسی درمیان میں ایک سکھ قلعے کی فوج پکھلی پہنچ گئی۔ اس کی
آمد نے مقامی قبائل میں کچھ ہلچل مچادی اور وہ وہابیوں کو چھوڑ کر سکھوں سے
جا ملے۔ انھوں نے وہابیوں سے جو عشر کی تحصیل کے لئے وہاں گئے تھے طنزاً کہا کہ پہلے
سکھ فوج کو شکست دو تو عنایت علی نے بے خوف وخطر ایک فوج نوشہرہ بھیج دی
جس میں کچھ تنخواہدار سپاہی تھے اور منشی شجاع الدین کے زیر کمان [illegible]
اور مولوی مقصود علی دو سو آدمیوں کے ساتھ سلطان حسین کی مدد کے لئے مظفرآباد
بھیج دئے گئے۔

سکھ فوج کے ساتھ آویزش اس طرح بیان کی گئی ہے: نو سو سکھ سوار اور
پانچ ہزار پیادے پہاڑ کی دونوں طرف ڈھال پر جمع تھے۔ پیچھے بارہ ہزار
مقامی قبائل تھے جو اپنی معمولی روش کے مطابق بظاہر وہابیوں کے ساتھ مگر واقعی باطن
میں سکھوں سے سمجھوتہ کئے ہوئے تھے اور منتظر تھے کہ جیسے ہی ان کی امید کے مطابق وہابیوں کو شکست ہو

---

[1] دھمتور یا دھمتاور ایبٹ آباد سے دو میل مشرق دوند ندی کے داہنے کنارے پر ایک بڑا اور
زرخیز گاؤں ہے۔ پہلے اس پورے علاقے کا یہی نام تھا [illegible]
[2] [illegible] علاقے کے جنوب میں ایبٹ آباد [illegible] کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔

عرصہ تک سکھوں کو جادون کے علاقے کی طرف چڑھائی کی ہمت نہ پڑی۔

امارت ولایت علی: ولایت علی ستمبر ۱۸۴۲ء میں پٹنہ سے سرحد آئے۔ ان کے ساتھ احمد اللہ کے تین چھوٹے بھائی یحیٰی علی فیاض علی اور اکبر علی بھی تھے۔ ان کے ساتھ رضاکاروں کی ایک بھاری تعداد تھی اور اسلحہ اور ذخائر کی معتد بہ مقدار اپنے ساتھ لے گئے۔ عنایت علی نے وہابی ریاست کی سرحدی چوکی منی کلی پر یک دستہ ان کی پیشوائی کے لئے بھیجا۔ ولایت علی کے اعزاز میں نئی ریاست کے اندر متعدد بڑا در پر خیر مقدم کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ ان کے نوشہرہ پہنچنے پر مقامی ک ندار دار وغہ ریاست تک نکلے اور ایک توپ کی سلامی دی۔ مقصود علی کو عنایت علی نے ایک رسالہ اور پیادہ دستے کے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ بھی نوشہرہ پہنچے اور خیر مقدم میں شریک ہو گئے۔ دوسرا بڑا ادلیبر کوٹ تھا جہاں ضامن شاہ اور امین خاں محترم مہمان کے استقبال کے لئے بھیجے گئے تھے۔

وہابی ریاست کا دارالخلافہ اسلام گڑھ تھا۔ خود عنایت علی نے اپنے ذاتی محافظ اور روہیلہ فوج کے ایک دستے کے ساتھ ایک منزل آگے بڑھکر بھائی کا استقبال کیا۔ اترسیہ کے میدان میں جلسہ ہوا۔ یہ ایک عظیم الشان اور مبارک تقریب تھی۔ سب لوگوں نے اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ منائی۔ اترسیہ میں دن کا کھانا کھا کر وہ فتح گڑھ کی طرف روانہ ہوئے جس کا نام اسلام گڑھ رکھ دیا گیا تھا اور وہابی ریاست کا دارالخلافہ تھا جہاں مقامی سردار اظہار اطاعت اور ادائے خراج کے لئے جمع ہوتے تھے۔ فوراً ہی عنایت علی نے بلا تامل و توقف ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انھوں نے ریاست اور جماعت کی امارت سنبھال لی۔

---

۱ یہ عنایت علی کا وہ شریف رویہ تھا جو یک بے غرضی و بے نفسی کا جوش تھا جس میں کسی ذاتی حوصلہ یا جاہ و ہوس کا دخل نہ تھا۔

ولایت علی نے اس سلوک کے جواب میں تمام حاضرین کو ہدایت کی کہ عنایت علی کے ساتھ حسب سابق اپنے سرداروں کا سا برتاؤ رکھیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو سرحد آنے کی دعوت: اس مکتوب کے کاتبوں نے آخر میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کو بھی دعوت دی کہ "اگرچہ ان لوگوں کی تعداد بھی جو سرحد پر موجود ہیں کافی ہے مگر ان کا دل بھائیوں سے ملنے کو بیقرار ہے۔" ان کو اپنے پرجوش خیر مقدم اور مہمان نوازی کا یقین دلایا گیا۔ ان کو ملازمتوں کا بھی اطمینان دلایا گیا جو بے شک و شبہہ کفار کی نوکریوں سے زیادہ بابرکت ہے۔ ساتھ ہی اہل استطاعت سے درخواست کی گئی کہ جماعت کو مالی امداد بھیجیں۔ رہا امام (سید احمد) کے ظہور ثانی کا مسئلہ تو کچھ لوگ اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں اور کچھ نہیں رکھتے۔ اعتقاد رکھنے کے لئے کسی پر کوئی زور نہیں۔ بہرحال امام کا ظہور ثانی جلد ہو خواہ دیر سے یا نہ آئے عنایت علی اور ولایت علی کی امامت (سرداری) تو قائم ہو چکی ہے۔"

مذکورہ بالا مشترک مکتوب میں واقعات کا خلاصہ جو مذکورہ ہے وہ اسی مقام پر تمام ہو جاتا ہے۔ اور مقام جس میں وہابی ریاست کے رقبے اور نظام کا ذکر ہے اس کا خلاصہ آگے بیان ہوگا۔

معرکہ رہ ڈوب: وہابیوں کی انگریزوں سے کھلم کھلا جھڑپ رہ ڈوب[1] پر ہوئی جو ولایت علی کی آمد کے فوراً بعد واقع ہوئی۔ سرحد کے فساد زدہ علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے انگریز سرگرمی سے سکھ حکام اور گلاب سنگھ کی مدد کر رہے تھے۔ دربار لاہور کا انگریز ریزیڈنٹ ہنری لارنس اور اس کی ماتحتی میں ایبٹ، ایڈورڈز، ٹیلر وغیرہ جوشیلے جوان افسر درحقیقت ان علاقوں میں انگریزی حکومت کی بنیاد ڈال رہے تھے۔

انگریزوں نے گلاب سنگھ کی مدد کر کے کشمیر پر قابض ہونے کے لئے مناسب سمجھا کہ سکھ فوج کے ساتھ ساتھ دیوان کرم چند کی کمان میں انگریزی فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دیا جائے جو کشمیر سے لاہور تک راستے میں امن و اطمینان

[1] رہ ڈوب کردھی حبیب اللہ اور مظفرآباد کے درمیان پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مشہور درہ ہے۔

قائم کرتا ہوا کوچ کرے۔ دو انگریز افسر منسٹرین اور وانس ایگینو اس دستے کے ساتھ تعینات کئے گئے۔ طاقت کی اس نمائش کے ساتھ انگریزوں کی عام سیاسی چال بھی حرکت میں آگئی اور بہت سے مقامی قبائلی سردار مع عباس شاہ جھوٹے وعدوں سے رام کر لئے گئے۔

ابھی وہابی مظفر آباد کی طرف سے آنے والی اس فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ مقامی سردار کے میل سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ دوسری طرف پکھلی سے بھی ایک سکھ لشکر آ رہا ہے۔ دوطرفہ حملہ کے اس خطرے نے وہابیوں کے بہت سے مقامی پیروؤں کو مرعوب کر دیا اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بے یار و مددگار، دس رجمنٹوں کی طاقت کے مقابلے میں وہابیوں نے مع برادران علی ایک مختصر محاربہ کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔

اس شکست کے بعد کے واقعات کے بارے میں حکام کے درمیان بہت کچھ اختلاف رائے ہے۔ بیلیو کہتا ہے کہ سکھ فوج نے لفٹننٹ ایگینو کے زیر کمان مجاہدوں کو شکست دیکر منتشر کر دیا۔ مقصود علی گرفتار کر لئے گئے اور پٹنہ بھیج دئے گئے۔ عنایت علی پٹنہ بھاگ گئے۔ اولاد علی چند آدمیوں کے ساتھ سمتھانہ جا رہے۔

اوکنیلی کا بھی بیش و کم یہی بیان ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ برادران علی ضمانت مچلکے کے ماتحت پٹنہ بھیج دئے گئے۔ پٹنہ پہنچ کر انھوں نے دس ہزار کے مچلکے لکھکر چار سال تک پٹنہ نہ چھوڑنے کی ضمانت دی۔

سوانح احمدی اور تذکرہ صادقہ کے مؤلفین ان واقعات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

سکھوں کی انگریزوں سے امداد طلبی: علی برادران گلاب سنگھ کے مقابلے
میں کامیابی سے لڑتے رہے تھے اور بہت کچھ کامیاب ہو رہے تھے۔ گلاب سنگھ نے خود
میں وہابیوں کے مقابلے کی طاقت نہ پاکر انگریزوں سے مدد طلب کی۔ انگریزوں نے
برادرانِ علی کو لکھا کہ متنازع علاقہ ہمارے قبضے میں ہے اس لئے تمھیں جنگ بند کرنا
چاہیے۔ اس کے فوراً بعد لمسڈین، ہڈ ونیس اگنیو گلاب سنگھ کی مدد کو بھیجے گئے۔ انھوں
نے وہابیوں کے کچھ مقامی ساتھیوں کو جن میں ضامن شاہ بھی تھا مالی ترغیبوں سے
ملا لیا۔ اس لئے وہابی کسی ایسی مفاہمت پر مجبور ہو گئے جس کی رو سے وہ ستھانہ
اکبر شاہ کے پاس جا سکیں۔ سوات جانے کے لئے ان کو ایسے علاقوں سے گذرنا
تھا جو انگریزوں کے قبضہ میں تھے اور جس کے لئے ان کو بحفاظت گذرنے کی
ضمانت درکار تھی جو لمسڈین اور اگنیو نے لکھکر دے دی۔ چنانچہ وہابی چل
پڑے مگر انگریزی علاقے میں پہنچنے پر ان کو گھیر کر گرفتار کر لیا گیا۔ بحفاظت
گذرنے دینے کی تحریری ضمانت اس بہانے سے منسوخ کر دی گئی کہ یہ اعلیٰ
حکام کی اجازت کے بغیر مقامی ماتحت افسروں کی دی ہوئی ہے۔ روہیلہ
اس بد عہدی پر بہت برافروختہ ہو گئے اور لڑنے کو تیار ہو گئے مگر ولایت علی
نے تحمل سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ وہابیوں نے مع برادرانِ علی اپنے ہتھیار
اور سامانِ جنگ حوالہ کر کے جنگ سے دستبرداری قبول کر لی، اور لاہور بھیج
دیئے گئے جہاں کمشنر[1] جان لارنس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی بہادری
کی تعریف کی۔ ان کو آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنے ہتھیار اور سامان جنگ فروخت
کر دیں : روہیلہ فوج کو علیحدہ کر دیں۔ ہتھیار کی فروخت سے جو رقم
وصول ہوئی اسی سے ان کی تنخواہیں ادا کر دی گئیں۔ اس کے بعد وہ پٹنہ واپس
بھیج دیئے گئے۔ لارنس نے ان کو ایک ضیافت میں مدعو کیا۔ وہ ان کی واپسی کے

---

[1] اس زمانے میں لاہور دربار میں کمشنر نہیں ریذیڈنٹ ہنری لارنس تھا جان لارنس نہیں، دونوں کے ناموں
کے پچھلے ٹکڑے کے اشتراک کے سبب سے یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے

اخراجات کے لئے کچھ روپے دیئے۔ پٹنہ پہنچنے پر لوگوں کی ایک کثیر جماعت نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ وہ "مجاہدین سرحد" کی زیارت کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔ کمشنر پٹنہ ان کے گھر آیا اور دو دو سو روپے کے ضامنی مچلکے دو سال تک اچھے چال چلن رکھنے کے لئے تعمیل کرنے کو کہا۔

عبدالرحیم کے بیان پر تنقید: غلام رسول مہر بیان متذکرہ بالا کو کچھ وجوہات کی بنا پر رد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں نہ تو انگریزوں نے پنجاب کا پورا الحاق کیا تھا، نہ لارنس اس کا چیف کمشنر تھا، نہ سید اکبر کی سوات کے حکمران کی حیثیت سے تاجپوشی ہوئی تھی اور نہ ہزارہ کا علاقہ انگریزوں کے زیر حکومت تھا۔ مہر ان بے جوڑ باتوں کی تردید میں بالکل حق بجانب ہیں۔ پھر بھی کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہمیں یہ حقیقت اپنے ذہن میں رکھنا ہے کہ سوانح اور تذکرہ صادقہ دونوں کے مخالفوں کی اصل دلچسپی سید احمد اور ان کے بعض اہم رفقا کے کارناموں کے عام ذکر سے تھی۔ اس موضوع پر ان کی تحریر نہ ہمہ گیر ہے نہ مفصل۔ اس زمانے کی عام تاریخ سے ان کی واقفیت محدود تھی۔ کرتے کم عبدالرحیم انگریزی زبان سے ناآشنا تھے۔ جس زمانے میں یہ دونوں قرن تصنیف کئے گئے تھے۔ کمشنر کے عہدے کا وجود تو تھا مگر انھوں نے ریزیڈنٹ اور چیف کمشنر کے عہدوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک دفتری وقانونی فرق[1] کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ علاقہ زیر بحث کے انگریزوں کے قبضے میں نہ ہونے کے متعلق یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۸۴۵ء سے انگریز اس علاقے کے عملاً حاکم تھے۔ اور اس خاص دفعہ میں ساری گفت وشنید انگریز کمانداروں کی وساطت سے ہوتی تھی اس لئے وہابیوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ انگریزوں کا علاقہ ہے۔

---

[1] ۱۸۴۶ء کے معاہدے کی شرائط کے مطابق ایچ ایم لارنس لاہور دربار کا ایجنٹ مقرر کیا گیا تھا؛ دسمبر ۱۸۴۶ء میں اس عہدے کا نام بدل کر ریزیڈنٹ اور ایجنٹ گورنر جنرل رکھ دیا گیا۔ یہ نام ۲ مارچ ۱۸۴۹ء تک برقرار رہا۔ جب کہ یہ نام پھر بدل کر ریزیڈنٹ اور چیف کمشنر رکھ دیا گیا (ہور پولیٹیکل ڈائری جلد ۲ تمہید)،

ایک حالیہ مؤلف[1] نے کشمیر کی آتش بغاوت کو ٹھنڈا کرنے اور براہ راست فوجی مدد دیکر نام نہاد سکھ دربار اور گلاب سنگھ کا اپنے اپنے علاقوں میں کھویا ہوا اقتدار بحال کرنے میں انگریزوں نے جو زبردست حصہ لیا اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے امام الدین سے سکھ علاقہ چھین لینے کے لئے انگریز ایجنٹ کے سکھ فوج کے آگے آگے مارچ کرنے کے عجیب منظر پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

عبداللہ کا چشم دید بیان: عبداللہ کا مندرجہ ذیل بیان بھی بتاتا ہے کہ خود لاٹ صاحب (ہنری لارنس) نے ولایت علی سے کہا تھا کہ ملک پنجاب اب حقیقتاً انگریزوں کی ملک ہے۔

اس کے علاوہ ایگینو کے قول و قرار پر برادران علی کے ہتھیار ڈالنے کی آئندہ توثیق اس زمانہ کی انگریزی دستاویزات سے بھی ہوتی ہے۔ لاہور پولیٹیکل روز نامچوں میں ایک اندراج[2] مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۴۷ء میں "ہزارہ سے ایک مولوی" کی گرفتاری کے بارے میں جس نے وہاں بغاوت کی قیادت کی تھی اور اس کے لاہور آنے کا ذکر موجود ہے جس مولوی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یقینی طور پر وہ ولایت علی ہی ہیں۔

تذکرہ صادقہ اور سوانح احمدی کے بیانات کی تصدیق اس زمانہ کی ایک نادر اور معاصر انگریزی دستاویز سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک شخص عبداللہ نامی پسر جان علی ساکن حاجی پور ضلع مظفر پور کا بیان ہے جو ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو اسسٹنٹ کمشنر راولپنڈی نے لیا تھا۔ عبداللہ پہلے محمد علی رامپوری کا پھر بعد میں ولایت علی کا مرید ہوا جن کے ہمرکاب وہ سرحد گیا۔ وہ خاص طور پر جنگ دوب کا ذکر کرتا ہے جس میں اس نے خود حصہ لیا، اور اس کے بعد کے واقعات کا بھی۔

۱۔ ڈاکٹر سیٹھی مؤلف بغاوت کشمیر، بنگال گذشتہ موجود، جلد ۲ ص ۱۱ تا ۱۲۱

۲۔ لاہور پولیٹیکل ڈائریز جلد ۲ ص ۔ یہ اندراج برادران کے ساتھ وینس ایگینو کے قول و قرار کے متعلق ہے مگر اس میں کہا گیا ہے کہ اس میں بجز سمت ہندوستان جانے کی ضمانت ہے نہ کہ مستثنیٰ۔

ایک متنازع واقعہ پر اس چشم دید شہادت کے پیش نظر اس کے ضروری حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"......سکھوں کے فرار کے بعد مظفرآباد میں چھ جنگیں ہو گئیں۔ تقریباً دو سو سکھ پہاڑیوں پر چڑھ گئے جن کا نام دوب ہے۔ ان سکھوں کو انگریزوں نے بھیجا تھا کیونکہ اس زمانہ میں انگریز ہی لاہور پر قابض تھے۔ اس وقت مولوی ولایت علی اور باقی لوگوں کو شکست ہو گئی۔ اور کاغان کے سردار[1] نوبت شاہ، ضامن شاہ اور دوسرے لوگ سکھوں سے جا ملے اور ولایت علی سے صاف کہدیا کہ "ہم اب آپ کی مدد نہیں کر سکتے"۔ ایبٹ اس وقت ہزارہ میں تھا اور اس نے ایک سکھ سردار کو (جس کا نام اس وقت میں بھولتا ہوں) ہدایت کی کہ ہمیں پہاڑ کے نیچے پہنچا دے، ہمیں چھوڑ دینے کا وعدہ کیا اور اس سے یہ بھی کہا کہ ہمیں اپنی نگرانی میں رکھے، اور یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس جو اسلحہ ہیں ان کو فروخت کر دیں تو وہ ان کی قیمت ادا کر دے گا۔

مسٹر ایبٹ اور ولایت علی کی گفتگو: چنانچہ ہمیں توپوں، زنبورکوں، دمہ اونٹوں وغیرہ کی قیمت بارہ ہزار روپے ملی .... اس وقت ہم چار سو نفر تھے۔ ہم بیرکا دوراہ پہنچے تو مسٹر ایبٹ ملے۔ وہ بالاکوٹ تک ہمارے ساتھ گئے۔ وہاں انگریزوں کی بارہ رجمنٹیں تھیں اور ہزارہ میں تو سپاہیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہاں مسٹر ایبٹ نے ولایت علی سے پوچھا "اب تم کدھر جاؤ گے؟" انہوں نے کہا "ستھانہ" اس پر مسٹر ایبٹ بولے "بہتر ہے کہ تم ہزارہ چلو اور لاٹ[2] صاحب سے ملو، جو وہ حکم دیں وہ کرو"۔ اس وقت وہ لوگ بے بس تھے اور ہزارہ

---

[1] مہر، جلد ۲، صفحہ ۲۲۶ نے سوانح اور تذکرہ صادقہ کے ضامن شاہ پر غداری کے الزام کی تردید کی ہے۔ مگر اس شخص کا یہ بیان ان کے بیانات کی تائید کرتا ہے۔

[2] ایچ۔ ایم۔ لارنس جو لاہور دربار میں ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔

جانے اور قلعہ کے نزدیک کیمپ لگانے پر مجبور تھے۔ چند دن کے بعد لاٹ صاحب نے ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی، فیاض علی اور یحییٰ علی کو بلا بھیجا۔ وہ خیمہ میں داخل ہوئے تو ان سے یہ سوال کئے گئے: کیا تم صادقپور عظیم آباد کے باشندے نہیں؟ کیا تم انگریز کی رعایا نہیں؟ کیا تم گورنمنٹ کو مالگذاری ادا نہیں کرتے؟ تم اس ملک میں کیوں آتے ہو؟" انھوں نے جواب دیا اپنے دین کی رو سے ہم کو کافروں سے لڑنا ہے۔ سکھ[1] ہمارے دشمن ہیں اس لئے ہم ان سے لڑنے آئے ہیں۔ لاٹ صاحب نے جواب دیا یہ ملک تو انگریزوں کا ہے۔ اب تم کیا کروگے؟ انھوں نے کہا "ہم کابل چلے جائیں گے"۔ مگر لاٹ صاحب نے کہا وہ ملک کابل تک یاغستان (آزاد) ہے۔ اگر تم وہاں چلے جاؤ گے تو پھر سازش کروگے، اور انگریزوں سے لڑنے لگو گے، اس لئے میں تم کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تب انھوں نے حکم صادر کیا کہ ہم اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ اس پر ہم لوگ منتشر ہوگئے۔ مولوی ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی، فیاض علی اور یحییٰ علی اپنے اپنے گھر عظیم آباد لوٹ گئے اور ایک مچلکہ سے وہ پابند کردئے گئے کہ چار سال تک پٹنہ نہ چھوڑیں۔ میں بھی اپنے گھر حاجی پور چلا گیا وہاں ایک مکان بنایا اور داناپور میں شادی کرلی۔ (تتمہ کلام)

ایک ایسے شخص کی طرف سے جس نے ان واقعات میں خود حصہ لیا ہو اس مستند تصدیق کے پیش نظر[2] اور تذکرہ صادقہ کے بیانات کو تفصیلی یا جزوی اختلافات کے باوجود مجموعی طور پر صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

ولایت علی وعنایت علی کی مراجعت پٹنہ: برادران علی کے پٹنہ واپس آنے

---

[1] یہ ان کے اصل مقصد پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک مہمل عذر تھا۔ انگریز خود ان کے اصل مقصد (انگریزوں سے جنگ) سے خوب واقف تھے یہ حقیقت لاٹ صاحب کے جواب سے ظاہر ہے۔

[2] مکتوب ڈپٹی مجسٹریٹ پٹنہ بنام انڈر سکریٹری حکومت ہند مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۵۲ء

اور سرحد کو ان کی دوبارہ ہجرت کا ذکر پٹنہ کے مجسٹریٹ کے ایک مراسلے میں یوں ہے:۔

"برادران علی ۱۸۴۷ء کے اواخر یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں صوبہ سرحد سے ادھر لوٹائے گئے تھے تاکہ ان سے ان کے گھروں میں رہنے کے لئے مچلکے اور حکومت کو پریشان نہ کرنے کا مچلکہ لے لیا جائے۔ سوٴ اتفاق سے اُس وقت کے مجسٹریٹ مسٹر لوشنگٹن نے نذر زبینی نہیں لی، چنانچہ اس کے فوراً بعد شمالی مغربی سرحد کی طرف واپس چلے گئے۔ لیکن اب ہماری حکومت کے ساتھ کھلم کھلا جنگ میں وہ سوات کے سردار سے جا ملے ہیں اس لئے اچھے چال چلن کی جو ضمانت ان سے لی گئی تھی وہ میرے خیال سے رد ہو گئی۔ اگر گورنمنٹ مناسب سمجھے تو میں ضامنوں کو گرفتار کر سکتا ہوں، لیکن ایسا اقدام اس ذلیل اور شریر شہر میں کچھ ہلچل[1] کا باعث ہو سکتا ہے۔ میں گورنمنٹ کے حکم کا منتظر ہوں۔"

ولایت علی و عنایت علی پر پابندی: اوکنیلی[2] کے بیان کے مطابق دس دس ہزار روپے کی چار سال کی ضمانت کے مچلکے کے پابند ہو کر وہ چند مہینے خاموشی سے پٹنہ میں بیٹھے رہے مگر جلد ہی ستھانہ میں باقی ماندہ جماعت کے سردار اولاد علی سے مراسلت شروع کر دی، عنایت علی کو ایک بار پھر ان کے پسندیدہ میدان عمل مشرقی بنگال میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کی باغیانہ تبلیغ و وعظ نے جلد ہی راجشاہی کے مجسٹریٹ کی توجہ جذب کی۔ اُس نے ان کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ یہ الزام بھی ضم تھا کہ عنایت علی جسے پہلے اس ضلع سے اپنی باغیانہ حرکات کے سبب سے خارج کر دیا گیا تھا پھر مجاہدین کی بھرتی کر رہا ہے۔ لیکن بعد کی کارروائی میں راجشاہی کے مجسٹریٹ نے عنایت علی کے باغیانہ منصوبوں کے متعلق اپنی پہلی رائے سے انحراف کیا اور اس سے پٹنہ کے مجسٹریٹ کو

---

[1] شاید نادانستہ یہ دلیل ہے شہر میں عوام میں برادران علی کی ہردلعزیزی کی
[2] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۸۱-۹۲

مطلع کر دیا۔ وہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے شکایت پیش کرنے والے سے جواب طلب کیا کہ جھوٹی نالش کے لئے اس پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے لیکن پٹنہ کا مجسٹریٹ عنایت علی کی پہلی کارروائیوں سے زیادہ واقف تھا ان کی بے قصوری پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا اور پھر ایک ہزار کے مچلکے کا پابند کر دیا۔

عنایت علی کی بنگال سے طلبی: ولایت علی نے یہ مدت دوبارہ تنظیم اور تبلیغ کے کام پر صرف کی۔ انھوں نے صوبے کا دورہ کیا اور لکچر دیئے۔ جب نیک چلنی کی ضمانت کی مدت کے اختتام کو چند مہینے باقی رہ گئے تو انھوں نے اپنی تمام جائداد منقولہ وغیر منقولہ فروخت کر دی اور ستمبر ۱۸۴۹ء کو ہجرت کر گئے۔ اسی اثنا میں ان کو سوات کے سید اکبر شاہ کی طرف سے دعوت کے خطوط ملے۔ عنایت علی اس وقت بنگال میں تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہاں کے معاملات کو ختم کر کے ہجرت کے لئے اپنے بڑے بھائی سے پٹنہ میں آملیں۔ مگر اس کی تعمیل میں ان کو چھ مہینے لگ گئے۔ پٹنہ پہنچ کر انھوں نے اپنی والدہ کو اپنے دوامی ہجرت کے ارادے سے مطلع کیا۔ انھوں نے اُن کو ان کے حصہ موروثی کے طور پر قصبہ دوآب پور ضلع گیا دے دیا جو انھوں نے بیس ہزار روپے پر بیچ دیا۔ اور خاندانی جائیداد میں

لہ تذکرہ صادقہ ص ۱۳۷۔ اصل الفاظ ہیں "مواصفات اجمال سے دستبرداری کی ایک تحریر لکھ دی"۔ مگر مولانا ولایت علی کی ایسی تحریر کا ذکر نہیں۔ مولانا ولایت علی یا عنایت علی کسی کی تحریری دستبرداری کا ذکر اس تذکرہ میں قطعاً بے محل، وہ غیر ضروری بھی ہے چنانچہ پہلا اڈیشن اس سے پاک ہے۔ افسوس ہے کہ مولف کتاب ہذا کو تذکرہ صادقہ کا پہلا اڈیشن دستیاب نہ ہوا۔ مولوی عبدالرحیم نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی اور یہ دوسرا اڈیشن وفات کے چھ سال بعد انھیں کے نام سے غالباً ان کے ورثہ نے شائع کیا جس کا نام درج کتاب نہیں۔ مگر اس میں اتنے الحاقات ہیں اور زبان بھی اتنی بگڑ گئی ہوئی ہے کہ اسے اصل مولف سے منسوب کرنا اس پر ستم ہے۔ اسی طرح اس دوسرے اڈیشن میں مولانا عنایت علی کے سوانح میں ان کے پوتے محمد یوسف (والد خاکسار) کے متعلق لکھا ہے کہ "مولوی محمد حسن نے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۷)

مبلغ پچیس روپیہ ماہوار در صورت گذران پیدا کرنے اپنا ایک مختصر مکان ان کے حوالہ کر دیا تھا۔ ۱۸۶۹
یہ بھی قطعاً بے محل اور غیر محقق ہے اور پہلے ایڈیشن میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مولانا
عنایت علی کے پرپوتے (خاکسار مترجم) کے مختار عام نے ۱۹۰۵ء کے قریب مولوی عبدالرحیم سے
اس کی موروثی جائیداد کے حصہ رسدی کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے رد کر دینے پر عدالت دیوانی
میں دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ مگر ۱۹۰۸ء میں مولوی عبدالرحیم کے جوان سال جانشین فرزند کا یکایک
انتقال ہو گیا جس سے سارا خاندان متاثر و متالم ہوا۔ فریقین مقدمہ سے دست بردار ہو گئے اور
پانچ ہزار روپے پر تصفیہ ہو گیا یعنی مولوی عبدالرحیم نے جس سے بہت کم پر محمد مسلم کا حق
تسلیم کر لیا۔ اور وہ اتنے ہی پر راضی و قانع ہو گیا۔

مگر انتقال کے بعد ان کے ورثہ نے جو دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس اندیشہ سے کہ
کہیں پھر محمد مسلم یا اس کے ورثہ دوبارہ مطالبہ حق رسدی کر کے قانونی چارہ جوئی نہ کریں حفظ
ماتقدم اور پیش بندی کے طور پر مدعیوں کو محروم یا محجوب الارث ثابت کرنے کیلئے ان کی کتاب میں
یہ فقرے الحاق کر دیئے۔ گو عبدالرحیم نے بھی اپنے تذکرہ کی اشاعت کے بعد اپنے جواب دعوے
میں یہ اظہار کیا کہ مولانا عنایت علی اپنی والدہ کی جو صاحب جائیداد مورثہ تھیں زندگی میں وفات پاچکے
تھے۔ یعنی مولانا ولایت علی اور فرحت حسین سے پہلے۔ اس لئے وہ محجوب الارث تھے۔ اور یہ تمام
تاریخی شہادتوں اور سندوں کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو بیان تحریری مولوی عبدالرحیم در مقدمہ
نمبر ۶ ۱۹۰۷ء عدالت سب جج سوم پٹنہ۔ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۸ء۔ اس کے علاوہ دوسرے
ایڈیشن میں اتنے بے سند الحاقات یا اضافات ہیں کہ ان کو مولوی عبدالرحیم کی تالیف نہیں کہا جاسکتا۔
کتاب کی تاریخی قدر و قیمت بہت خفیف ہو جاتی ہے۔] مترجم

اپنے باقی حصہ کے متعلق اپنا چکائی اور بے باقی نامہ لکھ دیا۔ اس طرح اُن کے اپنے
دنیاوی معاملات نپٹانے میں تین مہینے لگے، اور ولایت علی کے کوئی نو ماہ بعد
۱۸۴۰ء کے وسط میں روانہ ہو گئے اور ولایت علی سے پنجاب میں ملے

کی سرائے میں ملے اور دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔

آغاز سفر: ولایت علی کے سب سے چھوٹے بھائی فرحت حسین کو تنظیم کی سربراہی کے لئے گھر چھوڑ دیا گیا۔ خاندان کے تین اور ارکان یحییٰ علی، فیاض علی اور عبداللہ ۲۵۰ مردوں اور عورتوں کے ساتھ بعد میں روانہ ہوئے اور آرہ کے قریب ولایت علی سے مل گئے۔ اس طرح فرحت حسین کے سوا قریب قریب تمام دقیع ارکان خاندان اس دشوار سفر کو چل پڑے۔ پہلا پڑاؤ پٹنہ سے چند میل مغرب کو پیورٹیں ہوا جہاں ایک مقامی رئیس امام علی نے ان کی تواضع کی۔ آرہ پہنچے پر چودھری لشیر نے ان کی ضیافت کی۔ دوسرا پڑاؤ غازی پور میں ہوا جہاں محمد فصیح ان کے میزبان ہوئے۔ مرد مسجد میں ٹھہرائے گئے اور مستورات میزبان کے گھر میں۔ اس کے آگے ولایت علی نے دھیرے دھیرے مختلف جگہوں میں ڈیرا کرتے اور لکچر دیتے ہوئے راستہ طے کیا۔

بہادر شاہ دوم اور ولایت علی کی ملاقات: ایک سال سے زیادہ کے سفر کے بعد آخر وہ دلی پہنچے۔ وہاں وہ ایک ایسے گھر میں قیام پذیر ہوئے جو آسیب زدہ کہلاتا اور خالی رہتا تھا۔ یہ فتح پوری مسجد کے قریب واقع تھا۔ یہ گھر وہ وہاں کوئی دو مہینے مقیم رہے۔ بقول او کینیلی ولایت علی کے لکچر عوام کی توجہ کو جذب کر لیتے تھے۔ یہ مجالس وعظ جو جامع مسجد اور دوسری مساجد میں منعقد ہوتی تھیں ان میں حاضر ہونے والے اہم لوگوں میں مشہور شاعر اردو مومن خاں اور بہادر شاہ دوم کی اعلیٰ ترین ملکہ زینت محل کے معلم امام علی بھی ہوتے تھے۔ امام علی اور مومن دونوں نے ان سے بیعت کر لی اور بادشاہ سے ان کے اعمال کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے بھی ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ ان کو شرف باریابی بخشا گیا اور دیوان خاص میں جلسہ قرار پایا۔ ولایت علی

لے یہ مولوی عبدالرحیم مؤلف تذکرہ صادقہ کے والد تھے۔

۷۵ آدمیوں کے ساتھ پہنچے، زندگی کی ناپائیداری اور اللہ کے احکام سے سرتابی کرنے والوں کے لئے جہنم کی سزا کے موضوع پر وعظ بیان کیا۔ یہ ایک زبردست اور موثر تقریر تھی جو آداب دربار کے منافی تھی۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ بادشاہ کے حضور میں کوئی ناپسندیدہ موضوع نہ چھیڑا جائے۔ تمام سامعین مع بادشاہ نہایت متاثر ہوئے[1] وعظ کے اختتام پر بادشاہ نے عرض کیا کہ زندگی کی ناپائیداری پر ہم نے بھی کچھ شعر کہے ہیں۔ اس کے جواب میں ولایت علی نے ایک آیت قرآن اس مضمون کی پڑھی کہ تلاوت قرآن میں کسی کو مخل نہ ہونا چاہیئے۔ بعد میں بادشاہ کے اشعار ریزیڈنٹ نے پڑھکر سنائے اور ان لوگوں کو شاہی عمارات کی سیر کرائی۔ اپنی جگہ پر واپس آنے کے بعد ان کی ضیافت کی گئی جس میں پچاس طشت تھے جو بادشاہ کی طرف سے آئے تھے۔ امام علی اور مومن خاں خود کھانے لائے۔

ولایت علی کی دہلی سے روانگی: بادشاہ نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ ماہ رمضان قریب ہے اس لئے یہ جماعت کچھ دنوں اور رک جائے مگر ریزیڈنٹ نے ولایت علی سے ان کے ماضی کے حالات اور مقصد[2] سے متعلق بہت باریک سوالات کئے تھے جن سے وہ مشتبہ ہو گئے اور بادشاہ سے رخصت ہو کر فوراً

---

[1] تذکرہ صادقہ صـ ۱۲۶-۲۷۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر افراد جماعت سے مصافحے کئے اور مزاج پرسی کی مہر جلد ۲ صـ ۲۷ میں بھی اس بیان کی تائید ہے۔ آگے چلکر ایک اور سلسلہ سخن میں تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۵۲-۵۴ پہ بھی مذکور ہے کہ ولایت علی کے چھوٹے فرزند محمد حسن :- ذبیح جو اس وقت پانچ سال کے تھے اس موقع پر باپ کے ساتھ تھے۔ بادشاہ نے ان کو گلے لگا کر پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے کہا "قرآن" اور ایک آیت تلاوت کی بادشاہ اس ہونہار بروے کے قبل از وقت نشوونما پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس لڑکے نے بعد میں پٹنہ سٹی میں ایک مدرسہ قائم کیا جو ترقی کرکے محمڈن اینگلو عربک ہائیر سکنڈری اسکول ہو گیا اور اب کالج ہے[2] سوانح صفحہ ۲۲۳

مثلاً او کینیلی[1] لکھتا ہے کہ "ولایت علی کو حکومت برطانیہ سے وہ کینہ نہ تھا جو ان کے بھائی کی خصوصیت تھی" اور اس کا سبب اس نے ولایت علی کے وسطی ہند، بمبئی اور سندھ میں طویل سفر ظاہر کیا ہے۔ اس سفر نے ان کو برطانوی حکومت کی طاقت کا بہتر احساس دلایا۔ او کینیلی کے خیال کے مطابق ولایت علی سمجھتے تھے کہ وہابیوں کی طاقت ابھی انگریزوں کے مقابلے کیلئے کافی نہیں۔ اور ناکافی طاقت کے ساتھ ضعیف عزم سے اقدامات کرنے ان کی ہمت شکنی کا باعث ہوگا اور انگریزوں کو ہشیار کریگا۔ وہ جب اپنے مقاصد سے متنبہ ہو جائینگے تو اندرون ہندوستان سے وہابیوں کا سلسلہ مواصلات منقطع کر دینگے۔ عنایت علی صبر و انتظار کی تاب نہ رکھتے۔ ان کے خیال میں اس صبر و تامل سے ایمان کی کمی ثابت ہوتی ہے۔ وہ زیادہ جذباتی اور تخیل پرست تھے۔

ولایت علی کا تدبر: بقول او کینیلی دونوں بھائیوں میں یہ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ پوری جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ بنگالیوں نے عنایت علی کا ساتھ دیا جنہوں نے ان میں رہ کر کام کیا تھا اور باقی ولایت علی کے ہم خیال ہوگئے۔ ولایت علی کو عنایت علی کی کارروائی سے مزید تلخی رک گئی۔ بڑھتے ہوئے اختلافات پر نظر کرکے دونوں گروہوں کے سامنے آئے، سرداری سے ہاتھ اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا اور درخواست کی کہ انصاف کی اس آڑے وقت میں حفاظت کریں اور بھائی بھائی کے درمیان جنگ نہ ہونے دیں۔ عنایت علی نے اس آرزو پر عمل کیا۔ اور ستھانہ چھوڑ کر منگل تھانہ کو چلے گئے۔ یہ واقعہ محرم ۱۲۶۸ھ (اکتوبر نومبر ۱۸۵۱ء) میں ہوا۔

عنایت علی کی مزاجی کیفیت: تذکرہ صادقہ کے مؤلف عنایت علی کی کسی قدر تند مزاجی کا ذکر کرتے اور فرماتے ہیں کہ بوڑھاپے میں یہ تند مزاجی چڑچڑاپن اور غضبناکی میں منتقل ہوگئی۔ وہ ایک صاف گو کھرے آدمی تھے۔ میدان جنگ اور تبلیغ دونوں میں تحریک کی خدمت میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ [illegible]

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ سنہ ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۸۳ [illegible] صفحہ ۲۲۲

اگر اس قسم کی کوئی یقین وہابی ہو جائے تو تمام وزیروں کو صرف ریذیڈنٹ[1] سے رجوع کرنے پر آمادہ کرنے سے بے انتہا مفید ہو گی۔" دراصل ریاست کے معاملات میں سیاسی جبر و اقتدار کی مذمومہ زیادتی ہی کے خلاف یہ سازش تھی۔

مبارز الدولہ کے خلاف ریذیڈنٹ فریزر کی رپورٹ: انگریزی فوج کی (جو افغانستان میں تھی) غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مبارز الدولہ کے رفقا نے سر اٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ پہلا قدم یوں اٹھایا گیا کہ حیدرآباد اور دکن کے دوسرے مقامات پر جو فوجیں متعین تھیں ان کو بہکانے کی کوشش کی گئی۔ اس سازش میں ہندوستان کے حکمرانوں کی ایک معقول تعداد جس میں نواب کرنول بھی شامل تھے، شریک تھی۔

[illegible] جودھپور، اودے گڑھ، بھوپال اور میسور کے فرمانروا بھی سازش کے منصوبوں سے مراسلت کر رہے تھے۔ اول الذکر دونوں حکمران ذاتی وجوہ کی وجہ سے انگریزوں سے بیزار تھے۔ ان راجاؤں کے نیچے میں مختلف اسباب کارفرما تھے لیکن ہر صورت میں انگریزوں کے خلاف جذبہ ایک مشترک سبب تھا۔ مبارز الدولہ اور ان کے رفقائے کار کی کارروائیوں پر رپورٹ کرتے ہوئے فریزر نے ایک شخص سید اسمعیل کا بیان بھی منسلک کیا ہے جو مبارز الدولہ کا برطرف کردہ ملازم تھا۔ اس میں مذکور ہے کہ خود مبارز الدولہ اور ان کے رفقا بہت سخت فوجی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ اس میں مبارز کے اس ارادے کا ذکر بھی ہے کہ وہ "نکل کھڑے ہوں اور اپنے ساتھیوں کو جمع کریں اور انگریزوں کو قتل کر کے ملک اور حکومت پر خود قبضہ کر لیں۔" ان کے پیر و فقیر وغیرہ کے بھیس میں بہت سے افسران اور سپاہیوں تک پہنچ جاتے اور سپاہیوں کو وہابیت میں داخل ہونے کے لئے بہکاتے۔ ساتھ ہی ساتھ بغرض ترغیب بغاوت کے لئے ان ایجنٹوں سے خبروں کا ایک لامتناہی سلسلہ مبارز کے لئے فراہم ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے رپورٹ کی کہ رجمنٹ کے تمام سپاہی متحد الخیال ہیں اور سب مبارز کے

---

[1] ایچ فریزر، ہمارا وفادار حلیف نظام، لندن ۱۸۶۵ء، صفحہ ۲۴۸۔ [2] مقدمہ محولہ بالا

ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے رفقا سے کار جن میں زیادہ تر وہابی مولوی تھے مزید
تحقیقات تک گرفتار رکھے گئے۔ مگر حکومت ہند نے ان واقعات میں کوئی خطرناک
علامت نہیں پائی۔ بلکہ اس کے برخلاف لارڈ ایلگن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "میں ان
لوگوں میں سے نہیں جن کا یہ گمان ہے کہ ہندوستانیوں میں ہماری بادشاہت کے خلاف
نفرت کا کوئی ہندوستان گیر عملی جذبہ موجود ہے۔" ایسے بیشتر متفرق واقعات
کے متعلق عام انگریزی حکام کے طرز فکر کا یہ ایک نمونہ ہے۔ اس سے برطانوی
حکومت کے روز افزوں بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی جیسی کہ یہ واقعات ظاہر کرتے ہیں، ظاہر
ہوتی ہے۔ پنجاب میں فرائضی شورش کے زمانے میں بھی حکام نے ایسی ہی ذہنیت
دکھائی تھی جس کی حکام کو آگے چل کر بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی۔

کی شان قائم رکھنا تھی اور اس کی مناسب و معقول کارکردگی کے لئے متعدد ضروری
آلات نصب کرنا تھے۔ اس کے علاوہ اگر ریاست کا ان لوگوں کی نظروں میں جن کے
درمیان یہ قائم کی گئی تھی عزت و احترام برقرار رکھنا ضروری تھا تو ظاہری رعب داب
کا یہ تیور بھی قائم رکھنا ضروری تھا۔ مقامی جنگجو لوگ صرف طاقت ہی کی زبان سمجھتے تھے
ان مصالح کے علاوہ یہ نظام یہ حقیقت بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہابی قائدین مذہبی دیوانے
نہیں بلکہ اپنی تحریک کے سیاسی وزن و عواقب سے بھی خبردار تھے۔

جدید انتظامی تجربہ کی ناکامی: ایک جدید طرز کا انتظامی تجربہ یہ تھا کہ قانون شکنی
کرنے کی تحقیقات پر نظر رکھنے اور ملزموں کو کیفر کردار پر پہنچانے کے لئے قاضیوں کے
ماتحت نگران طالب علموں سے کام لیا جاتا۔ اور ان ملزموں سے جو جرمانے وصول ہوتے
انھیں سے ان طلبہ کے اخراجات چلائے جاتے لیکن اس نظم میں ایک عیب یہ تھا کہ
ان نگران طلبہ کے گذارے کے اخراجات ان جرمانوں کی تحصیل پر موقوف تھے جو وہ عائد کرتے
تھے اس لئے ہر ممکن موقع پر وہ جرمانے لگانے پر آمادہ رہ سکتے تھے۔

وہابی ریاست کا نظم و نسق: ریاست کے نظم و نسق میں اسلامی اثرات سے
لبریز بنا بر حکومت الٰہیہ جیسی بات نظر آتی ہے۔ لیکن تحریک کی بنیاد کو وہابی ریاست
کی نوعیت متعین کرنا تھا۔ مقصود اگر زمانے میں جب کہ ہندوستان میں مذہبی یکجہتی
کا تخیل نہ تھا۔ علاوہ بریں وہابیوں کے قبضے میں جو خطہ تھا وہ قریب قریب سارے
کا سارا صرف مسلمانوں سے آباد تھا۔ ان کے نظام حکومت میں غیر مسلموں کے مقابلے
میں مسلمانوں کے ساتھ کسی ترجیحی سلوک کا دخل نہ تھا جو حکومت الٰہی کی سب سے
بڑی خصوصیت ہے۔ بہرحال اپنی مسلمان رعایا کے عوام الناس میں انھوں نے عہدے
احکام جاری کرنے اور ایسے متنازعات ختم کرنے کی کوشش ضرور کی جن کو وہ مضر
سمجھتے تھے۔ اس لئے وہابیوں کے متعلق سختی سے کوئی رائے قائم نہ کرنا چاہئے۔
ہر حکمراں جماعت جو برسر اقتدار ہو جاتی ہے وہ نظام حکومت میں ان اصولوں کو چلانے
کی کوشش کرتی ہے جو اپنی نگاہ میں لازمی دکھتی ہے۔ وہابیوں نے کچھ سماجی مذہبی

صلاحیت کے رائج کرنے میں نہیں بلکہ اُن شدت اور سرعت میں جس کے ساتھ وہ ان کو انجام دینا چاہتے تھے سیاسی دقیقہ رسی اور فہم و ذکا کی تیزی کا ثبوت ضرور دیا۔

وہابیوں نے اپنی تحریک سے حاصل کردہ ریاست میں جو نظام رائج کیا وہ ابتدائی اور نوزائیدہ تھا۔ حالات نے اُن کو اتنا دم لینے کی مہلت نہ دی کہ وہ حکومت کا کوئی ہمہ گیر نظام تیار کر سکیں۔ اس چھوٹی سی ریاست کے سر پر اس کے نہایت مختصر وجود کی مدت میں بیرونی جنگ اور اندرونی بغاوت کے سائے منڈلاتے رہے۔ چنانچہ زمانۂ امن و صلح کے سے حالات کبھی میسر نہ ہوئے جو کسی نظام کے نشوونما کی اجازت دیتے۔ ہر بات جنگ کے امکانات پر منحصر تھی اس لئے غیر جنگی حکام کی دو جماعتیں، تحصیلداران مالیات اور دینی افسروں کی قائم کی گئیں۔ دوسرے ملکی محکمے جیسے تعلیم و حفظان صحت وغیرہ قائم نہ کئے جا سکے۔ اس تحریک کی تاریخ کے طالب علم کے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا کہ وقت اور امن کے موجود ہونے کی شرط پر صورت حالات و واقعات پر غور و فکر کرے۔

اور ان قلمرو سے انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے تمام ذرائع و طاقت کا مقابلہ کیا۔ چار مستقل عنوانات کے تحت ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے (۱) پٹنہ کی مرکزی تنظیم (۲) دورے کرنے والے مبلغین (۳) اضلاع کے مراکز (۴) رقوم کی تحصیل :-

(۱) پٹنہ کی مرکزی تنظیم

قافلہ: سب سے پہلے ہم پٹنہ میں وہابی صدر مقام کی اس عمارت کا حال بیان کرتے ہیں جسے خود وہابی اپنی خفیہ زبان میں قافلہ یا بقول ہنٹر باغیوں؛ وسازشیوں کی کاروان سرائے کہتے تھے۔ ہنٹر نے ان عمارات کی جو بعد میں حکومت کے حکم سے ڈھا کر زمین کے برابر کر دی گئیں اور ان میں جو تعلیم دی جاتی تھی جو تصویر کشی کی ہے وہ محفوظ ہے اور ذیل میں پیش کی جاتی ہے :-

"پٹنہ کے قدیم شہر کے مسلمان محلہ میں ایک گلی ہے جسے صادق پور کی گلی کہتے ہیں، جہاں مسافر بہت چلتے پھرتے ہیں۔ اس گلی کے بائیں ہاتھ پر بے قرینہ عمارتوں کا ایک مجموعہ ہے جس کے سامنے کافی کشادہ صحن ہیں اور گلی سے کچھ فاصلہ پر پیچھے تک چلے جاتے ہیں۔ ان کے بیرونی حصوں کی شکل ویسی ہی اداس شکستہ و ریختہ نظر آتی ہے جیسی برسات کے بعد اینٹوں پر پلاسٹر کی ہوئی عمارتیں مستقلاً اختیار کر لیتی ہیں اور جو مشرقی شاندار تعمیر کے ہمارے جمے جمائے تصور کی مکروہ ضد پیش کرتی ہیں۔ اس پورے مجموعۂ عمارات میں سب سے نمایاں مسجد ہے جس کا اندرون بہت سادہ ہے۔ جہاں ہر گھڑی نمازیں ہوتی رہتی ہیں اور ہر جمعہ کو خطبہ یا لیکچر دیا جاتا ہے۔ صادق پور کی مسجد میں جمعہ کے یہ خطبے شہر کی دوسری مسجدوں کے خطبوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ پرزور تقریریں ہوتی ہیں جن میں ایمان کے بغیر سارے اعمال کو بیکار۔

---

[1] اب اس مقام پر پٹنہ سٹی میونسپلٹی کے دفاتر کے مکانات اور ان سے متصل باغ واقع ہے۔

ہونے، سامعین کو عظیم روحانی خطرے سے متنبہ کرنے اور روحانی زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ خطبے پیغمبر صلعم کی سادہ عبادتوں کا ان مساجد میں پیچیدہ رسوم عبادت، لامتناہی سوانگوں ڈھونگوں، اور طرز رکوع و سجود سے مقابلہ کرتے اور ان لوگوں کے خلاف سخت گوئی کرتے جنھوں نے سنی سنائی روایتوں کی بنا پر احکام منصوصہ کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ شہر کی دوسری مسجد کے دوستوں کو چند صادقپور کے واعظوں کی علمی قابلیت اور فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرنے پر تو مجبور ہوتے مگر مقدس تبرکات .... کے منکر کی حیثیت سے ان کو برا بھلا کہتے۔" آخر میں یہ بیان آس پاس کی عمارتوں کے ذکر پر تمام ہوتا ہے۔ "مسجد کے ارگرد پیش امام اور مستورات کے سکونتی مکانات اور صحیح العقیدہ طلبہ کے لئے ایک چھوٹا سا کالج، متقی مسافروں کے لئے ایک مہمان خانہ اور کئی مزار ہیں جن میں دولت بزرگان دین کی ہڈیاں مدفون ہیں۔"[1]

رنگروٹوں کی تعلیم و تربیت: "ہر شعبۂ زندگی سے رضاکاروں کا مسلسل ریلا اس فرقے کے عقائد کی تعلیم حاصل کرنے اور تبلیغ اور نئے رنگروٹوں کو بھرتی کے صبر آزما کاموں کی تربیت کے لئے صدر مقام میں پہنچتا تھا۔ رضاکاروں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ ان کو ان کی تعلیمی قابلیت اور ان کے سماجی رتبے کے مطابق کام دیئے جاتے تھے، چنانچہ زیادہ ہونہار جوانوں کو کالج میں داخل کر لیا جاتا اور اسلامی شریعت اور علم کلام میں تربیت دی جاتی۔ اور [illegible] کو اصلاح شدہ مذہب کے صرف موٹے موٹے عقائد میں تعجیل کے ساتھ تعلیم دے دی جاتی اور سرحد کو بھیج دیئے جاتے۔ ان سے کم درجہ کے رضاکاروں کو افضلیت دی جاتی۔ مہمان خانے میں ان کا خیر مقدم کیا جاتا اور مہمان خانے کے خازن ان کی [illegible] کے ذمہ کئے جاتے۔ وہ ان کو ان کے مقصد عظیم کے لئے جہاد کی ضرورت اور ثواب پر

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۴، ۱۸۶۴ء صفحہ ۳۱

لیکچر دینے۔ ایسے نو واردوں کے لئے زیادہ نظری تعلیم درکار نہ تھی۔ ان کا کام صرف یہ عملی زیادہ تھا۔ سادہ غیر نظری دانشمندانہ تعلیم سے ان خام رنگروٹوں میں اتنا جوش و شوق پیدا ہو جاتا کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنی خوشی سے مجاہد ہو جاتے۔ ان کثیر معتقدین کا اپنا مذہب ۔ کے لئے جوش اور سکھوں سے نفرت جو سکھوں نے سکھوں کے جانشین انگریزوں میں منتقل کر دی تھی اس درجہ تھی کہ سید احمد کی شہادت کے کئی سال بعد تک رنگروٹ اور روپے کثیر تعداد اور مقدار میں برطانوی ہند سے ستھانہ پہنچتے رہے۔[1]

خلفا کا تقرر: یہ سارے کام مقامی سردار کے زیر ہدایت انجام دیے جاتے تھے۔ جو خلیفہ کہلاتا تھا۔ خود سید احمد کے مقرر کردہ خلیفوں میں پٹنہ سے محمد حسین ولایت علی اور مظہر علی تھے۔ ان کو اپنے اپنے طور پر اپنے خلفا مقرر کرنے کا اختیار تھا۔ اس طرح خدا کی زنجیر طول کھنچتی رہتی۔

محررہ سابق مولوی عبدالغفار مرحوم کی یادداشتوں اور نجی کاغذات میں اُن لوگوں کی فہرست موجود ہے جن کو یکے بعد دیگرے خلافت کے فرائض سونپے گئے۔ ہر خلیفہ کے معاون مشیروں کی ایک کمیٹی ہوتی: ایک وزیر جنگ و وزیر مالیات وغیرہ ہوتے تھے۔

فہرست درج ذیل ہے:۔

(۱) سید محمد حسین۔ جن کے معاون تھے۔ اکبر علی، فیاض علی، یحییٰ علی، واعظ الحق اور مقصود علی۔

(۲) ولایت علی امیر، عنایت علی وزیر جنگ، فرحت حسین مالیات اور رضا کاروں کی بھرتی کے ذمہ دار۔

---

[1] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۳-۶۴

(۳) فرحت حسین (خلیفہ ولایت علی) امیر، یحییٰ علی صلاح کار، احمد اللہ و عبدالرحیم مشیر۔
(۴) یحییٰ علی (خلیفہ فرحت حسین) امیر، عبدالرحیم ذمہ دار مالیات، احمد اللہ مشیر، منجملہ مذکورہ مشیروں کے جو زندہ بچ رہے تھے۔
(۵) احمد اللہ امیر، مبارک علی ذمہ دار مالیات، ارادت حسین مشیر۔ اور ممبروں کے نام معلوم نہیں۔
(۶) مبارک علی امیر، محمد حسن ذمہ دار مالیات۔
(۷) محمد حسن امیر۔ (اس فہرست میں کسی اور کا نام نہیں۔
(۸) عبدالرحیم (غالباً ان کے جزیرہ انڈمان سے لوٹنے کے بعد) امیر، ابو محمد ابراہیم، عبداللہ غازی پوری اور عبدالعزیز رحیم آبادی مشیران[1]

مجلسِ اعلیٰ: یہ فہرست ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ وہابی تحریک کی کارکن کمیٹی کی کچھ نشان دہی کرتی ہے یہ سب سے بڑی مجلس تھی جو تحریک کی تنظیم کرتی اور چلاتی تھی۔ تحفظ و احتیاط کے پیش نظر اس کی تشکیل اور کارکردگی تحریری ضوابط کی پابند نہ تھی۔ تمام ارکان ایک ہی جذبۂ ایثار و خدمت سے سرشار تھے اور سارا نظام خود کو سمجھ بوجھ کے ساتھ ہمواری سے چلتا تھا۔ اس فہرست سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک کی خدمت میں تجربہ کی بنا پر ترقی کر کے امیر ہوتا تھا نہ کہ زیادتی عمر یا عہدے کی بنا پر۔ یہ فہرست ہماری ان معلومات کے بھی عین مطابق ہے جو ہمیں تحریک کی تاریخ، بعد کی دستاویزی شہادتوں سے اور امیروں کی کارگذاریوں کے خاتمے کے بعد کے حالات سے حاصل ہوئی ہیں۔

خلیفہ یحییٰ علی: برادران صادق پور کے زیر قیادت احیائے تحریک کے زمانے میں کچھ عرصہ تک پٹنہ کے خلیفہ یحییٰ علی تھے۔ انھیں کی تنظیمی قابلیت نے پٹنہ کے صدر مقام کی متنوع ضروریات کی سربراہی کی۔ ان کے ذمہ فرائض میں سے صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] یہ باقاعدہ نظام عبدالرحیم کے حبس جزیرہ (انڈمان) کے بعد درہم برہم ہوگیا۔

مسجد میں عوامی، مدادا نظر ربانی نکتوں پر طلبہ میں تقریریں کرنا ضلعی مرکزوں سے مراسلات، سرحد پر بھیجے جانے والے اسلحہ کی جانچ پڑتال، ہنڈیاں جن سے بھاری بھاری رقوم خفیہ طور پر ارسال کی جاتی تھیں ان کی پیچیدگیوں یا دشواریوں کی بنفس نفیس دیکھ بھال۔ خازن عبدالغفار دنیاوی معاملات جیسے رضاکاروں اور طلبہ کے قیام و طعام کے انتظام میں ان کی مدد ضرور کرتے تھے مگر مرکزی انتظامات کی روح رواں وہی تھے۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر مقدمہ انبالہ میں جس میں یحییٰ علی خاص ملزمین میں سے تھے ہربرٹ ایڈورڈ کے فیصلے سے کچھ اقتباس نقل کردیا جائے اس جج نے رائے زنی کی ہے "یحییٰ علی کے خلاف ثابت ہوگیا ہے کہ اس عظیم غداری کی مشین کی جسے اس مقدمہ نے منکشف کردیا ہے بڑی کمانی یحییٰ علی تھا۔۔۔۔

۔۔۔ روپے جمع کرانے اور مسلمانوں میں جہاد کی تبلیغ کرنے کے لئے اس نے اپنے ماتحت ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے۔ اس نے اپنے لاکھوں ہم وطنوں کو دھوکا دیکر غداری اور بغاوت پر آمادہ کردیا۔ اس نے اپنی سازش سے حکومت برطانوی ہند کو ایک سرحدی جنگ میں الجھا رکھا ہے جس سے سیکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔۔۔۔۔ جو کچھ اس نے کیا ہے پہلے سے سوچ سمجھ کر اور بڑی عیاری وغداری سے کیا ہے۔ وہ ایک موروثی غدار اور مذہبی متشدد خاندان کا فرد ہے"[1] ایڈورڈز کو کبھی یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ ایک دن آئیگا جب کہ یحییٰ علی کی یہ سخت مذمت ان کی وفادارانہ مساعی کی شہادت میں پیش کی جائیگی۔

(۳) دورے کرنے والے مبلغین

وہابی مبلغین کی اہمیت: دورے کرنے والے مبلغین وہابیوں کی اندرونی تنظیم کے دھرے کی کیل تھے۔ یہ کارکنوں کی وہ خود فراموش بے نفس جماعت تھی جو سارے ملک میں چکر لگاتی تھی اور دعوت کو اندرونی حصوں میں پھیلاتی اور تحریک کے

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱۱ ۱۸۶۴ء صفحہ ۱۳۲

لیے مال جمع کرتی۔ جہاں گرد داعیوں کے اس طریق کار کو ہندوستان کے موسمی حالات اور سیلانی جوگیوں اور سادھوؤں کی قدیم روایات نے نمونۂ عمل اور دلکش بنا دیا تھا۔ موسم کے شدائد جو لوگوں کو گھر سے نکل کر پناہ لینے پر مجبور کر دیتے اس ملک میں ناقابل برداشت نہ تھے۔ اور سال کے زیادہ حصوں میں یہ دعاۃ بلا مزاحمت سفر کر سکتے تھے۔ سیدھے سادے دیہاتیوں کے لیے ایک سیلانی فقیر کا پھیرا کوئی انوکھی بات نہ ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر ان کا خیر مقدم کیا جاتا اور مختصر مدت کے لیے ان کو مفت طعام و قیام مہیا کر دیا جاتا۔ ایک مبلغ کے سیر و سفر کی ایک مثل المشہور ہندو عقیدہ کی ناقابل تقسیم زبان میں پیش کی جاتی ہے۔ دیہاتی مبلغ کی تنہائی کی زندگی اس کے مذہب و پیغام کے لیے زیادہ دلچسپی کا موجب بنا دیتی۔ مہینوں وہ کسی کے گھر میں داخل نہ ہوتا۔ وہ کسی دور کے صوبے سے آتا اور اپنے طویل سفر میں کسی معتمد شاگرد یا چیلے کے سوا کسی ہم سفر کو جو اس کے دھیان گیان میں خلل انداز ہو ساتھ نہ رکھتا۔ اس کے کردار کی سنجیدگی اور خارجی ماحول سے اس کی لاتعلقی اسے عام آدمیوں سے نمایاں طور پر مختلف بنا دیتی۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ دیہاتی اس کے گرد جمع ہو جاتے اور کچھ دیر کے لیے اپنے آپس کے جھگڑے اور معمولی سوالوں کے جھگڑے بھول جاتے۔[1]"

مبلغین کا محتاط رویہ: یہ مبلغ اس بات کی بڑی احتیاط رکھتے تھے کہ ان کی تعلیم میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو حکام کے کان کھڑے کر دے۔ عنایت علی کی کارروائیوں میں بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح راجشاہی کا مجسٹریٹ اس حد تک ہو گیا کہ ایک شکایت لانے والے سے جواب طلب کر لیا کہ عنایت علی کی باغیانہ حرکات کے خلاف جھوٹی شکایات دائر کرنے کے لیے اس پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے۔ فی الحقیقت ان مبلغوں کی کارروائیوں کے صحیح معنی کا پتہ چلانے میں جن پر بغاوت کی عمارت کھڑی کی گئی تھی حکام کی ہمیشہ ناکامی حیرت انگیز ہے اور ہنٹر اور کیئی دونوں نے اس پر سختی سے

---

[1] آور انڈین مسلمان صفحہ ۷۲

(۳) ضلع وار مراکز

اندرونی تنظیم کی درجہ بدرجہ تقسیم میں دوسرا درجہ ضلعی مرکز تھے جو دورے
کرنے والے مبلغین کے اندرونی گوشوں میں جہاں ان کے پیغامات کا خیر مقدم حوصلہ
افزا ہوتا اقامت پذیری کے نتیجے میں قائم ہو جاتا۔ سارے بنگال اور بہار کے دور دست
حصوں میں ایسے مراکز پھیل گئے۔ ہنٹر ان کے طریق کار کی تشریح کے ساتھ بنگال کے
ضلع مالدہ کے دو مرکزوں کا مفصل ذکر کرتا ہے۔[۱]

مبلغین کا طریقۂ کار: "۱۸۴۰ء کے قریب عبدالرحمن ایک لکھنؤ کا باشندہ اور ولایت علی
کا ایک خلیفہ اپنے تبلیغی دوروں میں مالدہ آیا۔ وہاں شادی کر لی، ایک مدرسہ کا معلم بن
گیا اور وہیں مستقلاً قیام پذیر ہو گیا۔ اس کے پیشے نے اس کو موقع دیا کہ وہ ہر جگہ
کے لوگوں سے ملتا جلتا رہے اور بالخصوص جوانوں پر اپنا اثر ڈالے۔ وہ اپنے ضلع سے
آدمی اور روپے جمع کرنے اور ان کو پٹنہ بھیجنے کا دوہرا کام کرتا رہا۔ اس کام میں ایک شخص رفیق
منڈل قابلیت کے ساتھ اس کی اعانت کرتا رہا۔ وہ دراصل ایک کاشتکار تھا
مگر عبدالرحمن نے اسے تحصیلدار مقرر کر دیا۔ ان کا کام بہت عرصے تک بلا مزاحمت
چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۸۵۳ء میں حکام مشتبہ ہو گئے۔ رفیق منڈل کے گھر کی تلاشی
لی گئی اور اس کے کاروبار کے باغیانہ انداز کے ثبوت میں کچھ کاغذات دستیاب
ہوئے اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اس سبب سے جسے ہنٹر
"سرکار کی معمولی سازشیوں کی حقارت آمیز نظر اندازی" کی پالیسی کہتا اور تنقید و تعریض
کرتا ہے، رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد رفیق منڈل نے اپنا کام اپنے بیٹے امیر الدین کے
سپرد کر دیا جو ایک لائق جانشین ثابت ہوا اور بڑی قابلیت، تندہی، جوش اور سرگرمی سے
کام چلاتا رہا۔ اس کے زیر نگرانی مالدہ کے مرکز کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ وہ [illegible]
کے سارے ضلعی مراکز کا ایک مقبول عام ڈپو اور اکثر قائدین پٹنہ جانے سے پہلے یہاں
اور مفسدوں کی ان کے دوروں میں ایک نہایت مطلب قیام گاہ بن گیا۔ مرکز

۱؎ اور انڈین مسلمانز صفحہ ۱۰۸-۱۰۲

بلا خلل و مزاحمت دس سال سے زیادہ چلتا رہا۔ اس لئے کہ حکام ضلع اور خصوصاً ہندوستان کا ایک انگریز مجسٹریٹ صدر سلطنتِ روما کی طرح اپنے زیرِ حکومت اقوام کے طرح طرح کے عقائد و توہمات میں دخل اندازی کو ناپسند کرتا تھا۔ اس طرح غداری بھی مذہبی لبادے میں باطمینان چل پھر سکتی تھی۔ ۱۸۶۰ء میں احمد اللہ کے مقدمے نے وہابی اثر کے اسی اہم مرکز کی کارستانیوں کی طرف حکام کی توجہ مبذول کی۔ اس وقت بھی امیر الدین کی کاروائیاں جاری تھیں ۱۸۶۸ء میں اس نے پٹنہ کے سردار (خلیفہ) کے بیٹے کو دعوت دی کہ آ کر اس کے علاقہ کے متبعین کے مجتمع ہوئے (دینی) جوش کا بچشم خود معاینہ فرمائیں۔ اس کا علاقہ تین ضلعوں تک پھیلا ہوا تھا جن میں پورا مالدہ اور اضلاع مرشد آباد و راجشاہی کے کچھ حصے شامل تھے۔ اس نے سرحد کو جو رنگروٹ بھیجے ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن ہنٹر اندازہ لگاتا ہے کہ سرحد پر ایک ایک وہابی چوکی پر جس میں ۴۰۰ آدمی ہوتے تھے دس فی صد سے زیادہ اس کے ماتحت علاقوں سے آئے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں یہ گندا مرکز توڑ دیا گیا اور اس کے قائدین گرفتار کر لئے گئے۔ جس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔

یہ وہابی سازشی مرکزوں میں سے ایک مرکز کے طریق کار کی بطور نمونہ مختصر داستان ہے۔ تمام ملک میں دوسرے اور مرکزی کارروائیاں کم و بیش اسی قسم کی ہوتی ہونگی۔

(۴) مال کی تحصیل

مال کی تحصیل کے لئے کئی کئی گاؤں کو ملا کر ذیلی ترصیغہ مانندری ایک صدر تحصیلدار کے تحت قائم کر دئے گئے تھے۔ ہر گاؤں کا تحصیلدار اس کے تحت ہوتا۔ زیادہ آبادی والے گاؤں میں تحصیلدار کے علاوہ ایک بڑا پیش امام ہوتا جو مسجد میں نماز پڑھاتا۔ ایک غیر مذہبی سردار ہوتا جو ایک قسم کا ٹیکس منیجر ہوتا اور ایک ڈاک سردار ہوتا جس کا کام ہوتا قاصدوں کا بندوبست کرنا جو ملک سے باہر خطوط و روپیہ پہنچانے کا خطرناک فرض انجام دیتے۔ بڑا تحصیلدار اپنے ماتحتوں کے مالانہ

عمومی لگان (۳) ایک عمومی قسم کا لگان تھا مُٹھیا۔ یعنی ایک مٹھی چاول یا کوئی اور غلہ۔ اس طریقے میں ہر گھر ایک اکائی تصور کیا جاتا اور توقع رکھی جاتی کہ ہر گھر روزمرہ کے صرف سے ایک مٹھی غلہ بیت المال کے لئے علیحدہ کر دے۔ اس طور کی بچت سے غریب طبقہ کے معاونین پر کوئی بار نہ پڑتا اور ساتھ ہی غلے کی معتدبہ مقدار بھی اکٹھا ہو جاتی۔ یہ جمع کی جاتی اور وقتاً فوقتاً صدر مقام کو بھیج دی جاتی۔ مٹھیا کا یہ طریقہ چندے جمع کرنے کا ایک معروف اور فائدہ بخش ذریعہ تھا اور بعد میں اور سیاسی انجمنوں جیسے کہ انڈین نیشنل کانگریس پارٹی میں بھی تجویز ہوا تھا۔ مسٹر میدونہ تھد ہنری نے جولائی ۱۸۹۶ء میں کلکتہ کے ایک جلسہ میں قانونی حقوق کے لئے احتجاج میں امداد اعانت کے واسطے ایک قومی فنڈ جاری کرنے کے لئے ایک ریزولیوشن (تجویز) پیش کرتے ہوئے کہا تھا "وہابی اپنا فنڈ کس طرح فراہم کرتے ہیں؟ میں وہابی معلمین کا ذکر کر رہا ہوں، وہابی باغیوں کا نہیں[1] اس لئے آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے یوں انجام دیتے ہیں کہ ہر گھر والا اپنا کھانا پکانے سے پہلے ایک مٹھی چاول رکھ لیتا ہے، اور یہ مٹھیاں ایک ہفتہ میں اکٹھی کی جاتیں اور مسجد میں لے جائی جاتی ہیں کہ وہابی مبلغ آ کر لے جائیں۔ اس طرح وہابی مشن کے چلانے کے لئے فنڈ جمع ہو جاتا ہے[2]"

عطیات: مبلغین ہر موقع پر تحریک کے لئے فیاضی سے عطیات دینے کی ضرورت اور ثواب پر زور دیا کرتے۔ بخصوص ان لوگوں سے زیادہ پر زور اپیل کی جاتی جو کسی سبب سے سرحد جا کر خود جہاد میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

ان مستقل لگانوں کے علاوہ خاص خاص وقتی مواقع پر جیسے شادیاں،

---

[1] وہابی مبلغوں اور وہابی باغیوں کے درمیان یہ امتیاز غالباً ضرورتاً قائم کیا گیا تھا ورنہ حکام باغیوں کے طریقہ کار کے اختیار کرنے میں معترض ہوتے۔

[2] پروگرام آف دی نیشنل فنڈ میٹنگ منعقدہ ۱۷ جولائی ۱۸۹۶ء کی رپورٹ مطبوعہ مسلم پریس کلکتہ

دل دتیں، تہوار، غمی، خاص عطیات دئے جاتے۔ یہ خیرات، فطرہ اور صدقات وغیرہ ہوتے بڑے نوبہ بہ
بس تحریک کے دولتمند معتقدین وقتاً فوقتاً خفیہ طور پر چندہ دان کی بڑی بڑی رقمیں بھیجدیا کرتے۔

(۵) مال کی ترسیل

یہ تو تھا طریقہ وہابیوں کے مال حاصل کرنے کا۔ اب دوسرا زیادہ دشوار کام حاصل کردہ مال کو خفیہ طور سے سرحد تک پہنچانے کا نظام قائم کرنا تھا۔ یہی کام تھا جس میں پٹنہ کے قائدین بالخصوص یحییٰ علی کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے سرحد کے راستے پر پورے طول میں وہابی مسافرخانوں یا مہمان خانوں کا سلسلہ بنا کر دیا اور ہر ایک کو کسی آزمودہ کار مرید کے سپرد کر دیا۔ ہنٹر نے اس نظام کار کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

"عظیم شمالی شارع عام مناسب حال ٹکڑوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ اور وہابی باغی ہمارے دشمن کی چھاونی کی طرف مشروف علاقوں سے اس اطمینان کامل سے گذرا کرتے تھے کہ ہر منزل کے آخر میں ان کے دوست ان کے منتظر ہیں۔ ان مسافرخانوں کے وہابی کارکن مختلف مدارج زندگی کے ہوتے اور سب برطانوی حکومت کی بربادی کے جاندادہ ہوتے اور ہر ایک باغیوں کی مقامی کمیٹی کا سردار ہوتا۔ یحییٰ علی نے ان اشخاص کے انتخاب میں اپنے گہرے نفسیاتی علم کا ثبوت دیا، کیونکہ نہ انکشاف کے خوف نے نہ انعام کے لالچ نے ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے سردار کی رسوائی کے وقت ان کے خلاف کھڑے ہونے پر آمادہ کیا۔ اور اگرچہ معلوم تھا کہ اس وقت بنیادی ہوں کے ایک سلسلہ (جیسے تھے نیورر) نے پٹنہ کو سرحد پنجاب سے ملا رکھا تھا لیکن کوئی ساشتہ گر کسی خاص مقام کی طرف انگلی سے بھی اشارہ نہیں کرتا"۔

---

۵ کلکتہ ریویو جلد ۴۰ ۱۸۶۴ء صفحہ ۱۳۶

تحریک کے خفیہ کارکن: روپے کی ترسیل کا یہ نازک اور دشوار کام خفیہ کارکنوں کا ایک گروہ انجام دیتا تھا۔ اگرچہ ضرورۃً ومصلحۃً ان کے کام چادرِ راز میں ملفوف رہتے۔ اور ان کے متعلق زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں، اس خطرناک مہم کا ایک مختصر بیان ایسے مواد سے جو دستیاب ہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

یہ کارکن نقد لیکر (جو زیادہ تر اشرفیوں کی صورت میں ہوتا) پٹنہ سے چلتے۔ مخلوط سکوں کے وزن اور حجم کو کم کرنے کے لئے ان کو اشرفیوں میں منتقل کر لیا جاتا جو صدریوں، جوتوں یا قاصد کے کسی حصّہ جسم پر ٹانک دی جاتیں سکوں کو اشرفیوں میں منتقل کرنے کے کام میں پٹنہ کے مشہور تاجر حرم امیر خاں سے بہت مدد ملتی جن کی ایجنسی کلکتہ میں تھی۔ دہلی کے کچھ ساہوکاروں کی خدمات سے بھی کام لیا جاتا۔ سید احمد کے زمانے میں روپے کے بھیج بھیجاؤ کے انتظام میں دہلی زیادہ اہم درجہ رکھتی تھی۔ دہلی میں اس کاروبار کا سب سے بڑا ایجنٹ ایک شخص اسحاق نامی تھا۔ سید احمد قائدین عظیم آباد کے نام مکتوب میں ترسیلِ زر کے لئے اسحاق کا نام ایک معتبر اور معتمد شخص کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ بعد میں پٹنہ مرکز بن گیا اور ترسیل زر تھانیسر اور راولپنڈی کے راستوں سے ہوتی تھی۔

خفیہ کارکنوں کا طریقہ عمل: یہ خفیہ عامل ملک کے پورے طول میں کبھی تنہا کبھی بھیس بدل کر اور زیادہ تر دوسرے بڑے کاروانوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں سفر کرتے۔ وہ منزل بمنزل مختلف مرکزوں میں ٹھہرتے جاتے جو یحییٰ علی کی تنظیمی قابلیت سے پورے گرینڈ ٹرنک روڈ پر قائم تھے۔ ان کے یہ سفر ایسے آمن اور محفوظ نہ تھے جیسے کہ ہنٹر کے بیان مندرجہ بالا سے مترشح ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حاملِ زر قاصد کے اختیار کردہ راستے کی خبر پہلے سے پھوٹ جاتی، پھر بھی ان کو یہ خطرہ جھیلنا ہی پڑتا۔ ہمیں ان بےخبر ذرائع اور مخلص ایجنٹوں کے دلیرانہ کارناموں کے زیادہ واقعات تو دستیاب نہیں۔ صرف سید احمد کے زمانے کے ایک ساہوکار پیر محمد کے مشن کا

ایک واقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کے خطرناک کام کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ تین ہزار روپے کی ایک ہنڈی اور ایک ہزار اشرفی نقد لیکر دہلی سے سرحد کو جا رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کو اس کا پتہ چل گیا اور جنرل ونٹیورا کو ہدایت کر دی کہ قاصد کی تاک میں رہے۔ آخر اس کا پتہ مل گیا تو تلاشی لی گئی اور اس کے جسم سے مخفی رقوم برآمد کر لی گئیں۔ پیر محمد کی سخت پٹائی ہوئی اور لاہور میں قید کر دیا گیا۔ وہابیوں کے پاس بھی اپنے ذرائع معلومات تھے، ان کو لاہور میں سید احمد کے مقامی ہمدردوں کے ذریعہ سے اس گرفتاری کی خبر مل گئی۔ آخر کار حکیم مغیث الدین سہارنپوری نے جھاڑے کے ایک مشہور جرمن فوجدار ولیم رینہارٹ کی بیوہ بیگم سمرو سے جنرل ونٹیورا کے نام ایک چٹھی لکھوائی۔ الغرض پیر محمد رہا ہو گیا اور بہت سے دو مہینے تک سے دو چار رہنے کے بعد سرحد واپس آگیا۔

امینوں کی دیانت: منتقلی زر کا ایک بڑا ذریعہ ہنڈی تھا۔ دلی اور پشاور میں کسی ساہوکار کے پاس نقد رقم جمع کر دی جاتی وہ اُس میں سے بارہ فیصد کمیشن کاٹ کر سرحد بھیج دیتا۔ شرح کمیشن بہت زیادہ تھی مگر یہ لوگ قابل اعتماد تھے اور روپے کے روک رکھنے یا ارسال میں اِدھر اُدھر ہو جانے کا کوئی واقعہ کسی تحریر میں نظر سے نہیں گذرا۔ چھوٹے رقوم کی ہنڈیوں کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ وہ زیادہ آسانی سے بھُنائی جا سکتی تھیں۔ اکثر ساہوکاروں کو ہدایت کر دی جاتی تھی کہ اُن رضاکاروں کے متوسلین (بال بچوں) کو جو ہندوستان میں پڑے ہیں دینے کے لئے کچھ رقم الگ رکھ چھوڑیں۔ ان کی خبر گیری کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ جو لوگ یہ کام کرتے تھے ان کے کردار اور ایمانداری کی یہ واضح دلیل ہے کہ جو بڑی بڑی رقمیں ان کے سپرد ہوتیں ان میں سے ایک پائی کے بھی خورد برد ہونے کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ ان لوگوں کے اخراجات سفر الگ سے دیے جاتے؛ اگر راستے میں بیماری گرفتاری یا رکاوٹ وغیرہ کے غیر متوقع سبب سے صرف

بھی ہوجاتے تو جانی محنت و مشقت سے ان کو پورا کر دیتے اور اس امانت سے جسے پہنچانا ہوتا کچھ بھی خرچ نہ کرتے۔

ترسیل زر کا طریقہ کار: جس زمانے میں احمد اللہ اس فنڈ کے خازن تھے ایک کھاتہ رکھا جاتا تھا جس میں تمام رقوم جو وقتاً فوقتاً وصول ہوتیں درج کرلی جاتیں۔ یہ کھاتا عبد الغفار کے نام سے تھا۔ الہی بخش کو جو احمد اللہ کے مقدمے میں سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ اشرفی خریدنے اور ہنڈیاں تیار کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ دونوں کام ترسیل زر کی زنجیر کی مضبوط کڑیاں تھے اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ ہنڈی مہاجنوں کے ذریعہ سے ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں پٹنہ کے رام کشن فتح چند، منوہر داس دہلی کے جگر ناتھ او ہکو مردانی، بنارس کے لال چند کرم سنگھ، سامنت رائے، اور شیو بخش اور منو رام سرحد کے سنتو اور موتی کے نام موجود ہیں۔ جو خطیر رقمیں قائدین پٹنہ نے ارسال کیں ان کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ تین سال ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۵ء تک جب کہ امبیلا کی جنگ چھڑی ہوئی تھی پٹنہ سے ایک لاکھ کی رقم صرف ایک مہاجن منوہر رام کی معرفت بھیجی گئی تھی[1] اس کی بنا پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس طویل مدت میں جب کہ یہ نظام ترسیل جاری تھا بڑی بڑی رقمیں بھیجی گئیں۔

(۶) خفیہ اور مرموز پیغامات

خفیہ پیغامات اور روپے کی رسیدوں کے لئے مرموز الفاظ و اعداد کا ایک پیچیدہ نظام بھی خود سید احمد کے زمانہ سے مستعمل تھا۔ کچھ مرموز نقش جو حیدر آباد سازش کے مقدمے میں پکڑے گئے تھے ان کا حل ابھی

---

[1] وہابی مقدمات پر بنگال گورنمنٹ کی دستاویزات کے انتخابات مرتبہ ایم اے خان صفحہ ۹۸

باقی ہے۔ عرفی نام بھی استعمال ہوتے تھے حتی الوسع کاتبوں کے نام اور پتے براہ راست استعمال سے اجتناب کیا جاتا۔ خفیہ مطالب کے ظاہر کرنے کے لئے ادبی اور مذہبی استعارات و تلمیحات کا استعمال کیا جاتا۔ پٹنہ کے قائدین نے اپنے محصولہ فنڈ کے ارسال کے لئے مرموز علامات اور فرضی ناموں کا ایک نہایت باقاعدہ اور کارآمد نظام تیار کر لیا تھا۔ محصلہ رقوم کی ترسیل میں بہت زیادہ اسی پر انحصار رکھتے تھے۔

وہابیوں کے متعلق جمیس ابوٹ کی رپورٹ: کئی مواقع پر حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کی جا چکی تھی کہ ہندوستان میں باغیانہ مراسلات کا ایک جال اور سرحد کی نوآبادی کو آدمی اور روپے کی فراہمی کا سلسلہ موجود ہے، جس کا صدر مرکز پٹنہ ہے۔

جیمس ابوٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے ۱۸۴۹ء ہی میں پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کی تھی کہ ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کا ایک عجیب جتھا یہاں آباد ہو گیا ہے۔ یہ اپنے اسلحہ اور گذارے کا سامان اپنے ساتھ لاتا ہے اور ستھانہ میں آ جما ہے۔ یہ مقام ان سب لوگوں کا مرجع ہے۔ جو ایک کامیاب غزوہ کے دیکھنے کے منتظر ہیں۔ اس نے ان مہاجرین کے خفیہ طور پر اپنے جسموں پر اور کھوکھلے بانس کی لاٹھیوں میں خطوط اور سونا لے آنے کا ذکر بھی کیا۔ یہ بھی رپورٹ کی گئی کہ نواب وزیر محمد خاں والی ٹونک مرید سید احمد بھی بڑی بڑی سالانہ رقوم بھیجا کرتا ہے۔ گذشتہ دو سالوں میں ان کی تعداد ۶۰ یا ۸۰ نفر ہو گی مگر گذشتہ دو ہفتے میں بڑھ کر دو سو سے زیادہ ہو چکی ہے اور ہزاروں کی امید کی جاتی ہے۔ جیمس ابوٹ نے اپنے بعد کے خطوط میں بورڈ کی توجہ دوبارہ اس امر کی طرف منعطف کی کہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے خصوصاً راجپوتانہ اور روہیلکھنڈ سے ستھانہ میں آدمیوں کا اجتماع جاری ہے۔ وہ فقیروں اور طالب علموں کے بھیس میں اٹک کی راہ سے آتے . اور ستھانہ پہنچ کر اپنی میلی کچیلی گدڑیاں اتار پھینکتے ہیں۔ ستھانہ میں گودام بھی بن رہے ہیں جہاں گندم کا ایک بڑا ذخیرہ اونٹ پر لایا اور جمع کیا جاتا ہے۔

[illegible] ۱۸۴۹ [illegible]

جیمس ایبوٹ کی سبکدوشی: کپتان ایبٹ ہزارہ کے مضبوط ملک میں ان جوشیلے لوگوں کے اجتماع سے فکر مند تھا کیونکہ یہاں حکومت کے خلاف کارروائیوں میں سکھوں اور درانیوں نے کسی آویزش کے موقع پر یہ فساد جڑ کی طرح کام میں لائے جا سکتے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ پنجاب میں کسی نئی شورش کے موقع پر ہزارہ ہی پہلا اکھاڑا منتخب کیا جائے گا۔ جھگڑے کے عناصر متعدد ہیں یہ زمین دار حکومت سے بلند اور دور ہے اور آخری فیصلہ سے جو ملتان کے حق میں ہوا نقطۂ مماثلت کی دریافت میں کوئی دقت نہیں ہوگی، سوائے اس کے کہ ذرائع آمد و رفت کا سلسلہ قطع کر دینے کے لئے اُس نے مشورہ دیا کہ دریائے سندھ کے کنارے مسلح چوکیاں قائم کی جائیں۔ لیکن بورڈ نے کپتان ایبٹ کے اندیشہ سے اتفاق نہ کیا۔ وہ ان نمایاں علاقوں میں مناسب ذریعہ آمد و رفت کے بغیر ایسی مسلح چوکیاں قائم کرنے پر راضی نہ ہوا۔ ہزارہ میں کسی انقلاب کی کوئی وجہ اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔ "حکومت برطانیہ کے تمام دشمنوں کی ابھی ابھی پوری سرکوبی ہو چکی ہے .... ہزارہ کے لوگ ..... جیسے تلوّن مزاج اور بے وفا ہیں [illegible] ابھی کسی جہاد کا وقت نہیں آیا ہے خواہ مذہبی دیوانے کچھ ہی تقریریں کر لیں اور چند غنڈے کچھ ہی سوچیں" بہر موقع شخص کپتان ایبٹ اور بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے درمیان باتیں [illegible] کے خلاف [illegible] لہجہ کی تلخی بڑھتی رہی۔ آخر ۱۸۵۳ء میں ایبٹ کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔ بہرحال کپتان ایبٹ کی نمایاں سپاہیانہ دانائی کا اقرار کرنا قرین انصاف ہے۔ اس کا صورت حال کا تخمینہ اُس بورڈ سے کہیں زیادہ صحیح ہے جس کی آنکھیں ہزارہ کی ایسی مستقل [illegible] کے خلاف [illegible] تھیں کہ اہل ہزارہ ہمارے ہاتھوں ہمیشہ اہانت و مروت ہی پاتے رہے ہیں۔

وہابیوں کی نقل و حرکت پر نظر: ۱۸۵۳ء [illegible] اور [illegible] کو [illegible] گزشتہ [illegible] کی طرح [illegible] حکومت [illegible] کی [illegible] تبدیلی [illegible] کو [illegible] ہندوستان [illegible] سرکاری [illegible] ۲۰ اگست ۱۸۵۳ء

تیار کرنے پر اکتفا کی۔ جس میں کہا گیا کہ "مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ پٹنہ کے کچھ اشخاص
اور سوات اور ستھانہ کے مذہبی دیوانوں کے درمیان مراسلت ہوتی ہے۔ اگرچہ میں
نے مجسٹریٹ کے اندیشہ سے اتفاق نہیں کیا اس نے مناسب سمجھا کہ اشخاص
متعلقہ کے رویئے اور نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور جب کبھی میں مجسٹریٹ
کی رپورٹ کے مطابق وہابی سازشیوں کا اجتماع ہو تو حکومت کے اقتدار کو
قائم رکھنے کے لئے میں ضروری اقدامات کروں گا۔"

جنگ امبیلہ کے بعد انگریزوں کی کارروائیاں: ہندوستان سے آدمیوں اور روپئے
کی فراہمی کا یہ نظام ہی تھا جس نے سرحد پر وہابیوں کی ریاست کو اتنے عرصہ تک
برقرار رکھا۔ اس زبردست حمایت کے جاری رہے بغیر یہ نو آبادی برقرار نہ
رہ سکتی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں اس ذریعۂ امداد و مراسلہ کے اتفاقی انکشاف کے بعد
حکومت ہند نے جنگ امبیلہ کی سخت تحریک سے ہوش میں آ کر ہندوستان
کے اندر سازش کے ان مرکزوں کا پتہ لگانے اور ان کو ختم کر دینے پر اپنے تمام
وسائل وقف کر دئے۔ اس کے بعد اگرچہ سرحد پر وہابی نو آبادی زندہ رہی مگر اس کی
طاقت اور اثر باقی نہ رہا۔ جیسے ہی ہندوستان کے وہابی مراکز سے نقد رقم اور آدمیوں
کا یہ مستقل بہاؤ بند ہوا وہابی ریاست کا نوخیز پودا سرحد کی بنجر گرم چٹانوں
میں جھلس کر رہ گیا۔

کی اہم خدمات ادا کر دی، جس میں میگال کی فوج علمبردار تھی، چند مثالیں ہیں۔ اور یہ
صورت حال کی عجوبگی کی انتہا تھی۔ لارڈ لارنس کا ۱۸۵۷ء میں دہلی کی بازیابی میں ایک
زبردست ہاتھ تھا۔ اس کے سیرت نگار نے اس کی اس پالیسی کی تحسین کی ہے کہ پنجاب
کی مختلف نسلوں میں مخاصمت سے جس کا اسے علم تھا فائدہ اٹھا کر انگریزوں اور سکھوں
کے درمیان دوسری جنگ میں اس نے تیس ہزار پٹھان بھرتی کر لئے اور اس طرح مروجہ
طریق کار کو اُلٹ دیا جو غدر میں ہمارے اتنا کام آیا۔

دوپلے کی حکمت عملی: یہ فرانسیسی اور زیادہ تر دوپلے کی کارستانی تھی جس نے
پہلے پہل اس نفع بخش تخیل کو عملی شکل دی کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں
جزیرہ نمائے ہند کی تاریخ میں مختلف مقامی جنگوں میں حصہ لیکر فرانسیسی مفاد
کو طاقت پہنچانے کے لئے ہندوستانی پلٹنوں کو بھرتی کر کے فرانسیسی افواج کا ایک
حصہ بنا دیا جائے۔ لیکن یہ دوپلے کے زیادہ خوش نصیب رقیب کلایو کا کارنامہ تھا جس
نے اپنے سیاسی حریف کے شاندار تخیل سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ حقیقتاً اسے اپنے
کام کا سب سے زیادہ کارآمد آلہ بنایا اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی بنیاد
ڈال دی۔ ۱۷۵۸ء میں بہار میں اپنے پہلے ورود میں فوجی مصالح کے پیش نظر خاص کر
ضلع شاہ آباد کے باشندوں پر مشتمل جو اپنی تنومندی اور بہادری کے لئے مشہور ہیں ایک
مختصر پلٹن تیار کی۔ ان پلٹنوں کو جو وہاں سے بھرتی کی گئیں یورپی طرز پر فوجی قواعد
کرائے جاتے اور تربیت دی جاتی۔ یہ یورپی افسروں کے ایک چیدہ گروہ کے زیر
کمان تھیں جو اپنا فرض اس مہارت سے بجا لایا جو اس تخیل کے بانی کے خیال سے
افزوں تر تھا۔ سلطنت مغلیہ کا انتشار، اس کے مقامی خاندانوں میں اس کی تقسیم و
پراگندگی، طویل خانہ جنگیاں، کسی عظیم قومی مطمح نظر کی غیر موجودگی نیز ساتھ ہی اتحاد
وارتباط کا وہ خاص جذبہ جو دوش بدوش لڑنے سے پیدا ہو جاتا ہے اور جو مختلف
نسلوں اور مذہبوں کو ذات پات اور دین دھرم سے آزاد کر کے وفاداری اور دوستی
کے بندھن میں مربوط کر دیتا ہے، سب مل کر ہندوستانی پلٹنوں اور ان کے یورپی

افسروں کو ایک نہایت کارآمد اور موثر فوجی تنظیم میں منتقل کر دینے میں بہت معاون ہوئے۔ یہ تو نتیجہ تھا امتداد زمانہ اور ان کا اس حقیقت کو بہتر طور پر سمجھ لینے کا کہ انھوں نے ہی کسی حد تک انگریزوں کو ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں مدد دی تھی اور بہت سی مقامی شکایات کا جن کو مغربی احساسات نے ہوا دی کہ ہندوستانی پلٹنوں میں بے چینی نے سر اٹھایا جس کے نتیجے میں پہلے تو معمولی شورشوں اور سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور آخر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم پر ختم ہوا۔ اس نے مشرق میں سلطنت برطانیہ کے عظیم الشان ڈھانچے کو جو خود سپاہ کے خون اور پسینے سے تعمیر ہوا تھا قریب قریب تباہ کر دیا۔

وہابی قائدین کا عسکری تدبر: یہ وہابی قائدین کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ آویزشوں میں سب سے پہلے محسوس کیا کہ ہندوستانی فوج کو اس جنگ میں کلیدی مقام حاصل ہے، انگریزوں کی طاقت کا سب سے بڑا آلہ کار یہی ہے اور اگر کسی طرح اسے معطل کر دیا جائے تو آدھی جنگ جیت لی جا سکتی ہے۔ اسی احساس سے وہابی ایجنٹوں نے بار بار ہندوستانی سپاہ کے ذہن نشین کیا کہ وہ کتنی طاقت کی مالک ہے اور انگریز کہاں تک اس کے محتاج ہیں۔ وہابیوں کے ہندوستانی فوج میں گھل مل جانے کے متعلق مندرجہ ذیل بیان اور معلوم عام تحریری واقعات سے واضح ہو جائیگا کہ ان کی کاروائی پورے ہندوستان کو محیط تھی۔ ان کو خبر نہ تھی کہ دوسری بار کون سی ٹولی ان سے لڑنے کو بھیجی جانے والی ہے اس لئے ان کے ایجنٹ دریائے ستلج سے ڈھاکہ تک تمام اہم چھاؤنیوں میں تعینات تھے اور جتنی ٹولیوں کی وفاداری کو توڑنا ممکن تھا ان کے توڑنے اور ان کے اثر کو معطل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جہاں محض وعظ و تبلیغ اور حب وطن کی اپیل کارگر نہ ہوتی وہاں مالی ترغیب و تحریص کی زیادہ یقینی اگرچہ دنی تر ترکیب سے بھی کام لیا جاتا۔ ۱۸۶۵ء کی پٹنہ سازش میں ہندوستانی سپاہیوں میں کثرت سے روپے تقسیم کئے گئے تھے۔ وہابیوں نے فوج میں گھس جانے کی چال بہت قبل سے اختیار

کنور سنگھ کے سوانح سے متعلق تھی جو بہار میں ۱۸۵۷ء کی تحریک کا قائد تھا۔ اور اس سازش کو اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا گیا، کیونکہ اس میں کنور سنگھ کے ملوث ہونے کا کچھ ذکر ہے[1]۔ چونکہ اصل منظموں کی شناخت کی صحیح جانچ نہ کی گئی اسی لئے وہابیوں کا اس کے خاص منظموں میں شامل ہونے کا مسئلہ نظر انداز ہو گیا۔

بہار میں اس سازش کی بنیاد کو حکومت کی بعض سماجی اور اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی عام بے چینی میں تلاش کرنا ہوگا۔ عوام کی شکایات کی فہرست میں اراضی کی بازیافت کی کارروائیوں اور مشنریوں کی جدوجہد کو بھی داخل کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے خلاف شورش کرنے والوں نے قوم کے خوف اور مذہب سے بھی ہوشیاری سے کام لیا۔

خواجہ حسن علی کی انگریزوں کے خلاف کارروائیاں: سازش کے موٹے موٹے وقائع مختصراً ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ ہم تمام داستان کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ ۱۸۴۵ء کے اواخر میں حکومت کو رپورٹ کی گئی کہ دانا پور (پٹنہ) میں متعینہ دیسی افسروں اور سپاہیوں کی وفاداری کو متاثر کرنے اور بگاڑنے کے لئے ایک عمومی وسیع سازش موجود ہے۔ واقعات کی زنجیر[2] جو اس سازش تک پہنچتی ہے وہ فرسٹ رجمنٹ N.I. کے رجمنٹل منشی پیر بخش اور ایک دولتمند مقامی زمیندار راحت علی کی ملاقات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ زمیندار انگریزوں سے حکومت کے خلاف جدوجہد کے لئے مشہور تھا۔ یہ ملاقات ستمبر ۱۸۴۵ء میں واقع ہوئی اور پیر بخش کے بیان کے مطابق ملاقات کا مقصد راحت علی سے کچھ قرض لینا تھا۔ دونوں کے مشترک دوست نے راحت علی سے اس کی سفارش کی تھی۔ سازش کے اصل منظمین میں سے ایک سیف علی بھی وہاں موجود

[1] بہر حال بعد کی بات چیت میں پٹنہ کے مجسٹریٹ کی طرف سے حکومت بنگال کے سکریٹری کے نام نمبر ۲۰ مورخہ ۳ جنوری ۱۸۴۶ء میں اختلافی بحث کی گئی ہے۔ [2] واقعات کا یہ بیان پیر بخش کے نظریہ پر مبنی ہے جو دفعہ ۵ ۱۸۴۰ء کے تحت ۲ مارچ ۱۸۴۲ء کو سازش میں ملوث تھا۔

تھا۔ جس کا پیر بخش سے تعارف کرایا گیا۔ اس تعارف کی بنا پر سیف علی آئندہ دسمبر میں کچھ کتابیں فروخت کرنے کے بہانے سے پیر بخش سے ملا مگر اس نے سیف علی سے کوئی واسطہ رکھنے سے انکار کیا۔ (اس بیان میں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ پیر بخش سرکاری گواہ بن گیا تھا اور اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا)۔ بعد میں سیف علی نے پیر بخش کا سازش کے ایک دوسرے ہم منتظم خواجہ حسن علی[1] سے تعارف کرایا۔ پٹنہ میں خواجہ کے مکان کی بالائی منزل پر ان تینوں کی ملاقات ہوئی۔ ان کے درمیان گفتگو بڑی حقیقت کشا اور معلومات سے پُر ہے۔ خواجہ نے منشی سے اپنے تقرر کی شرائط، تنخواہ وغیرہ کے متعلق سوالات کیے۔ اس کے بعد بولا "منشی جی ہندوستان دار الحرب (وہابی نظریہ) ہوگیا۔ قید خانوں میں کیا کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں ...... بمبئی کے مجسٹریٹ نے مسلمانوں کے مکہ[2] جانے کا راستہ بند کر دیا ہے۔" اس پر منشی نے خواجہ کے ارادے دریافت کیے۔ خواجہ نے جواب دیا کہ میں ان لوگوں سے تعارف چاہتا ہوں جو فوج میں بلند مرتبہ ہیں جیسے صوبیدار اور جمعدار۔ منشی نے خواجہ کو ایسے باغیانہ منصوبوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر خواجہ نے ایک آدمی سے ایک سو روپے ایک رومال میں باندھ کر لانے کو کہا اور منشی کو دے دیا۔ اس نے اسے سیف علی کے پاس جمع کر دیا۔ اس نے منشی سے کہا کہ رجمنٹ کے سرداروں کو راضی کر کے وہ ہم سے معاہدہ کریں اور ابھی کسی سپاہی کو خبر نہ کریں۔ اس نے اسے بھی ایک سو روپے ایک کپڑے میں بندھے ہوئے دیئے۔

خواجہ حسن علی کی ہندوستانی فوجوں کو پیشکش: منشی نے پوچھا آیا دوسری رجمنٹوں سے معاہدہ کرنے کی ایسی ہی کوششیں کی گئی ہیں؟ خواجہ نے کانپور، بنارس،

---

[1] وہ کئی سال تک ریاست [illegible] میں ملازم رہا۔ [illegible] عرصہ تک کلکتہ میں ریاست کا وکیل (ایجنٹ) رہا۔ [illegible] کی حیثیت ہے کہ "وہ ایک بوڑھا آدمی ہے، بال سفید ہیں، ڈاڑھی رکھتا ہے، قد دراز ہے، نہ موٹا ہے نہ [illegible] ہے۔"

[2] اس زمانے کے قریب ایک حاجیوں کا جہاز قرنطینہ میں روک لیا گیا تھا اس سے یہ افواہ پھیلی کہ حکومت [illegible] میں مزاحم ہے۔

کے سولہ، ساٹھ، اور ایک سو ایک روپے جو دیسی افسران دیگر رکیو پیری کے پرایویٹ کی تنخواہوں کی مساوی رقوم تھیں راحت علی کے مکان میں ایک کپڑے میں بندھی ہوئی پائی گئیں،

سازش کی شکست و ریخت کے بعد کے ملبے اور اس کے بعض نمایاں ناموروں کی تاریخ مابعد بھی دلچسپ ہے۔ پیر بخش منشی سرکاری گواہ ہو گیا اور اسے معافی مل گئی۔ درگا پرشاد، پنڈت اور بھیکن جمعدار کا کورٹ مارشل ہوا۔ یہ سب مجرم قرار دیئے گئے۔ ہر ایک کو تین سال کی قید سخت اور ملازمت سے برطرفی کی سزائیں دی گئیں۔ کمانڈر انچیف کی مداخلت پر جس نے ان سزاؤں کو خفیف تصور کیا یہ سزائیں اور بڑھا دی گئیں۔ پنڈت کو موت کی، اور جمعدار کو حبس دوام کی سزا دی گئیں۔ کرشمۂ تقدیر سے کمانڈر انچیف نے پھر مداخلت کی اور پہلی سزاؤں کو قائم رکھا، چونکہ پیر بخش نے اپنے پہلے بیان میں ترمیم کر دی جس سے راحت علی سازش کی شرکت سے صاف بری ہو گیا اس لئے راحت علی بری کر دیا گیا۔ شیخ حسن علی قریب ایک سال تک روپوش رہا اور حکومت کی انتہائی کوشش پر بھی اس کا پتہ نہ مل سکا۔ آخر اکتوبر ۱۸۴۶ء میں وہ حاضر عدالت ہو گیا اور اس پر مقدمہ چلا۔ لیکن اہم گواہ استغاثہ پیر بخش نے اس کو شناخت کرنے میں وہی شخص تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے وہ حسب بیان سابق ملا تھا، حکومت اس کو بری کرنے پر مجبور ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یقین تھا کہ پیر بخش کو روپے سے خرید لیا گیا۔ مگر گورنمنٹ کچھ نہ کر سکتی تھی اور وہ پاک صاف نکل گئے۔

وہابی تحریک میں پٹنہ کی اہمیت: سیف علی تماشا گاہ سے غائب ہو گیا۔ اور جب سے اس کے بارے میں کچھ سنا نہ گیا۔ اب ہم سازش کو صحیح عینک سے جانچتے ہیں اور اس کے خاص خاص ناظموں کے سابق حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سازش کوئی علیحدہ واقعہ نہیں۔ اس کی شاخیں بہار سے باہر تک پہنچتی تھیں یہ مبنی تھی قسم قسم کے دور رس شبہات اور بے چینیوں پر جو صوبے میں

بھیجی ہوئی تھیں اور جن کو بہار میں اور باہر حکومت کے کچھ مخالف بے چینی پھیلانے والے بڑی ہوشیاری سے کام میں لائے۔

پٹنہ وہابیوں کا ایک مشہور مرکز تھا جس کی خلاف حکومت کاروائیاں مدت سے جاری تھیں۔ ٹیلر نے ۱۸۵۷ء کے فساد پر لکھتے ہوئے مقامی وہابیوں کو ان کی منضبط باقاعدہ تنظیم اور تربیت یافتہ اور بے غرضانہ رخ اور تیور سے اُن بادلوں میں شمار کیا ہے جہاں سے اُسے طوفان بلا کی توقع ہے کیا ممکن ہے کہ ایسا پلا ہوا مخالفِ حکومت طبقہ ایسی سازش سے جو ٹھیک ان کے صدر مقام میں جنم پا رہی ہو کنارہ کش رہتا؟

کمشنر پٹنہ کی رپورٹ: اس خیال کو سطحی قیاس آرائی کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اب ہم زیادہ قطعی اور ایجابی دلائل کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ واقعات کے غائر مطالعہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ سازش دو حصوں میں منقسم تھی: (۱) عام بے چینی (۲) اس کا رُخ حکومت کے خلاف شورش کی طرف پھیر دینا اور اسے فوج کے ہندوستانی سپاہیوں تک پہنچا دینا۔ اس موضوع پر اکثر مصنفین نے اس اہم پہلو کی غلط تاویل و تعبیر کی ہے۔ بہرحال معاصر حکام کی نظر کے سامنے دونوں پہلو نمایاں اور صاف تھے۔ پٹنہ کے کمشنر[1] نے لکھا کہ "مخبر جو کہا جاتا ہے کہ کلکتہ سے ستلج تک فوج کے ایک ایک ڈویژن میں بھیجے جاتے تھے قدرتاً ان کو بے چینی کے تمام اسباب کا پتہ لگانا تھا تا کہ ان کا خمیر اٹھایا جا سکتا اور ایسے لوگوں سے شناسائی پیدا کی جاتی جو اپنی سازشی افتادِ طبیعت سے بھاری طاقت کے اٹھنے اور پامال کرنے میں معین ہوتے۔ مسلمانوں کو یہ سبز باغ دکھایا جاتا کہ تخت دہلی پر دوبارہ خانوادۂ تیموری کا جلوس ہوگا اور ہندوؤں کے سامنے عیسائی بنائے جانے کا ہوا کھڑا کیا جاتا۔ راحت علی مخالفِ حکومت رجحان کا

---

[1] کمشنر پٹنہ کی چٹھی سکریٹری حکومت بنگال کے نام، نمبر ۱۰۰۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۸۴۲ء۔

وہابی تھا لیکن اُس کے بعض قریبی قرابتمندوں کے مندرجہ ذیل حالات یہاں معاون ہوں گے۔
۱۸۷۰ء میں داناپور کا ایک شخص محمد عمر ایک نمایاں وہابی سرغنہ کی حیثیت سے گرفتار کیا
گیا تھا جو حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا۔ تفتیش کے دوران میں حکومت
کو معلوم ہوا کہ وہ راحت علی کا بھانجا ہے۔ راحت علی کے پچھلے حالات اچھی طرح معلوم
تھے اس لئے محمد عمر کے قرابتمندوں کے حالات کی پوری چھان بین کی گئی اور معلوم ہوا کہ
راحت علی کے تین بہنیں تھیں۔ ان میں سے ایک کی شادی امداد علی صدر امین ترہت سے
ہوئی۔ اس کے دو بیٹے تھے: نجم الدین اور وحید الدین۔ اوّل الذکر کچھ عرصہ تک پٹنہ افیم
گودام کا سررشتہ دار رہا، بعد میں راجہ بتیا کا دیوان ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں ٹیلر نے اسے
حکومت کے خلاف مشتبہ شورش انگیز کی حیثیت سے گرفتار کر لیا۔ اس کی دوسری
بہن کے بیٹے فرزند علی وکیل عدالت دیوانی چھپرہ، منشی اسمٰعیل اور عبدالکریم اہلمد عدالت
جج پٹنہ اور عبدالوہاب تھے۔ تیسری بہن کے بیٹے کا بیٹا وہابی قائد محمد عمر تھا۔ اس کے دو
بھائی محمد یحییٰ منصف پٹنہ اور صادق عدالت جج پٹنہ کے محافظ دفتر تھے۔ ان سب پر
وہابیوں کے عملی ہمدرد ہونے کا شبہ تھا۔ الغرض راحت علی کے اعزہ [illegible] حکومت
کے مختلف عہدوں پر فائز تھے اور ان پر پہلے سے حکومت کے خلاف کارروائیوں کا شبہ
تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۸۷۰ء میں واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ ان میں سے کئی باغی تھے۔

سازش ۱۸۶۵ء کے بانی: آخر میں ہم جی بی مالیسن کی اس موضوع پر تحریر پر بھی
ایک نظر ڈال لیں۔ وہ اس سازش کو صاف صاف وہابیوں کی کارستانی [illegible]
میں بے چینی کے متفرق مقامی اسباب کی تنقیح اور پٹنہ میں وہابیوں کی کارروائیوں
کا جائزہ لیتا ہوا وہ اپنی تصنیف کے ایک دوسرے مقام پر وہابی جدوجہد اور ۱۸۶۵ء کی
سازش کے باہمی تعلق کو زیادہ صاف عیاں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "سازشیوں کا یہ
جتھا پٹنہ میں (۱۸۶۵ء میں) ایک سازش کو جنم دے رہا تھا جب کہ سپاہیوں کو نقد رقمیں
تقسیم کی جاتی تھیں، ایک کاغذ ہاتھ آیا تھا جس میں ایک سو خاص خاص خاندانوں کے نام
درج تھے۔ ان میں ایک شہر (پٹنہ) تھا جو پیغمبر اعظم سید احمد کے دو نامور خلیفوں

کے موقع پر لکھے گئے تھے۔ کریم اللہ ان کو ستھانہ کے وہابیوں تک پہنچا دیا کرتا اور
اپنے لوگوں میں ان کے پیغام پھیلا دیا کرتا۔ ان خطوط کے ترجمے اور خلاصے کا قبول
کا پتہ لگانے کے لئے پٹنہ بھیج دئے جاتے۔

ہزارہ کے سیاسی حالات: ان واقعات پر اُس وقت ہزارہ کی سرحد پر سیاسی
حالات کے پس منظر میں نظر کرنا چاہئے۔ منظر اگرچہ بظاہر ساکن اور خاموش نظر
آتا تھا مگر تھا تاریک اور خطرناک۔ یہ ضلع قبیلہ یوسف زئی کے علاقہ کی سرحد پر
واقع تھا جہاں ہیجان کا خمیر اُٹھ رہا تھا۔ سوات کا بے دخل کیا ہوا سردار مبارک شاہ
جو انگریزوں سے آزردہ تھا۔ پڑوسی علاقہ پنج تار میں مقیم تھا۔ اس کے قریب ہی
منگل تھانہ وہابیوں کا صدر مقام تھا۔ ولایت علی ۱۸۵۳ء میں وفات پا چکے تھے
اور ان کے چھوٹے اور زیادہ متہور بھائی عنایت علی وہابیوں کے قائد تھے۔ پٹنہ
کے واقعے سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں پر جب کہ وہ دوسرے علاقوں کی پیچیدگیوں
میں الجھے ہوئے تھے سخت حملوں کیلئے بے چین تھے۔ اس کی تیاری میں اُن دیگر قبیلوں
میں جو آس پاس ہی متعین تھے گھس بیٹھے اور مداخلت کی چالوں میں تیزی سے
مصروف کار تھے۔

جنگ ۱۸۵۷ء: اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت تک
۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی شورش اٹھ چکی تھی اور اس کے شعلے تیزی سے ایک چھاؤنی
سے دوسری تک پھیل رہے تھے۔ پشاور ڈویژن کی مخصوص صورت یہ تھی کہ شورش کی
عام تحریک اور وہابی تحریک کے علیحدہ علیحدہ اثرات بیک وقت یہاں کام کر رہے تھے
اور ان کا رد عمل مختلف شکلوں پر مختلف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نازک وقت میں واقعات
کا رشتہ بہت الجھ گیا تھا اور اکثر اوقات اس زمانہ کے حالات پر وہابیوں کے اثر سے
انکار کیا گیا ہے۔ لیکن واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں اثر جدا
جدا کام کر رہے تھے۔ مثلاً ۵۵ ویں دیسی پیدل فوج کے سپاہی جو کہ [illegible] کے علاقے

پر بہت برافروختہ تھے[۱]۔ اور اس سے وہابی کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ اور بہت سی پلٹنیں خصوصاً چھٹی دیسی پیدل فوج کی (جس کے دستے مردان اور نوشہرہ میں تھے) پشاور کی انہترویں دیسی فوج اور دسویں اور [illegible] رسالہ یقینی طور پر وہابیوں کے زیر اثر تھے۔ اس ڈویژن کے واقعات پر اپنی رپورٹ میں ایڈورڈز رائے زنی کرتا ہے کہ پلٹنیں اور چوسٹھویں دیسی پیدل پلٹنوں کے درمیان اور دسویں بنگالہ رسالہ اور سوات اور پنجتار کے پہاڑوں کے ہندوستانی مذہبی دیوانوں کے درمیان ایک مدت سے مراسلت جاری ہے۔ اور مردان کنٹونمنٹ میں وہابیوں کے ایجنٹ دو ہندوستانی مولوی[۲] تھے جو مولویوں کے میزبان تھے جو ادھر سے اُدھر [illegible] پھرتے تھے۔

برطانوی وقائع نویسوں کا بیان: برطانوی مہموں کے دو مشہور وقائع نویس: بیلیو اور ہنری جو سرحد بھیجے گئے تھے وہ وہابی اثر کے متعلق اپنی رائے میں زیادہ صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ضلع پشاور کا صرف ایک حصہ جہاں لوگوں نے ملک میں فتنہ پردازی کے لئے سپاہیوں کے غدر سے فائدہ اٹھایا وہ یوسف زئی کی سرحد تھا، اور یہ زیادہ تر ہندوستانی مذہبی دیوانوں کے دباؤ کی وجہ سے ہوا جن کو ہندوستان کے باغی حکمرانوں اور افراد کی طرف سے آدمی اور روپے کی امداد ملا کرتی تھی۔ پچپن ویں دیسی پیدل پلٹن نے اپنی چھاؤنی سے خارج ہونے کے بعد جو کچھ کیا اور جس کا بیان بعد میں ہوگا، اس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ سیدھے سوات

۱؎ [illegible] نے تام ہیربرٹ ایڈمنٹ (...۸) کو ایک خط لکھ کر وہابیوں کے معاملے میں اپنے تجربے کا اظہار کیا اور ان کو دعوت دی کہ ان سے ملیں۔ (خط از ایچ بی ایڈورڈز کمشنر پشاور، بنام آر منٹگمری جوڈیشل کمشنر پنجاب، مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء) ایڈورڈز اس خط کو نہایت قیمتی دستاویز بتاتا ہے کیونکہ اس سے غدر کے مسئلہ پر ایک ایجنٹ کا دوسری رپورٹ پر کامل اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔

۲؎ جب رات ان دستوں سے ہتھیار چھین لینے کے لئے پشاور سے فوج آئی تو دونوں فرار ہوگئے۔ بعد میں ایک گرفتار ہوگیا اور اسے پھانسی دی گئی۔

کی طرف چل پڑے اور وہاں سے وہابیوں کے صدر مقام منگل تھانہ چلے گئے۔

اکبر شاہ کا انتقال: بدقسمتی سے ٹھیک میرٹھ کی شورش کے دن وہابیوں کے زبردست حامی و مددگار شاہ سوات اکبر شاہ کی ناگہانی اور بے وقت وفات نے .... بیسی پانسہ انگریزوں کے موافق پلٹ دیا۔ اگر صرف سواتی اپنے مذہبی پیشوا آخوند کے تحت پچپنویں پلٹن کے سپاہیوں اور وہابیوں سے مل جاتے تو اغلباً اور قبائلی بھی مل جاتے اور انگریز زیر ہو جاتے۔ مگر ہوا یہ کہ متوقع مدد اور تعاون کے عوض پچپنویں پلٹن کے سپاہیوں کا زیادہ تر موت سے آخوند کی عداوت سے ہر طرف مخالفت سے سامنا ہوا اور اس طرح گھبرا کر بھاگ گئے کہ کچھ بے برگ و بار ویران پہاڑوں میں ٹکراتے ٹکراتے مر گئے، باقی اور دوسروں نے ستھانہ کے صدر مقام منگل تھانہ میں پناہ لی۔ ان کا مزید تذکرہ آئندہ باب میں ہوگا۔ الغرض ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر اور اس دوران میں بھی وہابی مستعدی سے سرحد پر انگریزوں کے خلاف مصروف کار رہے۔ انھوں نے علیحدہ کام کیوں کیا اور ۱۸۵۷ء-۵۹ء کی تحریک میں شامل کیوں نہ ہو گئے ان کے اسباب ایک علیحدہ موضوع ہیں جن پر علیحدہ باب میں بحث ہوگی۔

---

[1] ۱۸۷۲ء جلد ۲ صفحہ ۲۹۵، پلٹن کے سوت سے خارج کیے جانے کے بعد ان کا مارے مارے پھرنا اور مقامی لوگوں کا ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک، اس تحریک کی تاریخ میں بے شبہ ایک نہایت المناک حادثہ ہے۔

باب ۶

محاربات سرحد (۱۸۵۲ تا ۱۸۶۳)

معرکہ ۱۸۵۲ء: سرحد پر وہابی معرکوں کا پہلا سلسلہ خود سید احمد کے زیر قیادت ۱۸۲۶ء میں شروع ہوا۔ بعض تاریخی اسباب سے جن پر علیحدہ باب میں بحث کی گئی ہے، ان معرکوں میں سے اکثر سکھوں اور سرحد کے بعض غیر مسلم سرداروں کے خلاف تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سید احمد شاہ کے خطرے کی اصل جڑ انگریز سے بے خبر تھے۔ ان کے بہت سے مکتوب[1] اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت روشن تھی کہ اصل جنگ انگریز سے ہونی ہے۔

معرکوں کا دوسرا سلسلہ حکومت برطانیہ کے خلاف کچھ بعد میں شروع ہوا، اور ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۳ء تک جاری رہا۔ اس عرصے میں کئی سخت خونریز جنگیں ولایت علی، عنایت علی اور عبداللہ کی قیادت میں لڑی گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرحد پر وہابیوں کا یہ چھوٹا سا مرکز انقلابی طاقت کا مرکز تھا، جو ایک سیاسی خطرہ بن گیا اور برطانوی حکومت کے لئے ۱۸۵۲ء سے بیس سال تک سخت پریشانیوں کا باعث بنا رہا۔

ہزارہ پر انگریزوں کا قبضہ: پنجاب کے الحاق کے بعد ہزارہ کا علاقہ گلاب سنگھ سے دوسرے علاقوں سے تبادلے کے بعد انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور ۱۸۵۰ء میں جیمس ایبٹ[1] ان کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہوا۔ ایبٹ نے سب سے پہلے اس علاقے میں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کے ایک نمایاں آشیانے اور ان کی حرکات و سکنات کی طرف

۱۔ ان میں سے بعض شائع شدہ مکتوبات میں انگریزوں اور سکھوں کے خطرے کو یکساں طور پر بیان کیا گیا ہے، دوسروں میں تذکرہ تنہا تنہا ہے۔

توجہ مبذول کی جو اس کے خیال میں دکن یا مغرب میں درانیوں کی کسی شورش کی صورت میں
حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔

وادی کاغان پر انگریزوں کا قبضہ: اُس نے شمال میں وادی کاغان کے
سادات سے بالخصوص وہاں کے ضامن خاں سے جو وہابیوں کا زبردست حامی تھا،
جھگڑے بھی مول لئے۔ بظاہر سادات کے خلاف جھگڑے کا سبب ان کے بعض
گوجر اسامیوں کی ان کے مظالم کے خلاف شکایت تھی۔ مگر یہ محض ایک بہانہ تھا
کیونکہ ابوٹ تحقیقات کے دوران میں صرف سادات کے دشمنوں کی داستان پر
کان دھرتا تھا۔ اصل سبب یہ شبہہ تھا کہ سادات وہابیوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔
یہ وہابی دوسرے قبائل جیسے ڈھونڈ وغیرہ کو انگریزوں کے خلاف عام شورش برپا
کرنے کے لئے اکسا رہے تھے۔ ایک فوج جو چھ رجمنٹوں، چھ توپوں اور بہت سے
قبائلی رنگروٹوں پر مشتمل تھی سادات کے خلاف بھیجی گئی اور ان کو شکست دی گئی۔
ضامن خاں کو بے دخل کر دیا گیا اور وادی کاغان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

فوری مقصد حاصل ہو چکا تو ابوٹ اور اس کے بالادست افسروں کے درمیان
ان علاقوں میں مزید اقدامات پر مناقشہ شروع ہوا۔

حسن زئی قبائلیوں کا سرحدی چوکیوں پر قبضہ: مہم کاغان کے فوراً بعد ۱۸۵۲ء
میں انگریزوں کو کوہ سیاہ کی بھی مہم کا بندوبست کرنا پڑا، اور یہ وہابیوں کے ساتھ
پہلی مسلح آویزش کا باعث ہوئی۔ ہزارہ کا نظم و نسق ہاتھ میں لینے کے بعد انگریزوں
نے اپنے مخصوص مکمل حربہ پنجاب بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس انتظامیہ) کے مجموعی
اختیارات کے تحت، انتظامات کے متعدد محکمے قائم کئے۔ ان میں سے ایک محکمہ نمک
کی سرحد پار سے درآمد کی نگرانی کرتا تھا۔ محکمہ کے دو مقامی افسروں کا رنگ
ویپچے نے ان رستوں کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لی جن سے ممنوع نمک آتا تھا۔ ان
کو رپورٹ ملی کہ یہ ... تجارت ملک کے اس سرحدی حصہ سے گزرتی ہے جو
حسن زئی کے آزاد قبائلی رقبے کی سرحد پر واقع ہے۔ اپنی تفتیش و تلاش میں وہ

آزاد حسن زئی رقبے سے خطرناک طور پر قریب جا پہنچے۔ یہ ڈھٹائی ان کے اعلیٰ افسروں کی واضح درمتبہ مرضی کے خلاف تھی۔ انھوں نے اس کا خمیازہ بھگتا اور بعض نامعلوم قبائلیوں کے ہاتھوں جن پر حسن زئی ہونے کا شبہہ ہے مارے گئے۔ یہ قتل لالچ اور لوٹ پر محمول کیا گیا۔ حالانکہ دراصل اقتصادی مقاصد کارفرما تھے۔ حسن زئی کو گمان ہوا کہ یہ دونوں افسر ممنوع نمک کا راستہ ان کے رقبے تک وسیع کر کے ان کے نمک کی تجارت کو متاثر کریں گے۔ اس فعل کو انھوں نے اپنے وسیلہ معاش میں مداخلت اور ناجائز تصرف قرار دیا۔ پہلے انگریزوں نے امب کے سردار جہانداد خاں اور اس کے جاگیرداروں پر حسن زئی کے شریک کار ہونے کا شبہہ کیا۔ اس لئے حسن زئی سے کہا گیا کہ ان تمام حسن زئی کو جو اس کی سرزمین پر آباد ہیں یرغمال کے طور پر انگریزوں کے حوالہ کر دے۔ جہانداد خاں نے تو یہ مطالبہ مان لیا مگر اس سے حسن زئی مشتعل ہو گئے، اس پر حملہ آور ہوئے اور اس کی سرحدی چوکیاں جمبیری اور شنگالی چھین لیں۔

کوہ سیاہ کی پہلی مہم: انگریزوں نے اپنے حلیف کو اس کرتوت کے نتائج سے جو انھیں کی مرضی سے اسے انجام دینا پڑا تھا، بچانے کے لئے مداخلت کی اور اس طرح پہلی مہم کوہ سیاہ کا آغاز ہوا۔ کوہ سیاہ[1] کا سلسلہ ضلع ہزارہ کی شمالی مغربی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ شمال میں علاقہ اگرور سے اور جنوب میں تنولوں سے گھرا ہوا ہے۔ دریائے سندھ کا دامن اس کی شمالی سرحد ہے اور وہاں سے سیدھا جنوب کو مڑ جاتا ہے۔ دریائے سندھ اور پہاڑ کی درمیانی ڈھلوان پر مقیم یوسف زئی قبیلہ آباد ہے۔ حسن زئی بھی اسی کی ایک شاخ ہے۔ ابوٹ نے کہا کہ دریا کے تٹ کے انتظام کے لئے مسلسل مطالبے کئے جو قبائل میں حکومت کا وقار برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مگر گورنر جنرل باجلاس کونسل

[1] سرحد پر ہونے والی مہموں کی تاریخ میں کوہ سیاہ اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کے ڈھلوان پر آباد قبائل سے ایک کے بعد دیگرے جلد جلد کئی مہموں کی جنگیں لڑی گئیں۔

پہلے کسی ایسے اقدام سے متفق نہ تھا اس لئے نہیں کہ وہ ان مٹھی بھر آدمیوں اور ان
اور ان کے انجام کو کوئی وقعت نہ دیتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ ریوٹ کی مجوزہ پیش قدمی
ہمیں بدتر حالت میں ڈال دیگی"۔ آخر بڑے تامل و تذبذب کے بعد ورنہ کرنل
میکیسن کے اصرار سے جو اس بارے میں ایبٹ کا ہم خیال تھا، ایک فوج جو رجمنٹ
کے ایک دستے اور کچھ پولیس کی ٹولی پر مشتمل تھی (دسمبر ۱۸۵۱ء میں) تین کالموں میں
ہزارہ کے خلاف روانہ ہوئی۔ یہ کوہ سیاہ پر چڑھ گئی، حسن زئی کو منزدی اور ان کے
گاؤں کو آگ لگا دی۔

اس فوجی مہم کی جس کے بارے میں حکام پہلے متامل تھے نتیجہ پر
پر حکومت خود حیرت زدہ ہو گئی۔ اب وہی حکام کرنل میکیسن کی مدح سرائی سے
تھکتے نہ تھے۔ وہ خود بھی اس سہل فتحیابی پر متحیر تھا اور کہتا تھا کہ اس کا سہرا
جہانداد خاں کے سر ہے جس نے میرے گاڑھے وقت میں اتنی سہولت سے اور
موثر امداد کی۔ ساتھ ہی وہ شبہہ کا اظہار کرتا تھا کیا جہانداد دہرائیگا۔ وہ مستحق ہے
اور کب تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہیگا۔ میکیسن کا یہ قول غیبی اشارہ تھا کیونکہ
مہم حسن زئی سے واپس آنے کے بعد فوج ایک نئی مصیبت یعنی وہابیوں سے دوچار ہوئی۔

انگریزوں کے خلاف عنایت علی کی کوششیں: حسن زئی پر انگریزوں کے حملے سے
فائدہ اٹھا کر عنایت علی نے دوسرے قبائل میں پرچار کرکے ان کو
رغبت دلائی کہ انگریزوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے قبائلی بھائی
حسن زئی کی اعانت میں جنگ کریں۔ انھوں نے تمام سرحدی قبائل کی زیادہ
وسیع ہمدردی حاصل کرنے کا یہ غنیمت موقع تاڑا۔ یہ ان کے اپنے مقاصد کی
کامیابی کے لئے بھی نہایت قوی اور ضروری ذریعہ تھا۔ جہانداد خاں کے علاقے پر
جو رستے میں پڑتا تھا ایک بار پھر حملہ کیا گیا اور اس کی ایک چوکی کوٹلہ پر قبضہ
کر لیا گیا۔ مگر پہلے اور دوسرے موقع کی طرح اس بار بھی قبائل متحد نہ ہو سکے۔ آخر یہ کام
ہندوستانی رضاکاروں کے ایک گروہ پر چھوڑ دیا گیا جو انگریزوں کے

زیر تھیں ایک سرحدی قبیلہ کی مدافعت کے لئے بہار و بنگال کے دور دراز ملکوں سے آئے تھے۔ خود پڑوسی قبائل خاموش اور بے تعلق تماشائی بنے رہے۔ انگریزوں نے وہابیوں کو بھی حسن زئی کی امداد سے باز رہنے کی کوشش کی، مگر عنایت علی نے ان کی پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور کہہ دیا کہ "میں تو مرنے ہی کو آیا ہوں"۔ ایک بار پھر حکومت وہابیوں کے خلاف فوج بھیجنے میں متامل ہوئی۔ خود کرنل مکیسن نے اپنی ایک رپورٹ مورخہ ۷ جنوری ۱۸۵۲ء بنام مجلس منتظمہ پنجاب میں لکھا کہ "میں نے بہت تامل کیا آیا کوٹھہ کے معاملہ میں کوئی مداخلت کروں۔ صرف وہ علاقہ دیکھ کر جس کو بارہا بحفاظت مطیع کرنے کی طرف سے ہمیں اطمینان ہو جائے اور جہاں سے وہابی لشکر کو مجبور اور بے بس کر دے سکیں .... مجھے یہ ہمت ہوئی کہ ادھر اپنی ایک فوج روانہ کردوں ...."

قلعہ کوٹھہ پر انگریزوں کا قبضہ: آخر ۲ جنوری ۱۸۵۳ء کو قلعہ کوٹھہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے میجر ایبٹ کے زیر کمان ایک فوج روانہ کی گئی۔ یہ قلعہ قصبہ عشرہ میں تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑ کی نکلی ہوئی چٹان پر واقع ہے۔ برطانوی فوجیں اپنے حلیف جہانداد خاں کی فوج کے ہمراہ تین مختلف اطراف سے آگے بڑھیں۔ اسی طرح وہابی تعداد و اسلحہ میں اپنے سے قوی تر دو فوجوں کے درمیان پھنس گئے۔ جب کہ انگریزی فوج دریائے سندھ کو عبور کر کے آگے بڑھ رہی تھی جہانداد خاں کے بھرتی کئے ہوئے رنگروٹوں نے ان کی واپسی کا راستہ قطع کر دیا۔ وہابی ایک پُرجوش غیبی دستے پر ٹوٹ پڑتے ہوئے کوٹھہ سے نکل گئے اس میں ان کے ستر آدمی ضائع ہوئے جو کرم علی دانا پوری کے زیر کمان لڑتے ہوئے شہید ہو گئے البتہ عنایت علی اپنے خاص رفیق کے ساتھ ہو کر

سے صحیح وسالم نکل گئے۔ وہابیوں کا صدر مقام ستھانہ اب غیر محفوظ اور برطانوی حملہ
کی زد میں تھا، مگر انگریزوں نے صرف کوٹلہ پر دوبارہ قبضہ کر لینے پر قناعت کی اور
ستھانہ پر چڑھائی نہیں کی کیونکہ ستھانہ تمام ذخائر اور اسلحہ سے خالی ہو چکا تھا، جو
کوٹلہ منتقل کر دئے گئے تھے۔

سر جون لائل کا وہابیوں کو خراجِ تحسین: اس معرکہ سے متعلق انگریزی دستاویزات
سے ریاست ستھانہ کی کچھ نہایت اہم جزئیات ہمیں دستیاب ہوئی ہیں، ہمیں چند
زخمی وہابیوں کے بیانات بھی ملے ہیں جن کو گائیڈ کے دستوں کا اسسٹنٹ سرجن ...
.... علاج کے لئے پشاور اٹھائے گیا تھا۔

لائل ان کی وفاداری اور عزت نفس کے اعلیٰ جذبہ کی تعریف کرتا ہوا کہتا ہے
کہ اپنی زار و زبوں حالت پر بھی ہر بات سے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور اپنے
ساتھیوں کو ملوث کرنے کے خوف سے کوئی بیان دینے سے انکار کیا۔ صرف رجمنٹ
کا ایک سپاہی ان کا اعتماد حاصل کر کے ان سے کچھ باتیں دریافت کر سکا۔ ان
کے بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ وہابیوں کی تعداد چھ سو ہے اور یہ کہ پہلے ولایت علی
ان کی تمام کارروائیوں کی سربراہی کرتے تھے، مگر ایک سال ہوا ان کے انتقال
کے بعد قیادت ان کے چھوٹے بھائی عنایت علی کو تفویض ہوئی۔ سوات کے سید
اکبر کے چار بھائی ان کی جماعت کے ساتھ رہتے اور ان میں کافی اثر رکھتے تھے۔
ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تمام ملک میں پھیلے ہوئے مبلغوں کی تحصیل کردہ رقوم
تھیں[1]۔ ان کے خاص محسن نواب ٹونک ہیں جو چالیس ہزار روپے سالانہ بھیجا
کرتے تھے۔ حیدرآباد کے نواب نصیر الدولہ بھی روپے بھیجتے تھے۔ آمدنی کا ایک
اور بڑا ذریعہ ستھانہ میں دو سو بیگھہ زمین تھی جو اکبر شاہ نے دی تھی اور سب
مزروعہ تھی۔ یہ بیس آدمیوں کی اپنی زمین پیداوار تھی جو سب کی سب بیت المال

---

[1] سرحد کے راستے پر رضاکاروں کو شہروں اور گاؤں کے تجار سے گذرتے تھے،
چند دنوں سے خوراک مہیا ہوتی تھی۔

میں دی جاتی تھی۔ ان کی خوراک زیادہ تر دال روٹی تھی۔ جماعت کو پابندی
سے قواعد کرائی جاتی۔ ان کا نعرہ اللہ اکبر تھا۔ ان کے پاس اچھی نسل کے
کوئی دس گھوڑے تھے۔ جماعت میں سے نصف کے پاس قرابینیں تھیں۔ مجموعی
حیثیت سے وہ اچھی طرح مسلح نہ تھے

یہ تھا اس مختصر جاں نثار جماعت کا حال جو آزادی کے لئے لڑ رہی تھی اور
جس نے مسلسل طور پر بہت قلیل مادی وسائل کے باوجود حکومت برطانیہ کی طاقت کو چیلنج
دے رکھا تھا۔ برطانوی سے پے درپے معرکوں میں وہ فتح کا جھنڈا . . . .
تو اڑا نہ سکے۔ مگر ان کی جد وجہد کا موازنہ محض فوجی فتوحات کے نقطۂ نظر سے نہ
کرنا چاہیئے۔ ان کی عظمت کا اصل معیار آزادی کی لگن اور قربانی کا جذبہ ہے
جس نے ان کو جاں نثار بنا رکھا تھا۔

اخوند کی وہابیوں سے سرد مہری: کوٹلہ کی لڑائی کے بعد عنایت علی چملا کے
علاقہ نوگانی میں منتقل ہوگئے۔ بعد کے چند سالوں میں وہ سوات اور بنیر کے علاقوں میں
مختلف جگہوں میں پھرتے رہے۔ مہر نے اس زمانہ میں عنایت علی کی نقل وحرکت
کی متفرق روداد ان کے بیٹے عبدالمجید کے روزنامچے سے نقل کی ہیں۔ اس روز
نامچے کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ عنایت علی نے سید اکبر شاہ اور اخوند[1]
سے انگریزوں کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دینے پر اصرار کیا تھا۔ مگر آخوند

---

[1] آخوند یعنی مذہبی پیشوا۔ ان کا نام عبدالغفور تھا۔ وہ ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ایک نسبتاً غیر معروف
خاندان کے فرد تھے۔ وہ یوسف زئی اور سوات کے علاقے میں ایک مشہور اور بااثر مذہبی پیشوا تھے۔ وہ
ایک [illegible] صوفی تھے جنہوں نے زندگی بسر کی تھی۔ وہابیوں کے ساتھ ان کا رویہ مخالفانہ رہا [illegible] سے گریز [illegible]
تحریک سے [illegible] سید اکبر کا ساتھ [illegible] لیکن بعد میں ۱۸۵۸ء میں [illegible]
اور غیر متعلق [illegible] ۱۸۶۳ء میں معرکہ امبیلہ میں [illegible] سے [illegible] مزید تفصیلات
کے لئے دیکھئے ہنٹر صفحہ ۲۰۰-۲۰۲ اور [illegible] ۲۸۰، ۲۹۵

کیا۔ قصبہ نارنجی کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ یہ ڈھلوان پر تعمیر کیا ہوا تھا اور کھڑی پہاڑی پر اوپر کے حصے میں واقع تھا۔ جنگی کارروائی کا آغاز گاؤں پر گولہ باری سے ہوا۔ اس کے بعد پیدل فوج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بڑھی۔ وہابیوں کی پرزور مزاحمت کے بعد ہمارے نوجوانوں نے پہاڑ کے زیریں حصے پر قبضہ کرلیا۔ گاؤں کے بالائی حصے کا زبردست استحکام اور نیز دشمن[1] کی بہادری ان کے آگے بڑھنے میں مانع ہوگئی۔ گاؤں پر قبضہ ہوجانے کے بعد بھی اس کو آگ لگا کر تباہ کردینے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال دشمنوں کی زبردست گولہ باری سے روک گئی۔ وہابیوں کا نقصان ۵۰ زخمیوں اور ۵۰ مقتولوں پر مشتمل تھا، ان میں پچاس دیسی فوج کے سپاہی بھی شامل تھے جن کی لاشوں کو انگریزوں نے ان کے اسلحہ اور وردیوں سے شناخت کیا۔ (انگریزوں کا نقصان پانچ مقتولین اور پچیس زخمیوں پر مشتمل تھا۔)

عنایت علی کی شکست و پسپائی: مگر اس سے نارنجی کے معاملے کا خاتمہ نہیں ہوگیا نارنجی گھٹ گیا مگر اس پر قبضہ نہ ہوا۔ عنایت علی نے شکست کھائی مگر حوصلہ پست نہ ہوا۔ نارنجی کے باشندے ان کے ساتھ تھے اور انگریزوں نے جب ان کو مانگا تو ان کے حوالہ کرنے سے انکار کردیا۔ جنرل نے ساتھ ہی کمک بھیجی جن کے ساتھ دو سو آدمی تھے۔ ان کو ولی عید کے تہوار کے بعد مزید کمک کی توقع تھی۔ سوات سے بھی مدد کا وعدہ وصول ہوا۔ اس لئے ۳ اگست کو تھیوا میں ایک بڑی فوج جمع ہوگئی اور نارنجی سے ڈیڑھ میل آگے ایک مجہول راستے سے ایک دستہ بھیجا گیا کہ ایک مخفی راستے سے بڑھ کر پہاڑ پر چڑھے اور دشمن کے عقبی حصے پر حملہ کرے۔ دو چیمبر جو نہ داٹے مجاہدوں اور پہاڑی توپوں سے گاؤں پر گولہ باری ہونے لگی۔ وہابیوں کے پاس ان کے مقابلے کی توپیں نہ تھیں مگر یہ بند جگہ سے توڑے دار بندوقوں سے گولہ باریوں کا جواب دیتے رہے۔ تو گئے کی گولہ باری کے بعد حملے شروع ہوئے یہ بڑی بہادری سے

---

[1] پیجٹ ایڈیشن صفحات ۸۷-۸۹

لڑے مگر دو طرف سے قوی تر فوجوں کی حملہ آوری سے پسپا ہونا پڑا۔ عنایت علی نارنجی سے ایک محفوظ تر مقام میں پہاڑ کے اوپر چلے گئے۔

نارنجی کی تباہی: کپتان جیمز جو پولیٹیکل افسر کی حیثیت سے فوج کے ساتھ تھا گاؤں کی تباہی کا یوں ذکر کرتا ہے: "اس کے بعد تباہ کاری کا کام شروع ہوا۔ ایک گھر بھی چھوڑا نہ گیا۔ بہت سے گھروں کی دیواریں بھی ہاتھیوں سے روند ڈالی گئیں۔ پھر ایف ایس ٹیلر انجینئر کے زیر ہدایت مینارے اُڑا دیے گئے۔ اور بہت جلد گاؤں ملبوں کا انبار اور ایک کھنڈر بن گیا... تین آدمی قید کر لئے گئے۔ اور بعد میں قتل کر دئے گئے۔ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ میدان جنگ کا قتل ایک غیر معمولی فعل تھا۔ وہ باغی ہونے کے بہانے سے بھی قتل نہیں کئے جا سکتے تھے کیونکہ وہ اپنی ریاست سے تعلق رکھتے تھے جو حقیقۃً آزاد تھی۔"

احمد اللہ اور محمد حسین کی نظر بندی: نارنجی کی لڑائی سے پہلے کچھ روز وہابیوں کے لئے بڑا نازک اور دشوار دور کا زمانہ تھا۔ تازہ تحریروں میں انگریزوں کی کامیابی نے بعض قبائلیوں کی وفاداری اور ثابت قدمی کو متزلزل کر دیا۔ پنج تنسیوں نے کھلے طور سے وہابیوں کی امداد ختم کر دیا اور اس سے بڑھ کر تو یہ ہوا کہ ہندوستان سے سلسلہ امداد بھی مکمل طور پر بند ہوگئی۔ وہابیوں کے سربراہ احمد اللہ اور محمد حسین کو ان کے عزیزوں کے ساتھ کمشنر پٹنہ نے نظر بند کر دیا تھا۔ اس سے بھی روپے کی تحصیل و ترسیل کا انتظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد سے دریائے سندھ پر آمد و رفت کے گھاٹوں پر نگرانی زیادہ سخت ہوگئی تھی جس سے قاصدوں کے لئے دریا عبور کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا۔ نو منتخب خلیفہ کے خطوط جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اسی زمانہ کے قریب لکھے گئے تھے۔ ان میں [illegible] سے ڈاک بند ہونے کا ذکر ہے۔ پریشانیاں [illegible] ختم نہ ہوئی تھیں [illegible] قبائلیوں نے [illegible] شروع کر دیا اور [illegible] قتل کر دیئے۔

انگریزوں سے عنایت علی کا آخری مقابلہ: [illegible] مقامات کا [illegible] اندازہ ہوتا ہے کہ [illegible]

یہ سرسبز وشاداب منزل ۲۹ اپریل کو برباد کر دی گئی اور اس کے استحکامات منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیے گئے۔ فوج تمام رات اپنی ساختہ خندقوں میں بسر کر کے دوسرے دن سلیم خانہ لوٹ گئی۔

منگل تھانہ اور ستھانہ کی غارتگری کے درمیان مختصر سے وقفے میں ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا جس کے آغاز کا اگرچہ اس سے بہت پہلے سے پتہ ملتا ہے اس کا براہ راست تعلق ستھانہ کی تباہ کاری سے تھا اور اس میں بہت سہولت بہم پہنچا دی۔

ستھانہ: دریائے سندھ کے دائیں جانب کی سرزمین اور یوسف زئی کی حدود اور انگریزی سرحدی چوکی کے درمیان دریا کے کنارے اور کوہ مہابن کی چھاؤں میں زمین کی پٹی رکھتی ہے۔ برطانوی ہند کی حدود سے باہر یہ زمین عثمان زئی قبائل کی ملکیت تھی۔ [illegible] گاؤں اور بستیوں کے علاوہ، بالائی اور زیریں کیاہ اور خدائی اور بالائی و زیریں ستھانہ [illegible] بھی شامل تھے۔ ایک مدت دراز سے ستھانہ بطور آلتمغہ جنیر میں تخت بند کے سید [illegible] کو عطا ہوا تھا۔ یہ ایک محترم تارک الدنیا بزرگ تھے اور کسی جھگڑے میں ان کو پٹنے کی [illegible] سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ان کے پوتوں عمر شاہ اور اکبر نے شروع سے وہابی تحریک میں [illegible] تھا اور اکبر سید احمد کے خازن کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انھیں نے [illegible] میں دعوت دی اور ان کو وہاں بسا دیا تھا۔ وہ ۱۸۴۶-۴۷ء میں زیریں ہزارہ میں سکھوں کے خلاف بغاوت میں قائد منتخب ہوئے تھے۔ جس کا اوپر ذکر ہو چکا۔ جب ہزارہ انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا وہ سوات لوٹ آئے اور وہاں بادشاہ منتخب ہو گئے۔ [illegible] عمر شاہ ستھانہ کے سردار تھے۔ انھوں نے اور اکبر شاہ دونوں نے [illegible] گاؤں سے اپنی سیاسی بالادستی کی حیثیت سے، اور وہاں وہابی مرکز کا خرچ چلانے کے لئے بھی کچھ عشر وصول کیا تھا۔ عثمان زئی نے اس لگان پر غدر کیا مگر اس کی مخالفت کے لئے اپنے آپ میں طاقت نہ پائی، بالخصوص [illegible] دونوں گاؤں کے مقامی لوگوں نے ان سیدوں کی حمایت کی۔ اب کاٹن کی اس مہم کے موقع پر انھوں نے ان سیدوں کو کاٹن کی فوج کے ذریعے سے نکال باہر کرنے کا عمدہ موقع تصور کیا۔ کمشنر پشاور [illegible] سرحدی قبائل سے بذریعہ معاہدہ لینا چاہتا تھا کہ سیدوں یا دوسرے ہندوستانیوں کو پناہ نہ دیں [illegible]

نے ۲۳ اپریل ۱۸۵۸ء کو ستھانہ پر حملہ کر دیا اور جنگ میں عمر شاہ قتل ہو گیا۔ اس طرح ابتدائیا
برطانوی فتح کا راستہ کھل گیا کیونکہ قائد مدافعت عمر شاہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ مستقل تھانہ
تباہ کر دیا گیا اس لئے کہ قبائلی اپنے ہی سردار مقرب خان کے خلاف ہو گئے تھے۔ اب تھانہ
کی تباہی کی نوبت تھی۔ بس ٹھیک حملہ کے وقت عثمان زئی نے مدافعت کا دم باقی نہ
چھوڑا تھا۔ انگریزوں کے لئے یہ حسن اتفاق مبارک لیکن قبائلیوں کی ذہنیت پر نفریں!

معرکہ ستھانہ: ۴ مئی ۱۸۵۸ء کو کاٹن کے زیر کمان انگریزی فوج ستھانہ کے خلاف بڑھی۔
انگریز سندھ کو عبور کر کے دکھن سے بڑھے۔ ادھر امب کے جہاندار خاں کے رنگروٹوں نے
نے شمالی پہاڑیوں پر پڑاؤ کیا۔ ور نقال کے مصنف کے بیان کے مطابق مقامی قبائلیوں نے ستھانہ
پر انگریزوں کی چڑھائی کی خبر مبارک شاہ کو دے دی تھی اور اول الذکر اپنے آپ کو مدافعت
کے قابل نہ دیکھ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ ستھانہ سے پنتیس[۳۵] میل اوپر کوہ مہابن کے
کے شمالی ڈھلوان پر ملکہ میں لوٹ گیا۔ صرف وہابیوں کی چالیس آدمیوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی
اور کچھ جادون قبائلی ستھانہ میں رہ گئے۔ انھوں نے ستھانہ سے کچھ دور آگے ایک
پہاڑی شاہ نور کی لڑی پر پڑاؤ کیا اور انگریزوں کی آمد کا انتظار کیا۔ ان کا سردار اتحاد
ثلاثہ کا ایک رکن کرامت شاہ تھا۔ نتیجہ معلوم تھا، مگر وہابیوں کی مختصر ٹولی نے بڑی بہادری دکھائی۔

وہابیوں کی سرفروشی: ایک سرحدی قبائل کے خلاف برطانوی معرکوں کی مستند تحریروں
سے وہابی غازیوں نے شدید موانع کے مقابلے میں اپنے سے بہت بڑی فوج سے لڑنے
میں جس صبر و سکون اور استقامت کا ثبوت دیا، اس کی کیفیت یوں نقل کرتا ہے:۔

"ہندوستانیوں کی لڑائی کی نمایاں خصوصیت ان کی مذہبی سرشاری تھی۔ وہ دیر کی دوری
سے بڑھتے چلے آتے تھے .... کامل خاموشی سے، کسی قسم کے نعرہ یا آواز کے
بغیر سب کے سب اس موقع کے لئے اپنے بہترین لباس میں ملبوس تھے۔ زیادہ تر سفید لباس میں، البتہ
بعض مرد مخمل کی قبائیں پہنے تھے۔"

ایک اور مصنف وہابیوں کی جانبازانہ مدافعت کا مستحسن کرتا ہے جو پٹھانوں کی جنگی
تدبیر اوصاف سے نمایاں متمیز رکھتی ہے۔ پٹھان جب موقع پاتے چپکے سے میدان جنگ

اُس نے سنگریو کے بارے کام میں پھر ہند پولیس میں ملازمت کی۔ اس کو یہ نوکری انگریزوں
کے حلیف جہانداد خان کی سفارش سے ملی جو اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ یہ ملازمت دینے میں انگریزوں
کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا کیونکہ توقع کی جاتی تھی کہ اس مصروفیت سے وہ سرحد سے دور رہیگا
اور وہاں امن و قانون میں خلل اندازی سے الگ رہیگا۔ غدر کے دوران میں وہ دہلی اور لکھنؤ تعینات
کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا رسالہ برخاست ہوگیا۔ اس کو سرحد کی فوج میں کیویلری (رسالہ) افسر کی
حیثیت سے جگہ یہ عہدہ نہ ملا[1] اس لئے اس نے حکومت سے درخواست کی کہ ستھانہ اس کو
واپس دے دیا جائے۔

محمود شاہ کی ستھانہ میں آمد: لفٹنٹ گورنر نے اسکی درخواست اس عذر سے نامنظور کردی کہ ستھانہ
برطانوی ہند سے باہر ہے اور جو چیز حکومت کی ملکیت ہی نہیں وہ اسے نہیں دی جا سکتی۔ تب
اس شاہزادے نے اپریل ۱۸۶۳ء میں درخواست کی کہ اسے اجازت دی جائے کہ انگریزوں کی
مدد کے بغیر ستھانہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ بھی اس عجیب جواب کے ساتھ
رد کردیا گیا کہ "اس سے کہہ دو کہ اس قسم کی بات سنی نہ جائیگی"۔ محمود شاہ کے ساتھ انگریزوں کا رویہ
نہایت مبہم و خشم انگیز تھا۔ وہ نہ اس کو اس کی آبائی جائداد واپس دینے پر راضی تھے نہ اس کو اپنے طور
پر قبضہ کرنے دیتے تھے۔ عاجز آ کر وہ اپنے آدمیوں کو ساتھ لیکر ستھانہ جا پہنچا۔ وہ اس وقت وہاں
پہنچا جب کہ مبارک شاہ اپنی متذکرہ بالا کارروائیوں میں مصروف تھا۔ اس لئے معتدل پالیسی
اختیار کی اور تھوڑے دنوں کے بعد ستھانہ کی بازیافت کی جدوجہد کرنے لگا۔ بہرحال انگریزوں
کی نامنظوری نے اسے پیچ و خم اور دھوکے سے کام لینے پر مجبور کیا تو ان معاملات میں زیادہ عملی پالیسی
چلا رہا تھا۔

وہابیوں کے خلاف افواہیں: عثمان زئیوں میں بھی دو گروہ تھے۔ ایک سیدوں کی مراجعت
کے حق میں تھا اور دوسرا انگریزوں کی مدد سے ان کی مخالفت کرتا تھا۔ سیدوں نے ستھانہ پر قبضہ
کرلیا تو دوسرا گروہ جنگ کے مقابل تربیلا کی انگریزی چوکی پر جا کر انگریزوں سے

---

[1] یہ نامنظوری انگریزوں کے تحت نوکری نہ کرنے کی جذباتی بنا پر تھی۔

کی کوشش میں اتنا کچھ داؤں پر لگا دیا۔

مبارک شاہ کے ستھانہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی جدوجہد پہلے ۱۸۶۱ء میں شروع ہو چکی تھی اور واقعات متذکرہ بالا ۱۸۶۱ تا ۶۷ء میں رونما ہوئے۔ جولائی ۱۸۶۳ء میں سیدوں نے خادون اور عثمان زئی کی کسی مخالفت کے بغیر ستھانہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اس کے بعد سرحد پر حملے شروع ہو گئے قبل اس کے کہ ٹوپی پر جہاں متوقع پیش قدمی کے لئے سپاہ و ذخیرے جمع کئے جا رہے تھے باقاعدہ لڑائیاں شروع ہوں ۱۸۶۳ء میں اس پر حملہ کر دیا گیا۔

وہابیوں کے فوجی دستے: اس وقت سرحد پر وہابی فوج کی مدد کی طاقت اور ساخت کا ایک مفصل حال[5] ہمارے پاس موجود ہے۔ ان کی تعداد بارہ سے چودہ سو تک تھی زیادہ تر بنگال[6]، اودھ، صوبہ جات وسطی و شرقی (صوبہ متوسط، یوپی) اور زیریں پنجاب کے رنگروٹوں پر مشتمل تھی۔ انھوں نے فوجی تنظیم اختیار کر لی تھی اور روزانہ قواعد (ڈرل) کرتے تھے۔ وہ سب ہتھیاروں سے اچھی طرح مسلح تھے جن میں دو چھوٹی توپیں بھی تھیں۔ مرکز ملکہ میں ان کا ایک دستکاری کارخانہ اور ایک بارود بنانے کے کارخانے موجود تھے۔ پوری فوج دس کمپنیوں پر منقسم تھی اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ افسر ہوتا تھا۔ اس طرح:-

جماعت	سپاہی	گز والی بندوقیں	چقماتی بندوقیں
(۱) جماعت میاں عثمان	۱۲۰	۳۰	۱۰
(۲) جماعت شریعت اللہ	۱۵۰	۳۰	۰
(۳) جماعت قائم خاں	۱۳۰	۳۰	۲۰
(۴) جماعت قاسم خاں	۳۰	-	۲۰

یہ سب سے پرانی جماعت تھی جو ہندی جماعت کہلاتی تھی اور خالصتہ ہندوستانیوں پر مشتمل تھی۔

جماعت	سپاہی	گز والی بندوقیں	چقماتی بندوقیں
(۵) جماعت نجف خاں	۱۳	۱۵	۲۰
(۶) جماعت نعیم الدین	۲۵ (نیز دو توپیں)	۴	۳۰

---

[5] [illegible]

[6] [illegible]

ساتواں باب

وہابی ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریکیں

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد کی صدی میں ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی تدریجی توسیع اور استحکام پیدا ہو گیا۔ ساتھ ہی سازشوں، شورشوں اور عموماً مختلف کیفیت اور کمیت کی انگریزوں کے خلاف تحریکوں نے سر اُٹھایا۔ ان تحریکوں میں ۱۸۵۷ء کی تحریک اور وہابی تحریک سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان میں جہاں اول الذکر تاریخ وقوع کے فوراً بعد ہی سے بعض مستند و وسیع النظر مطالعہ کا موضوع رہی ہے، اور فی الحال بھی ان میں بعض بیش بہا تحریروں کا اضافہ ہوتا ہے، وہاں آخر الذکر پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔

۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک سے بعض مستند مورخین نے وہابی تحریک کے صرف اُس پہلو پر جس کا تعلق ۱۸۵۷ء کی تحریک سے ہے بہت مختصر اور سرسری نگاہ ڈال لی ہے۔ مگر ان کے آموختہ نگارشوں میں ایک اہم اور نمایاں نقص یہ ہے کہ بیان اصلی سیاق و سباق سے جدا ہوتا ہے۔ یعنی وہابیوں کی بنا اور احوال یعنی ان کی تحریک کے اغراض و مقاصد، ان کی تنظیم، ان کے پیشوا و قائدین اور ازیں قبیل دوسرے نکات بالکل نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف وہابیوں کی انتہائی کارروائیوں کے مغز و مقصد کی توضیح صحیح طور پر نہیں کی گئی۔ جب ۱۸۵۷ء کی عظیم آویزش شروع ہوئی تو اس سے تیس سال پہلے سے ہی وہابی اپنی تحریک چلا رہے تھے۔ مگر اس حقیقت پر کسی نے صحیح طور پر زور نہیں دیا۔ نتیجہ یہ

ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کی تمام رنگوں میں وہابی ناقابل فہم و بے جوڑ سے عنصر دکھائی دیتے ہیں؟ وہ کس جماعت کی نمائندگی کرتے تھے؟ وہ اس زور شور سے انگریزوں کے خلاف سرحد کے علاقہ میں کیوں لڑتے رہے؟ پھر اس کے برخلاف بہار میں جو بہت پہلے سے تحریک کا مرکز تھا وہ دوسری طرح کی کارروائیوں میں کیوں مصروف رہے؟ بے رحمانہ اور کامل سرکوبی کے بعد بھی اتنے عرصے تک ایک اہم سیاسی عنصر کی حیثیت سے کس طرح باقی رہ گئے؟ یہ اور ایسے ہی متعلقہ سوالات بغیر جواب چھوڑ دیئے گئے۔ شاید بعض مورخ اس فروگذاشت کو محسوس کرتے تھے، مثلاً مالیسن نے وہابی کے موضوع پر ایک مختصر تتمہ کا اضافہ کرکے اسی کی جزوی تکمیل کی کوشش کی ہے[1] مگر ظاہر ہے کہ وہابی تحریک جیسے موضوع پر بحث کرنے کے لئے محض تتمہ کوئی صحیح مقام نہیں۔

اگرچہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کی کیفیت و کمیت کا مفصل تجزیہ تالیف ہذا کے دائرہ تحریر سے باہر ہے، دونوں تحریکوں کے درمیان مناسبت و تقابل کے کچھ نکات ذیل میں دیئے جاتے ہیں تاکہ جو سوالات اوپر اٹھائے گئے ہیں ان کا حل اور اس تحریک کے ساتھ وہابی تحریک کے تعلق کا ادراک کیا جا سکے۔

تحریک ۱۸۵۷ء اور وہابی تحریک کا موازنہ: ایک منتشر قوت جنگ کی حیثیت سے ۱۸۵۷ء کی تحریک ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے لئے ایک نہایت زبردست چیلنج تھی۔ تاہم یہ ایک زمانہ دراز کی مختلف النوع بے چینیوں کا نتیجہ تھی مگر بظاہر اس کا ظہور ناگہانی شعلہ کی طرح ہوا، تند و تیز، سیماب پا، اور آگ اور خون کی ایک لکیر پر ختم ہو جانے والا۔ یہ تحریک مثل افق پر شہاب ثاقب کی چمک اور رفتار سے اٹھی اور اڑ گئی۔ دوسری طرف وہابی تحریک ایک دیرپا شورش تھی جو آدھی صدی سے زیادہ قائم رہی اور اپنی مدت حیات میں شدت و نوعیت کے متنوع و مختلف مدارج سے گذری۔ یہ اس کا بھی انگریزوں کے خلاف جہاد جنگ سے شروع ہوا مگر وہ ۱۸۵۷ء کی ناگہانی شورش کے خلاف سیاسی جدوجہد کے ایک نہایت منظم و وسیع و طویل الذیل جال پر مبنی تھی۔

تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے اسباب: ایک بہت بڑی فروگذاشت جس سے ۱۸۵۷ء کی تحریک نے نقصان اٹھایا اور جو فی الحقیقت اس کے ناکام انجام کا ایک سبب ہوئی وہ ایک متحدہ مقصد و متفقہ دستور العمل کا فقدان تھا۔ سارا شمالی ہند جدا جدا گروہوں میں بٹا ہوا

---

[1] مالیسن جلد ۵، ۹۲-۵۴۷

تھا۔ ہر ایک اپنے اپنے سردار کے تحت تھا۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ان تمام مقامات میں برطانویوں کے خلاف ایک مشترک مقصد کام کر رہا تھا اور ان سرداروں کے درمیان کبھی نہ کبھی کسی قسم کا باہمی ربط ضرور رہتا تھا لیکن من حیث المجموع یہ بھی حقیقت ہے کہ آویزشیں کثیر چھوٹے چھوٹے اور جداجدا محاذوں پر لڑی ہوئی تھیں۔ مختلف جدوجہد کو ملانے والی کوئی مرکزی تنظیم نہ تھی۔ اس کے برخلاف وہابی تحریک کی ایک نہایت باقاعدہ اور مؤثر یا اندرونی تنظیم تھی۔ سماجی یا دینی اور فوجی دونوں امور کے دونوں فرائض دو علیحدہ علیحدہ بازو سمجھے جاتے تھے گو خلیفہ صدر دو مرکزی فرمانروا ہوتا تھا۔ جماعت کا ایک بازو تحریک کے ملکی مذہبی پہلو کی نگرانی کرتا۔ تمام ملک میں عبادات جلسے نئے رنگروٹ بھرتی کرنا اور ان کی تربیت، خیراتی اور تعلیمی کام اور جماعت کے آشیانوں کی نگرانی کا نظام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ دوسرا بازو سیاسی فوجی معاملات سرانجام دیتا۔ جیسے سرحد کو بھیجنے کے لئے آدمی اور سازوسامان مہیا کرنا، انگریزوں کے خلاف تبلیغی لٹریچر کی اشاعت اور انگریزی فوج میں اپنے آدمیوں کو گھسانا۔

وہابی تحریک کا عقیدۂ ہجرت: وہابی تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے آغاز ہی سے شدت سے عقیدہ ہجرت[1] کے زیر اثر رہی جس کا تقاضا یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف ملک کے باہر سے ایک قسم کی دینی حکومت کے ذریعے سے جو برطانوی ہند سے باہر کے علاقے میں قائم ہو۔ اس لئے اس تحریک نے برطانوی ہند کے علاقے سے ہجرت کرنے اور ایک علیحدہ آزاد ریاست قائم کرنے پر بہت زور دیا۔ تاکہ جنگ یوں لڑی جائے جیسے دو جداجدا آزاد حکومتوں میں لڑی جاتی ہے۔ چنانچہ وہابی انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کے دوران ایک مخصوص قطعہ زمین کے مالک تھے، اور ایک فوج رکھتے تھے جو اس کی مدافعت کرے، اور اپنے نظریات پر مبنی ایک دستوری سیاسی کا خاکہ بھی رکھتے تھے۔

دوسری طرف ۱۸۵۷ کی تحریک انگریزوں کو بزور شمشیر ملک بدر کرنے کی کوشش ملک کے اندر سے تھی بے شبہ اس شورش کو عام ملکی (غیر فوجی) سہارا حاصل تھا جس کی پشت

---

[1] وہابیوں نے قریب قریب تمام رسالوں میں مسئلہ ہجرت کی ضرورت اور فضیلت پر زور دیئے ہیں

"اگرچہ میرا خیال ہے کہ مخالفِ مسیحی لیگ کے چلانے میں...... تمام فرقے اس وقت اپنے فرقہ وارانہ تفرقوں کو محو کر دیں گے اور نصاریٰ کے مقابلے میں متحد ہو جائیں گے، مگر دو خاص حلقے ایسے ہیں جن سے پٹنہ میں خطرے کا اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اودھ کے الحاق کے بعد سے لکھنؤ کی پارٹی کے طرفداروں کی طرف سے، دوسرے وہابیوں کے متشدد اور کثیر التعداد فرقے کی طرف سے۔ ان کے علاوہ ایک بڑا خطرہ شورش پھوٹ پڑنے پر عوام الناس کی برافروختگی سے بھی متوقع ہے۔"

پیر علی کی خدمات: ٹیلر کے ان خدشات کی تائید مزید جولائی ۱۸۵۷ء کو پٹنہ کی اُس مختصر اور شاندار شورش کی بنا سے بھی ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات سے ابھی ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں، صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ حکومت کی بعض پالیسیوں کے سبب سے تمام بہار اور بالخصوص پٹنہ میں عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی جسے ٹیلر "غداری کا گندہ حوض" کہتا ہے۔ کئی جتھے حکومت کے خلاف کام کر رہے تھے۔ لکھنؤ کے جتھے کا بڑا کارگزار پیر علی تھا جو ماہ جولائی کی شورش کا ہیرو تھا اور پٹنہ کے نقاد کوٹ گشت کے دروغہ مہدی علی کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ دوسرے ضلع پٹنہ کا ایک دولتمند زمیندار علی کریم[1] تھا [illegible] اور دراج [illegible] مظفر پور کے جمعدار وارث علی کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ یہ دہلی کے جتھے کے نمائندے تھے۔ پھر تیسرے وہابی تھے جو زیادہ عرصے سے حکومت کے خلاف کام کر رہے تھے مگر ان کی کارروائیاں زیادہ تر ان کی اصل جدوجہد کے مرکز یعنی سرحد پر آزاد ریاست کے استحکام و ترقی کے لئے مخصوص تھیں۔ پیر علی کا بڑا مقصد اپنے ساتھی مسیح الزماں لکھنؤی کی ہدایت کے مطابق ان علیحدہ علیحدہ جتھوں کی کارروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور بے چینی کے نسبتہً منتشر احساسات کو حکومت کے خلاف ایک زبردست متحدہ طاقت میں منتقل کرنا تھا۔ پیر علی کے نام مسیح الزماں کے بہت سے خطوط

---

[1] علی کریم کی زندگی اور کارناموں کے مفصل بیان کے لئے دیکھئے [illegible] کا انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن جلد ۳۳ ۱۹۵۸ء صفحہ ۹-۱۵۔

طرح برقرار رہا اور کام کرتا رہا، اور ۱۸۶۳ء کے غزوۂ امبیلہ میں جب کہ وہابیوں نے سب سے شدید جنگ کی بیش بہا خدمات انجام دیں اگر وہابی بہار میں ۱۸۵۷ء میں وہ نہ کرتے جو کیے تو ۱۸۶۳ء کا معرکۂ امبیلہ وقوع پذیر نہ ہوتا۔

مگر اس طرح پٹنہ مرکز کو زندگی کا جو نیا پٹا ملا وہ بہت مختصر تھا۔ سچ یہ ہے کہ تمام بیرونی سہارے کے لئے وہابیوں کا ہندوستان کے مرکزوں پر کامل انحصار ہی تحریک کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں کی حکمت عملی: ۱۸۵۷ء کی تحریک سے [illegible] حق ڈاکٹر ایس این سین اور ڈاکٹر آر سی مجومدار نے یہ معنی خیز نکتہ پیش کیا ہے کہ وہابیوں نے من حیث الجماعت اس "بغاوت" کا ساتھ نہیں دیا۔ اگرچہ وہابیوں سے [illegible] یہ صحیح ہے (جس نے اپنے بعض سیاسی پالیسی کی بنا پر ایسا کیا جس پر اوپر بحث ہو چکی) مگر ان دونوں مورخین نے یہ عمومی اظہار رائے کیا ہے جو تمام وہابی مرکزوں پر منطبق ہوتا ہے۔ [illegible] خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر سرحد اور پنجاب میں بغاوت کے سرغنہ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو لارنس کے لئے پنجاب کو پوربی سپاہ سے خالی کرنا مشکل ہو جاتا۔ ۱۸۵۸-۵۹ء [illegible] عنایت علی کی متذکرہ بالا کارروائیوں سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ [illegible] ۱۰۱ [illegible] کے سپاہیوں سے مل گئے تھے جو بھاگ کر سرحد پار چلے گئے تھے۔ ان کو پناہ دی [illegible] بدولت سرحد میں کتنی لڑائیاں لڑے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ۱۸۵۷-۵۹ء کے نازک دور میں وہابی انگریزوں سے بالکل نہیں لڑے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس تحریک کے سرغنہ [illegible] نہیں ملے مگر عنایت علی کے زیر کمان ان کی سرحدی جماعت اس زمانے میں انگریزوں سے برابر لڑائی کی ہے۔ مگر جہاں انگریزوں نے اپنے افضل اور بہتر منظم وسائل سے تمام شمالی ہند میں بغاوت کے منتشر مرکزوں کے چیلنج کا مقابلہ کیا وہاں ایک وہ پریشانی کا بھی [illegible] انگریزوں کو اپنے ہندوستانی غنیم پر وہ مادی اور فنی برتری حاصل تھی کہ وہابیوں کی [illegible] سے اسے کوئی مادی ضرر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ڈاکٹر سین کا متذکرہ خیال اس معنی میں [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ اس نازک وقت میں اگر پورا پنجاب انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا [illegible]

الزام عائد ہی نہیں کیا گیا عجیب بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شروع میں اعلیٰ حکام نے وہابیوں کی کارروائیوں کے متعلق اطمینان کا عجب اغماض کا رویہ رکھا۔ واقعات کی سنگینی اور ان کے متعلق نیز غزوہ امبیلہ میں انگریزی فوج کی زبردست پٹائی نے بعد میں ان اعلیٰ مرتبت حکام کی آنکھیں خطرے کی واقعی حد و غایت اور شدت کی طرف سے کھول دیں۔

وہابی تحریک کے متعلق ایک غلط خیال: ایک غلط خیال عام طور پر پھیلا کر دیا گیا ہے کہ وہابی بہت تھوڑی تعداد خصوصاً بہار میں من حیث الجماعۃ ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک سے الگ رہے تو یہ تحریک کے مخالف انگریز اصول کے خلاف ہوگا۔ یہ عجیب مگر دوہرے منطقی مغالطے پر مبنی ہے۔ اولاً یہ فرض کر لینا پڑتا ہے کہ بہار کے وہابی پوری جماعت سے مختلف رہے تھے، یہ کہ پوری تحریک کا طرز عمل صرف ۱۸۵۷-۵۹ء میں ان کے رویہ کی بنا پر جانچا جانا چاہئے، ثانیاً یہ کہ انگریزوں کے خلاف کشمکش میں انھوں نے کوئی حصہ لیا ہی نہیں۔ یہ دونوں مفروضے قطعیہ صریحاً بالکل غلط ہیں۔ دوسرے تمام صوبوں کی طرح بہار کے وہابی بھی ایک وسیع تحریک کے جزو لازمی تھے، اور وہ سب کے سب ایک مرکزی نقشے کے مطابق کام کر رہے تھے، یہ ایک ہی قسم کے لوگ اخوت کے سخت بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ ادھر سرحد اور دوسری جگہوں میں کام کر رہے تھے بلکہ ایک ہی اشخاص، مثلاً برادران علی، یحییٰ علی، فیاض علی وغیرہ باری باری دونوں جگہوں میں کام کرتے رہے۔ انگریزوں کے حق میں بہار کے وہابی سرحد کے وہابیوں سے زیادہ نرم نہ تھے۔ دونوں گروہوں نے اپنے اپنے مرکزوں میں حالات کے مطابق جنگ جاری رکھی یا پالیسی کی بعض بنیادی اصول کی بنا پر بہار میں سرحد کی سی کھلی جنگ تو ممکن نہ تھی لیکن زیادہ زبردست مادی وسائل، شاندار نہ سہی مگر دلیر افراد اور قوت کی فراہمی بے روک جاری رہی۔

ہم میں سے اکثر شخص کسی بم انداز طیارہ ران کے کارناموں کو تعجب کی نظر سے دیکھتے ہیں جو کسی بم اندازی ڈیوٹی پر دشمن کی سرزمین پر حیرت انگیز پرواز کرتے رہے ان کے فخر میں آخر ہم بھی شریک ہوتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو زمینی فوج کے ان ذیلی دستوں کی محنت و مشقت کی طرف کوئی دھیان دیتے ہوں جن کی خاموش مگر غیر دلچسپ کارگزاریوں کے بغیر

ایسی پرواز ممکن نہیں؟ اگر زمینی مرکز پٹنہ کے کاموں میں کسی قسم کی کمزوری یا کام میں غفلت برتتے تو کام کا بالکل ٹھپ ہو جانا تو الگ رہا طیارہ زمین سے اٹھ کر بلند پرواز ہی نہ کر سکتا۔ پٹنہ کے مرکز کا کام بھی ایسا ہی تھا۔

قائدین پٹنہ کا ایثار و استقامت: ان دو مختلف قسم کے کاموں کی جدا جدا صفات بیان کرتے ہوئے ہنٹر لکھتے ہیں[1] اس میدانِ عمل (تنظیم و ترسیل) کی مشقتیں کسی طرح میدانِ جنگ کی آزمائشوں سے کم نہ تھیں، بلکہ اس کے برعکس یہ تو کہنا چاہئے کہ میدانِ جنگ کی لپکتی ہوئی آگ میں گر کر فوراً امرِ جاوداں ہو جانا پریشانیوں اور ہر وقت کے خطرات سے تھوڑی، اور غیر مختتم دنوں کے طویل و سست رفتار گھنٹوں میں بسر کرنے سے سہل تر ہے۔ ان جنگ آزمودہ قائدین پٹنہ نے گھر بار سے دور زندانوں کے تاریک تہہ خانوں اور تیز اثر انڈمان کے ہولناک ویرانوں میں ایک دوسرے سے دائمی مفارقت کے دن اس طرح گزارے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان میں یوں (احمد اللہ و یحییٰ علی) کے ساتھ اتنی سی رعایت بھی روا نہ رکھی گئی کہ ان کی قبریں ایک جگہ پر ہوتیں۔ بایں ہمہ ان کے عزم میں تزلزل ہوا نہ ان کے قدم ڈگمگائے۔

خاندانِ صادق پور کا کارنامہ: یہ قابلِ توجہ حقیقت ہے کہ نصف صدی سے زیادہ ایک زبردست غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک زوردار تحریک کی قیادت کا عملاً سارا بوجھ ایک ہی خاندان اہل صادق پور نے اٹھایا۔ خصوصاً مولانا یحییٰ علی اور ان کے دوستوں نے کاموں کی نگرانی کی اور دونوں مرکز اس طرح کام کرتے رہے اور یہ سب کچھ انہوں نے اس زمانے میں کیا جب کہ مشقتوں کے بہت سے ہم قبول کی طرف سے عداوت اور کفرانِ قدردانی کی بھی کوئی امید نہ تھی۔ یہ ہے ملک کی آزادی کے لئے ان کے خود فراموشانہ جوش، ایثار و قربانیوں کا حقیقی معیار۔

---

[1] ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۹۰۔ عبارت منقولہ بالا اصل متن کا انگریزی ترجمہ تھی جس کا یہ دوبارہ اردو ترجمہ ہے۔ (مترجم)

یحییٰ علی کی گرفتاری: اس کے فوراً بعد ہی دو گواہ حسیم الدین اور امین الدین ڈھونڈ کر سامنے لائے گئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ ہم اپنے سرحد کے راستے میں صادقپور کے مکان واقع پٹنہ میں ٹھہرائے گئے۔ وہاں یحییٰ علی انگریزوں سے جہاد کرنے کی فضیلت پر وعظ کہا کرتے تھے۔ ہمارے علاوہ اور بہت سے اپنے رستے پر قافلہ میں ٹھہرے تھے۔ ان بیانات سے یحییٰ علی کی ضمانت منسوخ ہوگئی اور ۸ فروری ۱۸۶۴ء کو گرفتار کرکے عبدالرحیم اور عبدالغفار کے ساتھ ان کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔

قیدیوں سے انسانیت سوز سلوک: ۲ مارچ ۱۸۶۴ء سے ان گیارہ قیدیوں کو جدا جدا کر دیا گیا۔ مارچ سے سیشن کی سماعت کے اختتام تک یہ قیدی علیحدہ علیحدہ تنہائی خانوں میں ڈال دیے گئے جن کا رقبہ ۷×۵ فٹ تھا، چھت بہت بلند تھی اور دیوار میں بہت بلندی پر ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ ان کا دروازہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار کھلتا۔ جمعدار قیدیوں کو ایک کٹورہ پانی اور کچھ روٹی وہاں ڈال دے جایا کرتا اور صبح گملا صاف کر جاتا۔ اس تمام مدت میں قیدیوں کے ساتھ نہایت خلاف انسانیت سلوک کیا جاتا۔

قیدیوں کے اسمائے گرامی: حکم نامہ ابتدائی کارروائی کے بعد ڈپٹی کمشنر انبالہ کی عدالت میں ایک ہفتہ سے زیادہ جاری رہی۔ ۲ مئی ۱۸۶۴ء میں سر ہربرٹ سیشن جج انبالہ کی عدالت میں سیشن کی سماعت شروع ہوئی۔ جج کے معاون چار اسیسر مقرر کئے گئے تھے۔ دو ہندو اور دو مسلمان۔ ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کرنے کے جرم میں کل گیارہ آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ وہ یہ تھے۔

۱۔ یحییٰ علی صادقپوری۔ عمر ۴۰ سال۔ سوانح حیات کے لئے ملاحظہ ہو تتمہ۔

۲۔ محمد جعفر ولد میاں جیون، نمبردار تھانیسر۔ ایک خوشحال سوداگر۔ مزید خطوط میں پیرو خاں کے نام سے موسوم۔ عمر ۲۶ سال۔

۳۔ عبدالرحیم ساکن صادقپور پٹنہ۔ عمر ۲۱ سال۔ سوانح حیات کے لئے ملاحظہ ہو تتمہ۔

۴۔ محمد شفیع ولد محمد تقی، فوجی چھاؤنی کا ٹھیکہ دار گوشت۔ خوشحال تاجر۔ سرکاری گواہ بن گیا۔ مزید خطوط میں شفیع علی کے نام سے موسوم۔

و ذلیل تھا۔ ولی جعفر کی طرف سے محمد شفیع کے پاس ملکہ (وکٹوریہ) کے دشمنوں کو پہنچانے کے لئے دو سو نوٹ اشرفیاں لے جاتے ہوئے پکڑا گیا۔

شفیع کو پہلے موت کی سزا کا حکم دیا گیا لیکن سرکاری گواہ ہو جانے کے بعد یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور دو برس جیل میں رہنے کے بعد بری ہو گیا۔ مگر اس کی جائیداد جو پہلے ضبط کر لی گئی تھی واپس نہیں کی گئی۔

عدالتی فیصلے کی توثیق: یہ فیصلے توثیق کے لئے جوڈیشیل کمشنر روبرٹس کے پاس بھیجے گئے۔ داخلی حکومت سے مشورہ کرنے میں مسلسل التوا کے بعد فیصلہ ۲۴ر اگست ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا جس میں تخفیف کی ترمیم کر دی گئی۔ تین ملزموں کے لئے جو موت کی سزا مقرر کی گئی تھی اسے حبسِ دوام میں بدل دیا گیا۔ لفٹنٹ گورنر کا آخری حکم ستمبر میں صادر ہوا۔ قیدی مقدمہ کے آغاز سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبالہ جیل میں رہے۔ جیل کے احاطے میں جو یورپی خاندان رہتے تھے وہ ان کو عجوبہ منظر کی حیثیت سے دیکھا کرتے۔ اس زمانہ میں ایک بار جیل کے وارڈر (محافظ) نے یہ پیشکش کر دی کہ وہ ان کو نکل بھاگنے کا موقع دے گا اور فرضِ منصب میں غفلت کی جو سزا بھی ہو وہ بھگت لیگا۔ مگر قیدیوں نے اسے قبول نہ کیا۔

ہنٹر کا قیدیوں کو خراجِ تحسین: سرکردہ "وہابیوں" کے چال چلن اور "جرائم" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہنٹر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ جیل روزنامچہ یحییٰ علی اور جعفر کے خلوص اور ایمانداری کی تحسین کرے "جنھوں نے نہ کبھی وفاداری کا اظہار کیا نہ ہم سے کوئی رعایت طلب کی۔ یہ مخلص اور ایماندار لوگ تھے جنھوں نے اپنے تئیں زہر میں بجھے ہوئے ہتھیار چھوڑے تھے جو ایک باطل دین نے ان کے ہاتھوں میں دے رکھے تھے۔ اور اب جب کہ انھوں نے اپنی غداری کا خمیازہ بھگت لیا تو تاریخ ان کے آخر کو ایسے جذبہ سے یاد کرے گی جو ترحم و تاسف سے ملتا جلتا ہوگا۔"

شفیع کے بارے میں جس نے اپنی جان بچانے کو اپنے رفقاء اور مقصد دونوں سے غداری کی ہنٹر لکھتا ہے۔ "مگر محمد شفیع کے لئے ایسا کوئی جذبہ ابھر نہیں سکتا۔ اس نے ہمارا ہاتھ چاٹا اور اسی کو کاٹا۔" وہ شروع سے آخر تک ذہین چالاک اور کمینہ منصوبہ ساز دکھائی دیتا ہے۔

کرنے کے دفتر کے طور پر استعمال کرنا (۱) پچھلے ۱۸۵۷ء غدر کے ایام میں پٹنہ میں سازش کرنا (۲) اس خاندان کا سردار ہونا جسے بہت پیشتر پنجاب کے بورڈ ایڈمنسٹریشن (مجلس منتظمہ) نے ۱۸۵۲ء میں متنبہ کر دیا تھا کہ سرحد پر گڑبڑ نہ پھیلائے (۴) ایسی کارروائیوں کو اپنے گھر میں موقوف کرنے میں قاصر رہنا ہی نہیں بلکہ برعکس ان کی حوصلہ افزائی اور اعانت کرنا۔

احمد اللہ کے خلاف شکایات: حکومت پنجاب کا یہ مراسلہ اپنے وقت پر یا کچھ قبل تو نہیں پہنچا۔ واقعہ یہ ہے کہ احمد اللہ پر یحییٰ علی کی گرفتاری کے وقت سے ہی ایک زبردست [illegible] ہوئی تھی۔ پٹنہ کے مقامی حکام ان حرکات میں جن کے لئے یحییٰ علی اور دوسرے ملزموں پر مقدمہ چل رہا تھا احمد اللہ کی شرکت کا شدید شبہہ رکھتے تھے۔ ۱۸۶۴ء کے وسط میں جب کہ ملزمین انبالہ کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر تھی بلوڈن وکیل صفائی نے تیرہ کو احمد اللہ کی متوقعہ گرفتاری کی خبر دی تھی۔ عظیم آباد کے کچھ خود غرض آدمیوں نے جو احمد اللہ کے مرتبہ اور سرکاری اعزاز پر ان سے حسد رکھتے تھے ان کی شرکت سازش کے متعلق غیر ثابت حکام کے کان بھر دیئے تھے۔ ٹیلر پٹنہ کا برطرف کردہ ڈویژنل کمشنر اور وہابیوں کے خلاف زبردست پیروکار ابھی شہر ہی میں تھا۔ اس نے اور ایک جوان سپرنٹنڈنٹ پولیس بیشری پرشاد نے وہابیوں پر مقدمہ چلانے کی جدوجہد میں حکومت پر اپنے جوش و مستعدی کے اظہار کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ بیشری پرشاد نے اس نفع بخش تفویض کے لئے اسے یہ یاد دلایا کہ بعد میں حکومت نے اس کی خدمات دوبارہ منسب کر دیں۔

احمد اللہ کا وہابی تحریک میں حصّہ: احمد اللہ کی ان باغیانہ سازشوں میں شرکت کے بارے میں کچھ تشریح کی ضرورت ہے کیونکہ بعض لوگوں نے اس تحریک میں ان کے حصہ کی مقدار حیثیت کا اظہار کیا ہے۔ مہر کہتے ہیں کہ احمد اللہ نے اس تحریک کی تنظیم یا زیادہ عملی کاموں میں

لہ ۱۵ جون ۱۸۵۷ء میں احمد اللہ کے گھر کی تلاشی لی گئی تھی اور اس کے چند دن بعد ٹیلر نے ان کو گرفتار کر لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے فسادات میں بیشری پرشاد کو اس کی خدمات کے صلے میں ڈپٹی کلکٹری ملی اور ڈیڑھ ہزار روپے نقد انعام بھی۔ (تاریخ عجیب صفحہ ۹۰، گورنمنٹ بنگال جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ نمبر ۱۲۲ مورخہ اکتوبر ۱۸۶۵ء)

زیادہ عملی حصہ نہیں لیا۔[1] صرف یہی نہیں کہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے بلکہ اس مقدمہ میں بہت سارے دستاویزی ثبوت پیش کیے گئے ہیں اُن کے خلاف ہے۔ استغاثہ کا ایک جعفادری گواہ آہی بخش کا بیان ہے کہ احمد اللہ کو سید احمد کے ایک خلیفہ نے ان تمام رقوم کا جو جمع ہوں، ذمہ دار اور تمام متعلقہ امور کا نگران بنایا تھا اور جعفر کی طرف سے احمد علی کے فرضی نام سے جو خطوط وصولات[2] تھے اُن کو وہی وصول کرتے تھے۔ دیر ہم دیکھ آئے ہیں کہ یحییٰ علی کی وفات کے بعد احمد اللہ صادق پور کی مجلس علماء کے صرف سردار ہی نہ تھے بلکہ پہلے سے مشیر کی حیثیت سے کام بھی کرتے تھے۔ اسی حیثیت سے رقوم کو جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا کام بھی انھیں کے ذمہ تھے۔ اسی بنا پر ۱۸۶۵ء میں ان کی سزا ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سرحد نہیں گئے اور وہاں کے معرکوں میں حصہ نہیں لیا۔ مگر یحییٰ علی کی غیر حاضری کی پوری مدت میں پس منظر میں وہ خاموش اور غیر نمایاں روح تنظیم رہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ احمد اللہ صرف ایک تنخواہ دار سرکاری افسر ہی نہ تھے بلکہ کئی اور اعزازی عہدے بھی رکھتے تھے اور اس حیثیت سے خاندان کے دوسرے ارکان کی طرح وہ کھلا حکومت کے خلاف کارروائیوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔

احمد اللہ کی گرفتاری: سرحدی بغاوت میں شرکت سے متعلق حکومت پنجاب کے خیال سے حکومت بنگال نے پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر اور مجسٹریٹ کو تحقیقات اور ان کی رائے کے لئے باقاعدہ لکھ بھیجا۔ لفٹنٹ گورنر نے بھی ہدایت جاری کر دی کہ احمد اللہ کو فوراً سرکاری عہدوں سے برطرف کر دیا جائے اور آئندہ کبھی کسی حیثیت سے حکومت کے تحت کسی ملازمت کے لائق نہ سمجھا جائے۔ مجسٹریٹ نے بنگالیوں کو جان بوجھ کر اُن مقاصد کے لئے

---

[1] یہاں مولانا یحییٰ علی کے سنہ وفات (۱۸۶۸ء) کا ذکر غالباً مؤلف کی لغزش قلم معلوم ہوتا ہے۔ صحیح لفظ دوسرا مقدمہ پٹنہ ہونا چاہیے دونوں مجاہدوں کی رحلت جزیرہ انڈمان کے حبس دوام میں ہوئی۔ مولانا یحییٰ علی کی ۱۸۶۸ء میں اور مولانا احمد اللہ کی ۱۸۸۱ء میں۔ صحیح یہ ہے کہ جب مولانا یحییٰ علی پٹنہ سے بعد کو رخصت ہوگئے تو پٹنہ میں مولانا احمد اللہ ہی تحریک کے ذمہ دار سربراہوں میں سے تھے۔ (مترجم)

[2] ہم خود اقرار کرتے ہیں کہ ہم کو مقدمہ کی پوری روداد دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ انتخاب دستاویزات حکومت بنگال جلد ۴۲ میں شائع ہو چکا ہے ان کے مطالعہ سے انگوٹھا تحریک میں ان کی قیمتی خدمات کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

نے بغاوت کی تنظیم کی تھی۔[1]

جج نے قیدی کو دوسرے چوتھے اور پانچویں الزامات کا مجرم قرار دیا۔ اس نے پہلے [illegible] سے اُسے بری کر دیا اور دوسرے الزام کو تیسرے میں مدغم تصور کیا۔ اسیسروں نے بھی [illegible] کو پانچویں الزام کا مجرم تسلیم کیا۔ ۲۷ر فروری ۱۸۶۵ء کو قیدی کو سزائے موت کا حکم [illegible] اور اس کی املاک کو ضبط کرنے کی ہدایت کی۔

احمد اللہ کو حبس دوام کی سزا: فیصلہ توثیق کے لئے ہائی کورٹ کے سپرد کیا گیا [illegible] کورٹ نے سیشن کورٹ کی تمام کارروائیوں کو پیش نظر رکھکر ۱۳ر اپریل ۱۸۶۵ء کو [illegible] ان کے سامنے جو شہادتیں ہیں وہ قیدی پر دوسرے الزام کے لئے تعزیرات ہند کی دفعہ [illegible] کی رو سے سزا کی تائید میں کافی ہیں، لیکن شہادتوں سے ہم یہ نہیں پاتے کہ قیدی نے [illegible] سازش میں دوسرے سزا یافتگان سے زیادہ عملی حصہ لیا ہو۔ اس لئے ہم [illegible] جج کی دی ہوئی سزائے موت کی توثیق سے انکار کرتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ [illegible] احمد اللہ کو حبس دوام بعبور دریائے شور دیا جائے اور اُس کی تمام املاک بحق سرکار ضبط کی جائے۔

احمد اللہ کی جزائر انڈیمان روانگی: چنانچہ احمد اللہ جزائر انڈیمان منتقل کر دیئے گئے، وہ کلکتہ کے راستے سے بھیجے گئے۔ اور جون ۱۸۶۵ء میں [illegible] اور سزا یافتہ ملزموں سے پہلے وہاں پہنچے۔

انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات ایک دوسرے سے بالکل وابستہ تھے۔ دونوں مقدموں میں گواہان استغاثہ کا ایک ہی گروہ اور بہت حد تک ایک ہی طرز کی شہادتیں کام میں لائی گئیں [illegible] جعفر اور شفیع کے سوا دونوں مقدموں کے ملزمین ایک ہی مخصوص [illegible] اور قریبی قرابتدار تھے۔ درحقیقت اگر انبالہ اور پٹنہ کے افسروں میں کچھ بیشتر [illegible] اور منصوبہ بندی ہوتی تو احمد اللہ پہلے گرفتار کرلئے جاتے۔ پٹنہ کا [illegible]

---

[1] انتخابات دستاویزات حکومت بنگال جلد ۴۲ صفحات ۹۵ تا ۱۰۱

ہم آہنگی پر اپنے افسوس کے اظہار سے باز نہ رہا۔

مقدمہ انبالہ کے نمایاں پہلو مقدمہ انبالہ کے تین نمایاں ترین پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے، ہنٹر کہتا ہے کہ قابل تعریف ہے وہ دانشمندی جس سے ایسی وسیع الذیل بغاوت کی تنظیم کی گئی، وہ اخفا جس سے اس کی پیچیدہ کارروائیاں چھپائی گئیں اور وہ کامل وفاداری جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ قائم رکھی۔ بے شبہہ منصوبہ پر عمل درآمد بڑی ذہانت سے منظم کیا گیا تھا۔ قانوناً درست اور جائز مشاغل خلافِ حکومت کارروائیوں سے اس عیاری سے خلط ملط کر دئے گئے تھے کہ حکام کے لئے ان دونوں میں تمیز کرنا سخت دشوار تھا۔ مثلاً الٰہی بخش ان رقوم کے علاوہ جو وہ جہاد بھیجتا تھا وہ واقعی جوتوں اور دوسری چیزوں کی جائز خریداری کے لئے بھی روپے بھیجا کرتا تھا۔ تحریک کے جمہور کارکنوں کی ایمانداری بھی بہت نمایاں تھی۔

ان دونوں مقدموں میں استغاثہ نے جو طریقے اختیار کئے وہ بھی غور طلب ہیں یہ سچ ہے کہ دونوں مقدموں میں قیدیوں پر جو الزامات عائد کئے وہ نفس الامر میں درست تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ صفائی کی تمام بحثوں میں کبھی آدمی اور روپے کی فراہمی کے ایک وسیع و عریض جال کے وجود سے انکار نہیں کیا گیا۔ ملزمین میں سے یحییٰ علی نے کوئی بھی صفائی دینے سے قطعاً انکار کیا۔

بہرحال ان تمام واقعات کو یکجا کرکے یہ معنی نہیں نکلتے کہ ان کے جرائم دستاویزی اور زبانی شہادتوں کی بنیاد پر ایک قانونی عدالت میں قانوناً ثابت ہو سکے۔ جیسا کہ ذیر بیان کیا گیا ہے، مستغاثہ خود مشتبہ تھا۔ یا محمد اللہ کا باغی نہ ہونا تشفی بخش طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ احمد اللہ کے مقدمہ کی سماعت کے موقع پر پٹنہ کے مجسٹریٹ نے کہا تھا کہ اس مقدمہ میں انبالہ کے گواہوں کے بیانات بنیادی ثبوت ہوں گے، باقی دوسرے ثبوت جو مقامی طور پر مہیا ہوں گے وہ انہیں کا تکملہ ہوں گے اور ہم یہ بھی دیکھ آئے ہیں کہ انبالہ کے گواہوں کے بیانات یکجا کر کے ایک ہی شخص الٰہی بخش کی شہادت کی شکل میں تیار ہوئے ہیں جیسا کہ اُونشان نے خود اقرار کیا۔ یہ وہ شخص ہے جو خود اسی قسم کا سزا یافتہ تھا[۵] اور جسے مجسٹریٹ نے سماعت مقدمہ

---

۵ سلکشنز (انتخابات) مقدمہ پٹنہ صفحہ ۷۵۔

اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی کہ یہ بیانات ان لوگوں کے ہیں جو خود ستم رسیدہ تھے کم سے کم یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ استغاثہ نے غیر معمولی طریقے استعمال کیے۔

جعفر تھانیسری کی صاف گوئی: اس باب میں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ جعفر گرفتاری، مقدمہ کی سماعت اور فیصلے سے متعلق واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وارداتیں بھی آزادانہ بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب شیخ کو عمدہ عمدہ غذائیں دی جاتی تھی اور دوسرے فاقہ کھینچ رہے تھے ایک بار انھوں نے شیخ کے کھانے میں سے [illegible] چرا لیا تھا۔ اسی طرح شیخ کو جو روپے بھیجے گئے تھے ان سے انھوں نے دس روپے رکھ لیے تھے "انھوں نے اندازا میں کچھ روپے رکھ لیے تو وہ رقم ان کو واپس کر دی"۔ یہ واقعات انسانی کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں جو قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ ان سے جعفر کے بیانات کی صداقت و وقعت بھی ثابت ہوتی ہے۔

الٰہی بخش پر غیر معمولی نگرانی: سرکاری روداد سے بھی استغاثہ کے طور اور نیت کا پتہ چلتا ہے۔ خود پٹنہ کے مجسٹریٹ[1] نے کمشنر کو رپورٹ دی کہ الٰہی بخش جیسے ہی انبالہ سے لایا گیا اور مگول اسٹیشن پر اتارا گیا، وہاں سے عورت کے بھیس میں پکڑ کر لایا گیا اور مجسٹریٹ کے احاطے میں ایک بنگلے میں سخت پہرے میں رکھا گیا۔ پٹنہ میں اس کی موجودگی کی خبر کسی کو نہ تھی جب تک کہ وہ گواہ کے کٹہرے میں کھڑا نہ کر دیا گیا۔ اور قیدی بھی جو پنجاب سے لائے گئے اسی طرح مجسٹریٹ کے احاطے میں بند رکھے گئے۔ الٰہی بخش کو انتظار کے دوران پنجاب پولیس فورس کے تین آدمیوں کی نگرانی میں رکھا گیا۔ وہ بھی خاص طور پر پنجاب سے ہی بلائے گئے تھے۔ بعد میں احمد اللہ کے متعلق فیصلے کے بعد پولیس کے ان تین افسروں کو ان کے پٹنہ میں اقامت کے صلے میں جملہ چار سو روپے انعام میں عطا کیے گئے۔ جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ الٰہی بخش ہی کی شہادت پر احمد اللہ ماخوذ ہوئے اور اس بات پر نظر کرتے ہیں کہ تمام دوران سماعت مقدمہ میں حکام نے کس طرح اس کو علاحدہ رکھا

---

[1] سلیکشنز (منتخبات) متذکرہ بالا صفحات ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۱

اور پھر اس کو کثیر رقم انعام میں دی تو معاملہ سخت مشتبہ ہو جاتا ہے۔ ایک مقامی نمونہ افسر
ایشری پرشاد کے متعلق جس نے مقدمہ کی تفتیش میں اتنی سرگرمی دکھائی مجسٹریٹ لکھتا ہے
کہ میں اس کی کما حقہ تعریف نہیں کر سکتا"۔ اس کو بھی ملازمت میں ترقی کے علاوہ نقد انعام
دیا گیا۔

(ج) سزایافتگان کی زندگی جزائر انڈمان میں

جزائر انڈمان جسے عام طور پر "کالا پانی" کہتے ہیں سزا یافتہ قیدیوں کی نو آبادی ہے۔
یہ مختلف رقبوں کے کئی جزیروں کا مجموعہ ہے جن کو اتھلا سمندر اور چھوٹی ندیاں ایک
دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ زیادہ تر جزائر جنگلات سے ڈھکے اور پہاڑوں کے سلسلے سے
بھرے ہیں۔ کوہ ہیریٹ کی بلند ترین چوٹی گیارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ ان اسباب
سے مزروعہ زمین کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں۔ جزائر کے قدیم باشندے جنگلوں میں رہتے ہیں؛
جہاں انھوں نے مزروعہ اراضی کے چھوٹے چھوٹے قطعے تیار کر لئے ہیں۔ قیدیوں اور ان کی نو آبادی
کے افسروں کے لئے غلے کلکتہ سے آتے تھے جو اسٹیمر سے پانچ دن کا راستہ ہے؛ غلے
یکساں شرح سے تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ ذرائع آمد و رفت قریب قریب نابود ہیں اور
ضروری اشیا کی فراہمی شاذ و نادر۔ آب و ہوا ایسی مسموم ہے کہ کسی کو کوئی زخم یا خراش لگ
جائے تو ناسور ہو جاتا ہے اور عموماً زخمی جلد ہی مر جاتا ہے۔

قیدیوں کے لئے قواعد و ضوابط: ایک اعتبار سے قیدیوں کو اس نو آبادی میں منتقل
کر دینا دوسرے قید خانوں میں بند کرنے سے بہتر تھا۔ خاص طور پر خطرناک قیدیوں کے
گروہ کے سوا باقی تہ خانوں یا کوٹھریوں میں بند نہیں کئے جاتے تھے۔ جزیروں میں پہنچ کر قیدیوں
کی زنجیریں کاٹ دی جاتیں اور بعض جسمانی مشقتیں جو نو آبادی کے مجریہ قواعد و ضوابط کے
مطابق عائد کی جاتی تھیں، ان کو ختم کرنے کے بعد ان کو معمولی طور پر زندگی بسر کرنے کی
اجازت ہوتی۔ پڑھے لکھے لوگ کسی محرری یا فنی شغل میں لگا دئے جاتے جس کے لئے
لئے ان کو معاوضے دئے جاتے۔ اگر ان کو مقدرت ہوتی تو نوکر رکھنے کی اجازت بھی ہوتی۔

اور غیظ و غضب کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔

ایشری پرشاد کی روانگی انڈمان: بنگال صوبائی سی آئی ڈی کے افسر وہابی تحریک کی پوری تاریخ اور حکومت کے لئے تحریک کے خطرات کی کیفیت و کمیت سے خوب واقف تھے اس لئے وہابی قیدی ان کے انتقام اور بہیمیت کا خاص نشانہ بنے۔ لارڈ میو کے قتل کی خبر جیسے ہی کلکتہ پہنچی مخالف وہابی افسروں کے پرانے جتھے نے اس حادثہ میں وہابیوں کو ملوث کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایشری پرشاد جس نے اب تک سرکاری حلقوں میں مسئلہ وہابیات کا ماہر ہونے کی شہرت حاصل کر لی تھی پولیس کمشنر پٹنہ کے ساتھ وہابیوں کی مفروضہ شرکت کا سراغ لگانے کے لئے فوراً جزائر انڈمان روانہ کیا گیا۔ مگر ایک مدراسی صوبائی افسر جنرل اسٹوارٹ نے جو جزیرے کا ذمہ دار حاکم اور وہابیوں کے پس منظر سے نا آشنا اور قیدیوں سے کوئی تعصب نہ رکھتا تھا اس فضول جستجو کی حوصلہ افزائی کو نامنظور کر دیا۔

جنرل اسٹیوارٹ کا غیر جانبدارانہ رویہ: لیکن جنرل اسٹیوارٹ کی غیر جانبدارانہ روش کے باوجود وہابیوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اب تک ان میں سے اکثر بڑے جزیرے میں جہاں زیادہ تر افسر رہتے تھے مختلف ملازمتوں پر مقرر کئے جاتے تھے مگر اب وہ جنگلوں سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے دور افتادہ جزیروں میں منتقل کر دئے گئے۔ احمد اللہ جزیرہ وائپر میں بھیج دئے گئے جہاں بدترین قسم کے عادی مجرم رکھے جاتے تھے۔ وہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں دس روپے ماہانہ تنخواہ پہ محرر مقرر کئے گئے اور ان کو بغیر کرایہ کا مکان دیا گیا۔ عبدالرحیم ایک دوسرے دور افتادہ جزیرے میں منتقل کر دئے گئے جہاں وہ ایک ہسپتال میں محرر مقرر ہوئے۔

احمد اللہ کی حالت زار: احمد اللہ اب زیادہ بوڑھے اور کمزور ہوتے جاتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا یحییٰ علی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے عبدالرحیم روزانہ ان کی خدمت کو آیا کرتے۔ مدت قید کے بارہ برس پورے کرنے کے بعد اس قیدیوں کی نوآبادی کے ضابطے کے مطابق ان کو اپنے پس انداختہ سے کوئی کاروبار کرنے

کی اجازت مل گئی اور انھوں نے بڑے جزیرے کے قریب برڈین میں ایک دکان کھول لی۔ ان کے بیٹے عبدالفتاح کو جزیرے میں ان سے آملنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ایک سال سے کچھ زیادہ باپ کے پاس ٹھہرے رہے، مگر اس جگہ کی آب وہوا کی ناسازگاری کے سبب سے اُن کو واپس چلے جانا پڑا۔ اسی قسم کی ایک درخواست احمداللہ نے بھی دی تھی کہ ان کے بیٹے محمد یقین کو جو اُن دنوں کلکتہ میں رہتے تھے ان سے ملنے دیا جائے مگر منظور نہ کی گئی۔

احمداللہ کی حسرتناک موت: کاروبار سے عبدالرحیم کی مالی حالت بہتر ہوگئی تھی۔ احمداللہ کی صحت تیزی سے گرتی جاتی تھی۔ اس لئے عبدالرحیم نے حکام سے درخواست کی کہ ان کو اپنے چچا کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے مگر یہ منظور نہ ہوئی۔ اس کے بعد بھی بار بار اس سلسلہ میں کوششیں ہوتی رہیں اور سب ناکام ہوئیں۔ عبدالرحیم ان کی خدمت کے لئے بار بار جاتے رہے مگر ان کے پاس ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ دو ہفتہ تک وہ روزانہ ان کو دیکھنے جاتے۔ اس غرض سے صبح سویرے ان کو گھر سے نکلنا پڑتا۔ دو میل پیدل گھاٹ پر پہنچتے۔ دو میل سے زیادہ چوڑی اتھلی ندی پار کرکے جزیرہ وائپر پہنچتے اور پھر احمداللہ کے گھر پیدل جاتے۔ ان کی غیرحاضری میں ان کے بیٹے عبدالفتاح دکان پر بیٹھتے۔ ایک روز ۲۲ نومبر ۱۸۸۱ء کو جب عبدالرحیم حسب معمول جزیرہ وائپر کو جانے والے تھے انھوں نے سنا کہ پچھلی رات احمداللہ تنہائی اور بےکسی میں انتقال کر گئے۔ عبدالرحیم اس ناگہانی صدمہ سے بدحواس ہوگئے۔ ان کی تدفین کے ضروری انتظامات کے لئے گھر لوٹ گئے۔ مرحوم کی طرف سے ایک آخری درخواست ان کے چھوٹے بھائی یحییٰ علی کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت کے لئے دی گئی مگر مقامی حاکموں کو ان کے مرنے پر بھی اتنا رحم نہ آیا کہ ان کے لئے اتنی سی رعایت روا رکھتے۔ جزائر انڈمان کے ویرانوں میں بھی دونوں بھائیوں کو ایک جگہ مدفون ہونا نصیب نہ ہوا۔ احمداللہ جزیرہ وائپر میں ڈونڈاز پوائنٹ میں سپرد خاک کئے گئے۔[1]

---

[1] مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم ۔ غالب
(مترجم)

(د) وہابیوں کی جائدادوں کی ضبطی

گرچہ پٹنہ کے وہابیوں کی جسمانی سزاؤں کا کچھ بیان کتنا ہی مختصر سہی موجود ہے مگر ان کی گرفتاریوں اور سزاؤں کے بعد ان کے مالی نقصانات کی کوئی اطلاع دستیاب نہیں۔ اس خصوص میں وہابی ذرائع بھی خاموش ہیں۔

وہابیوں کا سماجی مرتبہ: وہابی خاندان جو سید احمد کی وفات کے بعد اس تحریک کا مشعل بردار تھا، صرف علمی سربلندی کے سبب سے نمایاں نہ تھا بلکہ اعلیٰ سماجی رتبے کے سبب بھی جو اس کے ارکان کو حاصل تھے ممتاز تھا۔ خاندان تین بڑی شاخوں میں منقسم تھا جس کے ارکان ایک دوسرے سے مضبوطی سے وابستہ اور منسلک تھے۔ ان تین شاخوں کی نسل یہ تھے (۱) محمد حسین، (۲) الٰہی بخش، (۳) فتح علی۔ محمد حسین کے چھ بیٹیاں تھیں جن میں سے چار الٰہی بخش کے بیٹوں سے بیاہی گئیں اس طرح دو شاخیں ملکر ایک ہو گئیں۔ فتح علی اور الٰہی بخش بھی شادیوں کے بندھن سے باہم وابستہ تھے۔

الٰہی بخش نوابان مرشد آباد کی ریاست میں بہت اعلیٰ خدمات پر مامور تھے اور ان خدمات کے صلے میں ان کو موضع کھجولی (جس کا رقبہ ۲۰۰۰ بیگھہ اور آمدنی ڈیڑھ ہزار روپیہ تھی) اور بیچھے گوپال پور (جس کا رقبہ ۷۰۰ بیگھہ اور آمدنی چار ہزار روپے تھی) ضلع پٹنہ میں عطا ہوئے۔ یہ احمد اللہ، یحییٰ علی اور دوسرے ورثہ کو پہنچے اور حکومت کی ضبط کردہ جائدادوں کے حصے تھے۔ احمد اللہ خود بھی اپنے زمانے میں پٹنہ کی نہایت اہم سماجی شخصیتوں میں سے تھے اور متعدد اعزازی اور باتنخواہ عہدوں پر بھی مامور رہے۔

فتح علی، رفیع الدین حسین والد روح الدین حسین خاں کے داماد تھے۔ آخر الذکر کو شاہ عالم ثانی نے نائب ناظم بہار مقرر کیا تھا۔ عہد دیوانی میں بھی وہ اسی عہدے پر برقرار رہے۔ ۱۷۶۳ء کی شورش کے زمانے میں پٹنہ کے ایک انگریز حاکم ایمس کی جان بچانے کے صلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کو معین الملک متین الدولہ نصرت جنگ کا خطاب بخشا تھا۔ ان کے بیٹے رفیع الدین حسین اپنے باپ کے عہدے اور

جاگیروں کے وارث ہوئے۔ اس کا ایک حصہ ان کے داماد کو ترکے میں ملا۔ اتنا حصہ بھی یقیناً بڑا بیش قیمت ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح علی کے ایک بیٹے عنایت علی نے ۱۸۵۸ء میں ہندوستان سے آخری ہجرت کے وقت اپنا جو حصہ بیچا اس کا زرِ ثمن بیس ہزار روپے[1] سے زائد تھا۔

خاندان صادق پور کی املاک کی ضبطی: ہم ان حقائق سے خاندان صادق پور کی جائداد غیر منقولہ کی کمیت اور قیمت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مقدمہ انبالہ کے فیصلے کے اعلان کے بعد ملزمین پٹنہ کی ایک فہرست حکومت بنگال کو اس ہدایت کے ساتھ روانہ کی گئی کہ ان کی جائدادیں ضبط کر لی جائیں۔ چنانچہ ایک گوشوارہ تیار کیا گیا۔

لفٹنٹ گورنر نے بھی کمشنر کو ازروئے دفعہ ۔ ضابطہ ۹ ۱۸۱۸ء رپورٹ کرنے کی ہدایت کی کہ جائداد غیر منقولہ کا کیا کیا جائے اور کس طرح نمٹا جائے۔ ساتھ ہی اس نے حکومت ہند کو مشورہ دیا کہ شہر کے اندر اراضی اور مکانات شہر کے مفاد کے لئے میونسپل کمشنر کے سپرد کر دئے جائیں۔ اس مشورے کے جواب میں حکومت ہند نے ہدایت کی کہ صادق پور کی عمارت جہاں سازش چل رہی تھی میونسپلٹی کو دی جائے کہ منہدم کر دی جائیں اور اس جگہ ایک عمدہ بازار بسایا جائے اور باغیوں کی ضبط کردہ جائداد کے زرِ ثمن کا ایک حصہ میونسپلٹی کے لئے وقف کر دیا جائے۔

حکومت ہند کے اس حکم کی تعمیل میں بعد میں ایک قانونی روڑا پڑ گیا۔ دیکھا گیا کہ صادق پور کی عمارات مشترکہ طور پر خاندان کی ملکیت تھیں۔ سب سے زیادہ حصہ تینوں بھائیوں احمد اللہ، یحییٰ علی اور فیاض علی کی ملک تھا۔ چھوٹا حصہ ولایت علی اور ان کے بھائیوں عنایت علی و فرحت حسین کی ملک تھا۔ ولایت علی کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے دو عبداللہ و عبد [illegible] تھے ان کے باغی ہونے کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ دوسرے کے دو بیٹے

---

[1] تذکرہ صادقہ صفحہ [illegible]، مولوی عبد الرحیم کی [illegible] تذکرہ صادقہ میں کوئی ذکر نہیں [illegible] والد سے [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] حقیقت جو کچھ [illegible] نے نوٹوں میں واضح کر دی ہے [illegible] ذکر [illegible] ثابت [illegible] عنایت علی نے ہجرت کے وقت اپنا حصہ فروخت کر دیا تھا [illegible] کوئی جائداد غیر منقولہ باقی نہ چھوڑی تھی [illegible] کے متعلق تخصیص کیوں کیا گیا [illegible] ولایت علی کے متعلق کیوں نہیں؟ ۱۲ مترجم

محمد حسین پٹنہ میں اور ہدایت اللہ باڑھ میں رہتے تھے۔ ان کے حصے ضبط نہیں کئے جا سکے۔ عنایت علی کے صرف ایک بیٹے عبدالمجید[1] تھے۔ وہ بھی باغی اعلان کئے جا چکے تھے۔ اس لئے ان کا حصہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ فرحت حسین کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے عبدالرحیم نے انبالہ میں سزا پائی اور دوسرے عبدالرؤف پٹنہ میں رہتے تھے اور ان کا حصہ ضبط نہ کیا جا سکا۔

اس پیچیدگی کے پیش نظر لفٹننٹ گورنر نے سفارش کی کہ بقیہ حصے جو ضبط نہ ہوتے ضابطہ سنہ ۱۸۵۷ء کے تحت رفاہ عام کے لئے رکھ دئے جائیں اور ان حصوں کا معاوضہ ضبط شدہ جائداد کے زر ثمن سے ادا کر دیا جائے۔ وہ پورا حصہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے۔

خاندان پٹنہ کی املاک کا حشر: آبائی مکانات کے علاوہ قائدین پٹنہ کی جائداد غیر منقولہ پٹنہ اور دوسرے ضلعوں میں بھی تھی۔ یحییٰ علی اور احمد اللہ کی غیر منقولہ جائداد کی مجموعی سالانہ آمدنی ۱۷۹۱ روپے سات آنے ۱۰ پائی تھی۔ عبدالرحیم کی جائداد کی کل سالانہ آمدنی ۲۹۵ روپیہ ۷ آنے ایک پائی تھی۔ یہ ساری قیمتی جائدادیں ایک جنبش قلم سے ضبط کر لی گئیں اور گاجر مولی کی طرح بیچ دی گئیں (گھروں کی ضبطی کے نتیجے میں) عورتیں، بچے لغوی معنی میں گلیوں کوچوں میں ڈال دئے گئے۔ اور کوڑی کوڑی کے محتاج بنا دئے گئے۔

مکینوں کو صرف اپنے تنوں پر کپڑے پہنے ہوئے خانہ بدر ہونا پڑا۔ ان کو اپنے ساتھ ایک سوئی بھی لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایک ایک چیز جو گھروں میں تھی اور پہلے سے قبضہ کئے ہوئے گوشوارے میں درج کر لی گئی تھی، حوالہ کر دینا پڑی ان میں سے اگر کوئی چیز

---

[1] حافظ عبدالمجید کی صحیح تاریخ وفات کہیں نہیں ملتی۔ مولانا عبدالرحیم نے اصلی تذکرہ صادقہ طبع اول سنہ ... صفحہ ۱۹۰ میں لکھا ہے کہ "جب منجھلے حضرت مولانا عنایت علی کا انتقال سوات میں سنہ ۱۸۵۸ء میں ہوا تو آپ کے فرزند حافظ عبدالمجید کا بھی انتقال تھوڑے ہی عرصہ میں وہیں ہو"۔ بقول مولانا غلام رسول مہر وہ مولانا عنایت علی کے موت کے زمانے میں بہت سخت علیل تھے۔ بہرحال ان کا انتقال بھی سنہ ۱۸۵۸ء کے لگ بھگ یعنی سنہ ۱۸۶۳ء سے قبل ہو چکا تھا۔ اور مقدمات سنہ ۱۸۶۳ء سے شروع ہوئے۔ اس لئے حافظ عبدالمجید کے باغی اعلان کئے جانے اور ان کی جائداد کی ضبطی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ اس لئے مولف کا یہ قول ثقہ ہی نہیں بلکہ غیر مستند ... سے مسموع و غیر مستند ہے۔ تحقیق ہونا چاہئیے ہے [مترجم]

غائب پائی گئی تو اس کی قیمت تخمینی قیمت سے دس گنا زیادہ ادا کرنا پڑتی"[1]

احمد اللہ کے خاندان کی تباہی: احمد اللہ کے بڑے بیٹے عبدالحمید جن کو خاندان کے سب سے معتبر رکن کی حیثیت سے حکمِ اخراج کا بارِ گراں اٹھانا پڑا ان معصوم عورتوں اور بچوں کی خاموش فریاد کا اپنی فارسی مثنوی میں جامع و مانع طرز میں نقشہ کھینچتے اور خاندان کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"احمد اللہ بود مجرم شاہ   متعلقش جملہ بے گناہ چہ گناہ"

گردشِ تقدیر سے خاندان کے ان بدنصیب مکینوں کے سروں پر یہ آفت ٹھیک عید کے خوشی کے تہوار کے دن پڑی۔ احمد اللہ نے بجا طور پر یوں فریاد کی ہے۔

"چون شب عید را سحر کردند   ہمہ را از مکان بدر کردند
مایۂ عیش ما ماتم شد   عید ما غرۂ محرم شد"

(جب عید کی صبح ہوئی سب گھر سے نکال دیئے گئے عید کا نغمہ عیش ماتم بن گیا۔ ہماری عید محرم کی پہلی تاریخ ہو گئی)۔

لفٹننٹ گورنر نے مشورہ دیا کہ مناسب ہے کہ جایدادوں کا زرِ ثمن عام مالگذاریوں میں جذب کر لیا جائے۔ اور زیادہ موزوں یہ ہوگا کہ یہ روپے مقامی ضرورتوں پر صرف کئے دیئیں۔

. . . .

. . . . [1] ان خاندانوں کی عورتوں نے ہجرت کے وقت سے پہلے ہی اپنی غیر منقولہ جائدادیں عورتوں کے نام منتقل کر دی تھیں۔ وہ سب بچ گئیں۔ حکومت نے ان پر قبضہ نہیں کیا۔ اور آخر تک جو مکان ضبط نہ ہوئے تھے وہ ان کے ورثا ان جائدادوں پر قابض و مستفید ہیں۔ جہاں کتابوں اور سرکاری کاغذات میں جائیداد غیر منقولہ کی فروخت کا کثرت سے ذکر ہے وہاں املاک منقولہ کی فروخت کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مستورات بے خانماں ہو گئیں ایسا تو ماری نہیں بلکہ چند دن قریبی ہندوؤں کے گھروں میں پناہ گزیں ہو گئیں جو الزام بغاوت سے بری تھے۔ مگر وہ کبھی اس قدر تنگ دست نہ ہوئیں کہ مالی امداد کی محتاج ہوتیں۔ سر چھپانے کے لئے مکان یا دالان حاصل ہوتے ہی مطمئن ہو گئیں اور کئی پشت تک مرد بھی تنگ دست نہ ہوئے جو عورتوں کے نام غیر منقولہ جائدادوں سے عزت آبرو سے بسر کرتے رہے۔ ان کی مالیت لاکھوں روپے تھی] مترجم
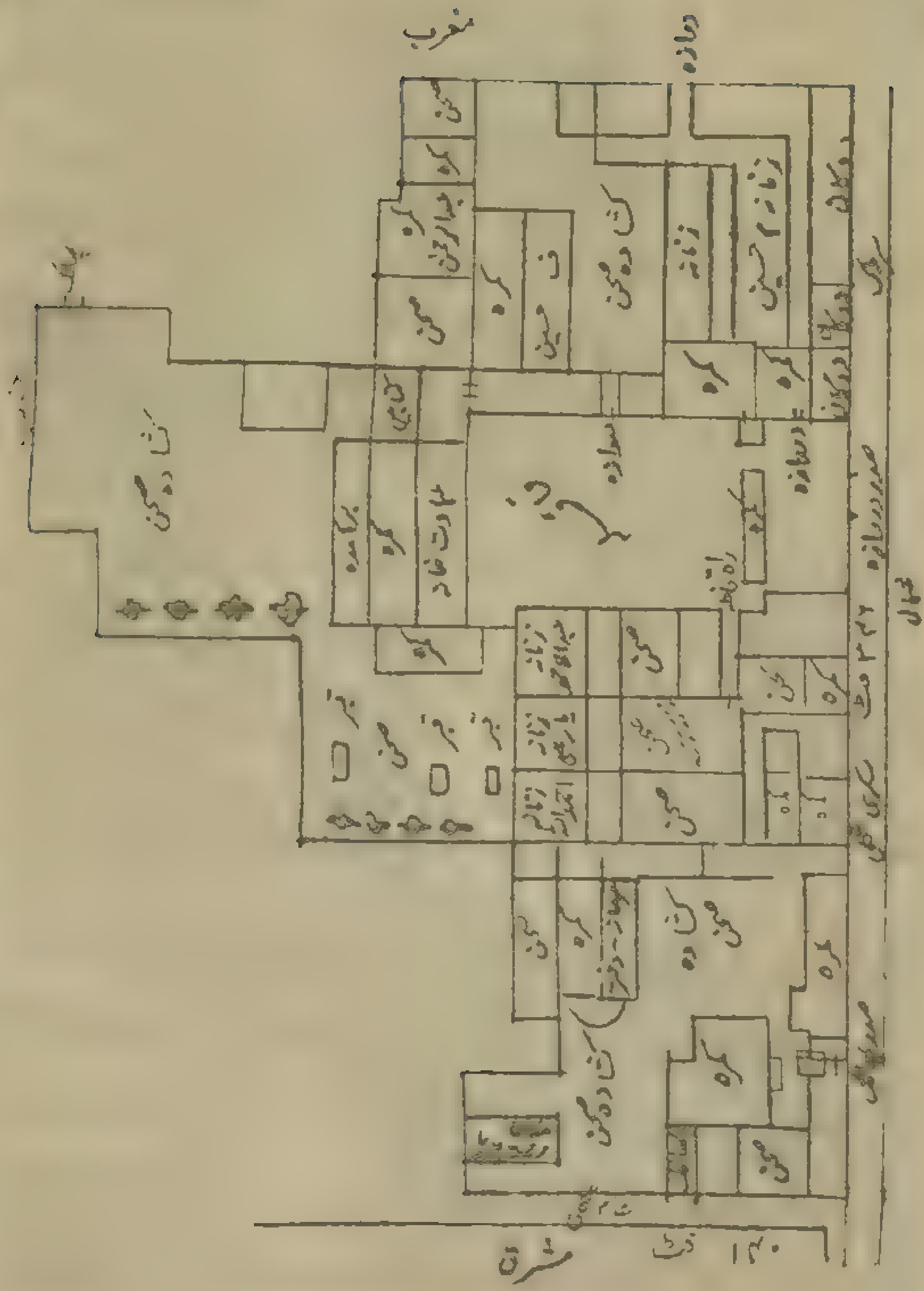
حکومت ہند نے لفٹننٹ گورنر کے تمام مشورے قبول کر لئے۔ غیر منقولہ جائدادوں کے زرِ ثمن کے مصرف کے بارے میں کہا گیا کہ جب حکومت ہند اس رائے سے متفق نہیں کہ یہ سارا زرِ ثمن عام مالگذاریوں میں مخلوط کر دیا جائے اس خاص صورت میں اسے لفٹننٹ گورنر کی تجویز میں کوئی عذر نہیں۔ چنانچہ یہ حکم نافذ کر دیا گیا۔

وہابی فنڈ کا مصرف: وہابیوں کی جائداد غیر منقولہ کی فروخت سے حکومت نے جو خطیر رقمیں فراہم کیں اور جسے وہابی فنڈ کہا گیا، اس کی بعد کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔[1]

فروخت سے جو مجموعی رقم حاصل ہوئی اس کی تعداد ۱۲۱۹۴۸ روپے ۴ آنے ایک پائی تھی۔ اس میں سے احمد اللہ کے حصے کی رقم ۲۲۱۱۹ روپے ۱۰ آنے ۳ پائی تھی۔ یہ رقم حکومت نے اپنے خزانے میں جمع کر لی کیونکہ ان کی بیوی نے ایک مقدمہ دائر کر کے دعویٰ کیا تھا کہ یہ جائدادیں ان کو حق مہر میں دی تھیں۔ باقی ۹۸۲۹۷ روپے ۹ آنے دس پائی میں سے ۳۳۴۰۷ روپے ۷ آنے ۶ پائی ۱۸۶۹ء کو پٹنہ میونسپلٹی کو اسی جگہ پر جہاں وہابیوں کے آبائی مکانات بنے ہوئے تھے ایک میونسپل مارکیٹ (بازار) کی تعمیر کے لئے بطور عطیہ امداد دے دئے گئے۔ یہ فعل میونسپل کمشنر کی اس تجویز کے جواب میں عمل میں لایا گیا کہ ایک مربع رقبہ کے تین طرف یک منزلہ پختہ دوکانیں تعمیر کی جائیں اور چوتھی طرف شمال کی جانب کا حصہ سڑک کے مقابل راستے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ تخمینہ کیا گیا کہ ان دوکانوں سے تین ہزار روپیہ سالانہ کرایہ وصول ہوگا۔ مزید تین ہزار کی رقم پٹنہ سٹی ریلوے اسٹیشن سے پٹنہ گھاٹ اسٹیشن تک ایک سڑک کی تعمیر پر صرف کی گئی۔ مزید تیس ہزار روپے پٹنہ کالج کی عمارتوں کی توسیع و تجدید کے کچھ کاموں پر صرف ہوئے۔ ان میں پرانے قلعہ کے مشرقی بازو پر ایک لکچر روم، ایک دارالتجربہ، بڑا زینہ، میوزیم (عجائب خانہ) کی تعمیر اور سڑک پر ڈامر بچھانا شامل تھا۔ ان کاموں پر مجموعی خرچ

---

[1] یہ تفصیلات خفیہ کاغذات کے ایک پلندے سے لی گئی ہیں جو پٹنہ کمشنری کے دفتر میں علیحدہ محفوظ ہیں۔ یہ رسمی سرکاری چٹھیاں نہیں بلکہ دفتر کے نوٹ اور مسودات ہیں جن پر پنسل کے مختصر دستخط ہیں۔ بہرحال ان کاغذات کے نفس مضمون اور دستخطوں سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ کون سا مسودہ کس کی طرف سے اور کس کے نام ہے۔

کا تخمینہ ۱۲۷۰۱۷ تھا جس میں سے متذکرہ بالا رقم وہابی فنڈ سے اور باقی اخراجات کاٹن فنڈ اور دوسرے ذرائع سے پورے کئے گئے۔

مقامی افسروں نے صادق پور میں وہابی تعمیرات کو منہدم کرنے کے لئے حکومت کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے خاندان کے مقبرے کو بھی نہیں بخشا۔ قبروں کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا اور ان کو کھود ڈالا۔ عبدالرحیم بھی جنھوں نے اپنی تالیف (تذکرہ صادقہ) میں اذیت انگیز وہابیوں کے ساتھ حکومت کی معاندانہ حرکات پر متشددانہ تبصرے سے بہت احتراز کیا ہے۔ اس گھناؤنے پن کی حرکت کے خلاف سینہ دل رنج اور فریاد پر تو بونہ رہ سکے۔ اپنے اسلاف کی اجڑی ہوئی اور بے نشان قبروں کو دیکھ کر اپنے تاثر کا یوں اظہار کرتے ہیں: "اپنے مردوں کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر اس صدمے کے احساس کو الفاظ میں ظاہر کرنا دشوار ہے۔ آج تک اسے یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارے اسلاف کی قبریں کیوں کھود ڈالی گئیں؟ [2] وہ مقبرہ کیوں ضبط کر لیا گیا؟ اور ہماری عادل حکومت نے اس طرح کی حرکت کیوں کی؟"

خاندان صادق پور کی نشاۃ ثانیہ: خاندان کے سرمایہ کے شکستہ اور منتشر اجزا پھر آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ اکٹھے کئے گئے۔ خاندان کے کچھ ارکان بالخصوص عبداللہ ایک چھوٹا سا [illegible] گذارا کرنے کے لئے جو اب بھی وہاں موجود ہے سرحد پر ہی اقامت پذیر رہے۔ باقی دوسرے ارکان نے دوبارہ گھٹنوں پر اٹھ کھڑے ہو جانے کی صلاحیت اور قوت ارادی کا ثبوت دیکر اپنی ایک نئی راہ نکال لی، .... اور ایک جدا [illegible] اختیار کی۔ وہ سرحد سے لوٹ آئے، اپنے نام بدل لئے، انگریزی تعلیم حاصل کی اور نئے میدان عمل میں بھی نمایاں فضیلت حاصل کی۔ احمداللہ کے بیٹے اشرف علی علی گڑھ کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہوئے اور مختلف ریاستوں، بہاولپور، جوناگڈھ وغیرہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ یحییٰ علی کے بیٹے امجد علی نے بھی اعلیٰ تعلیمی امتیاز حاصل کیا اور شمس العلماء کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی [1] سے ایم اے کیا اور [illegible]

---

[1] اس وقت بنارس میں نہ ہندو یونیورسٹی تھی نہ ایم اے کا امتحان جو صرف کلکتہ یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ مولانا اشرف علی و مولانا امجد علی نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ مترجم۔

[2] مری نظر کے بھی تحریر میں نہ ہی میسر باقی انھیں میرے مرنے ہی کا نہیں اعتبار رہتا (مترجم)

کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ احمد اللہ کے بڑے بیٹے عبدالحمید نے علم کے دوسرے
میدان (طب) میں بے نظیر عزت و شہرت حاصل کی۔ وہ اپنے زمانہ کے ایک مشہور ترین طبیب تھے
اور کثیر دولت کمائی۔ ولایت علی کے چھوٹے بیٹے محمد حسن پٹنہ کے قدیم ترین اردو اخبارات[1]
میں سے ایک اخبار پٹنہ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور مقامی ایم۔ اے۔ اسکول (محمڈن اینگلو عربک اسکول)
کے بانی تھے، اور کلکتہ میں ایک کامیاب کاروبار قائم کیا۔ ان سربرآوردہ ارکان کی مشترکہ جدو
جہد سے خاندان کی قسمت نے پھر پلٹا کھایا۔ خاندان کے سب سے بڑے رکن جو ابھی
بقید حیات ہیں، حکیم عبدالخبیر کا خاندانی مکان میونسپل عمارت کے جو قدیم عمارت کے مقام پر
بنی ہے، عین مقابل واقع ہے۔ اس کے پیچھے میں ولایت علی کے پہلے سکونت پذیر تھے۔ عبدالحمید
اپنے مکان کی ضبطی کے بعد ایک متصل مشترکہ ملحقہ احاطہ کلاں میں جو بیت، وہاں مطب قائم کیا اور
ایک مکان بھی خریدا جس کی ان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر نجم الدین احمد نے تجدید و توسیع کی۔ ان کے بیٹے اب
بھی وہیں سکونت پذیر ہیں۔

(ق) وہابی قیدیوں کی رہائی

وہابی قیدیوں کی رہائی اگرچہ ترتیب زمانی میں بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی
ہے، اسے ۱۸۶۳-۶۵ء کے سرکاری مقدمات کے بیان کی تکمیل کے لئے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔
رہائی ۱۸۸۳ء میں عمل میں آئی۔ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۸۰ء کی درمیانی مدت میں حکومت
وہابی تحریک کو کچلنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی اس سے بھی اس فیصلے کو تقویت
پہنچی اور ان کی رہائی کے مسئلے پر زیادہ نرم اور اعتدال کی نظر ڈالی گئی۔

۱۸۸۳ء تک وہابی تحریک بالکل کچلی جا چکی تھی۔ اب حکومت ہند کے لئے کوئی
خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

---

[1] صرف اردو نہیں انگریزی بھی۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نمونے پر مرتب۔ اس کے انگریزی ترجمے کے دو کالم
پہلو بہ پہلو ہوتے تھے۔ مترجم۔ وہ پٹنہ کالج میں عربی کے پروفیسر اور صدر شعبہ عربی تھے ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

اس صورتِ حال میں ۱۸۸۲ء میں عبدالرحیم کی بیوی نے گورنر جنرل کو ایک عرضداشت روانہ کی جس میں انھوں نے گذارش کی کہ انبالہ کے سشن جج نے عبدالرحیم کے متعلق کہا تھا کہ ۱۵ برس کے بعد ان کی میعادِ سزا پر نظرثانی کی جاسکتی ہے بشرطیکہ قید میں ان کا چال چلن تشفی بخش رہا ہو۔ انھوں نے استدعا کی کہ اب پندرہ کے عوض اٹھارہ سال گزر گئے۔ حکومت ہند نے یہ معاملہ حکومت پنجاب کو اس کی رائے کے لئے بھیج دیا۔ اس نے سفارش کی کہ ان کی مدت دراز گزر چکی اور بدلے ہوئے حالات کی بنا پر صرف عبدالرحیم ہی نہیں بلکہ دوسرے سزا یافتگان بھی جن کو بعد میں سزائیں دی گئی تھیں رہا کئے جائیں۔ تب حکومت ہند نے حکومت بنگال کو اس سفارش سے مطلع کر کے اس کی رائے طلب کی۔ مگر اس نے رہائی کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اس نے بیلیڈے کمشنر پٹنہ کی رائے کا حوالہ دیا جس سے مشورہ کیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ احمد اللہ کے تین بیٹے شہر میں موجود ہیں، اور اگر عبدالرحیم اور عبدالغفار واپس لائے گئے تو موقع ملنے پر فساد کھڑا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

تب نوآبادی سزا یافتگان انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ سے قیدیوں کے چال چلن پر رپورٹ دینے کو کہا گیا۔ اس میں بھی حکومت کو قیدیوں کے خلاف کوئی تقصیر نہ ملی۔ جزیرے میں تمام وہابی قیدیوں کا چال چلن نہایت محتاط، متدین اور بے داغ رہا تھا۔ احمد اللہ، یحییٰ علی[1] اور دیگر اسیر اپنے معمولی دفتری فرائض ختم کر کے اپنا وقت عبادت اور وعظ پر صرف کرتے تھے۔

نوآبادی انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ کی مرسلہ رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ اٹھارہ سال کی مدت میں قیدیوں کا چال چلن غیر معمولی طور پر عمدہ رہا۔ اس تمام مدت میں عبدالرحیم سے کوئی مقامی تقصیر بھی سرزد نہ ہوئی۔ عبدالغفار پر صرف ایک بار یکم فروری ۱۸۷۰ء کو غیر حاضری کے لئے جرمانہ ہوا۔ جعفر کو کسی ضمنی ضابطہ کی خلاف ورزی کے لئے ایک بار اسم نویسی اور تنبیہ کی گئی تھی۔ پھر بھی جعفر کا چال چلن مجموعی طور پر اچھا تھا، اور وہ نمایاں طور پر لائق اور ذہین آدمی ہے۔

---

[1] مترجم: اس تحقیقات کے وقت نہ مولانا احمد اللہ زندہ تھے نہ مولانا یحییٰ علی

وہابیوں کی رہائی اور پابندیاں: ان تمام تحقیقات کے ختم ہونے کے بعد حکومت ہند نے دسمبر ۱۸۸۲ء میں فیصلہ کیا کہ تمام وہابی قیدی جو اب تک سزائے قید بھگت رہے ہیں رہا کر دیئے جائیں انھیں اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے اس شرط کے ساتھ کہ پولیس کے زیر نگرانی رہیں اور رہنے سہنے میں مقامی حکومت کے عائد کردہ احکام کے پابند رہیں۔

۵ر فروری ۱۸۸۳ء کو چھ[۱] قیدی رہا کر دئے گئے۔ ان میں سے عبدالرحیم عبدالغفار پٹنہ کے تھے اور یہیں رہنے کی اجازت چاہی۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ان کو اس شہر میں واپس آنے دینے کی درخواست کی مخالفت کی۔ اس نے یہ عذر پیش کیا کہ "اگرچہ وہابی قضیہ دب گیا ہے اس فرقے کا مذہبی جوش اب بھی موجود ہے اس لئے بے شبہہ رہا کردہ وہابی باعث ہمدردی بن جائینگے . . . . اور ان کے فرضی جرائم کا چرچا اور ان کی سزایابی اور حبسِ دوام جذبات کو اُبھار دینگے۔ لیکن اس نے مزید لکھا کہ اگر حکومت ان کی رہائی کے ہی حق میں ہے تو بہتر یہ ہوگا کہ ان سے پٹنہ کے عوض بھاگلپور میں سکونت اختیار کرنے کو کہا جائے۔ پٹنہ جیسے کثیر آبادی کے شہر میں پولیس کی نگرانی مشکل سے قابل عمل ہوگی دانا پور اور پھلواری کے متصل شہر بھی وہابیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اور وہاں کی آمد و رفت کے روابط کا روکنا بھی مشکل ہوگا۔"

مگر حکومت نے اس خیال سے اتفاق نہ کیا اور پٹنہ کے وہابیوں کو اس شرط کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت دے دی گئی کہ اپنے نقل و حرکت کی باقاعدہ رپورٹ پولیس کو دیتے رہیں۔

عبدالرحیم کی مراجعت پٹنہ: چھ رہا شدہ وہابیوں میں سے عبدالرحیم اور چار اور قیدی اوائل مارچ ۱۸۸۳ء میں پورٹ بلیر سے روانہ ہوئے اور دوسرے مہینے میں پٹنہ پہنچے۔ ان سے کہا گیا کہ اقرار ناموں پر دستخط کر کے اقرار کریں کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ذاتی طور پر مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہاں حاضری دیں اور پہلے سے اجازت لئے بغیر کہیں باہر نہ جائیں۔ سات سال تک یہ حکم سختی سے نافذ رہا۔ اس کے بعد جزوی ڈھیلا کر دیا گیا۔

باقی دو قیدیوں میں سے مسعود نے پہلے اپنے معاملات کے ختم کرنے کے لئے چھ

---

[۱] یہ عبدالرحیم، مبارک علی، جعفر، الٰہی بخش، عبدالغفار تھے۔

ماہ اور ٹھہرنے کی اجازت چاہی اور دے دی گئی۔ بعد میں اس نے اس حکم میں ترمیم کرالی اور ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو ایس ایس نہارف جہاز سے رخصت ہوگیا۔

جعفر تھانیسری کی رہائی: جعفر کی رہائی کچھ دنوں کے لئے ملتوی رہی کیونکہ ان کی دوام حبس کی سزا یافتہ بیوی رہا نہ ہوئی تھی۔ آخر مئی ۱۸۸۳ء میں جعفر کی درخواست کے جواب میں وہ بھی رہا کر دی گئی اور وہ گھر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جعفر نے اپنی رخصت کے وقت چاہا کہ اپنے گھر کو مسجد میں تبدیل کر دیں اور مقامی مسلمانوں کے لئے وقف کر دیں۔ مگر ڈپٹی کمشنر برچ نے اس کی اجازت نہ دی تاکہ کہیں مزید وہابی سازشوں کا مرکز نہ بن جائے۔ آخر جعفر نومبر میں روانہ ہوئے اور سال کے آخر میں اپنے وطن پہنچ گئے۔

باب ۹

تحریک کا آخری منظر

وہابی جدوجہد ہندوستان میں ۱۸۶۹ء–۷۰ء

احمد اللہ کا مقدمہ وہابی تحریک کی تاریخ میں ایک سنگِ میل تھا۔ ان کی گرفتاری اور سزا نے ہندوستان میں وہابی تنظیم کو کمزور ضرور کر دیا مگر جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے یہ اس کے خاتمے کی نشان دہی نہیں کرتی بلکہ انجام کا آغاز تھی۔ وہابیوں کے کام کے جاری رہنے کا ثبوت ۱۸۶۵ء کے مقدمات کے بعد کئی اور مقدمات کے چلنے سے ملتا ہے۔ جو تفتیشیں ان مقدمات پر منتج ہوئیں وہ بہت ہمہ گیر تھیں اور عملاً قریب قریب سارے ملک پر چھا گئیں۔ پولیس کے حکام کے علاوہ بالخصوص ریلی ڈی آئی جی پولیس محکمہ خاص اعلیٰ افسر تحقیقات تھے۔ انھوں نے پیچیدہ تحقیقات میں اور پشاور، ڈھاکہ اور راولپنڈی، پٹنا جیسی بعید المسافت جگہوں میں الجھے ہوئے سلسلوں کا کھوج لگانے اور مربوط کرنے میں نمایاں مستعدی اور قابلیت دکھائی۔ اس وقت کے ریلی اور اُس کے نائبین نوبو کسٹو گھوش اور ایشری پرشاد کے روزنامچے اور ان کی تحقیقات کی رپورٹیں جو اس زمانے میں معلومات کے اصل ذرائع ہیں سرسری نظر میں بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایک دن یہ مورخہ ایبٹ آباد ہے، دوسرے ہفتے میں مورخہ مالدہ یا راج محل ہے۔ ذیل کے بیان میں مختلف وہابی مرکزوں کی تحقیقات کا ذکر ان کے سیاق و سباق اور ترتیب زمانی کے لحاظ سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس

موضوع کا مطالعہ دو نمایاں عنوانات کے تحت کیا گیا ہے (۱) برطانوی ہند کے اندر تحریک کی کارکردگی اور مقدمات، (۲) وہابیوں کی سرحدی ریاست میں اس کا آخری منظر۔

احمد اللہ کی گرفتاری پر وہابیوں میں بے چینی: احمد اللہ کی یک بیک گرفتاری اور پھر جزیرہ انڈمان میں قید عمر نے وہابیوں کو حواس باختہ اور کچھ مدت کے لئے تنظیم کو مفلوج ضرور کر دیا۔ تاہم حاجی پور ضلع مظفرپور کے حاجی مبارک علی نے کام پھر شروع کر دیا۔ وہ ولایت علی کے قدیم رفقا میں سے تھے۔ اُن سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے کے بعد مبارک علی پٹنہ چلے آئے اور ولایت علی کے مکان کے برابر ایک گھر میں رہ پڑے۔ احمد اللہ نے گرفتاری کے وقت تنظیم کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ کچھ عرصہ تک وہ احمد اللہ کی مدافعت اور مقدمہ سے متعلق دوسرے امور میں مصروف رہے۔ مقدمہ کے اختتام کے بعد تنظیم کی طرف توجہ کی۔

بہار اور بنگال میں بعض مرکز ابھی کام کر رہے تھے۔ مرکز مالدہ اور اس کے تنظیمی [illegible] کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ۱۸۶۵ء میں ان کے بیٹے امیرالدین کی کارروائیوں کی کچھ اطلاع حکام کو مل چکی تھی لیکن اس وقت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ غالباً اس لئے کہ حکام اس وقت احمد اللہ کے مقدمہ میں زیادہ الجھے ہوئے تھے۔

۱۸۶۸ء کے اواخر میں حکومت کی توجہ اُن مراکز خصوصاً راج محل[1] اور مالدہ کی جاری کارروائیوں کی طرف مبذول کی گئی۔ ریلی ڈی آئی جی پولیس نے اپنی دو مسلسل چٹھیوں میں ان دونوں مقامات پر وہابی کارروائیوں کی بنا اور طریقہ کار پر ایک مبسوط مفصل رپورٹ دی۔

راج محل کے ابراہیم منڈل:۔

اس علاقے میں وہابیوں کی کارروائیوں پر اطلاعات اور بھاگلپور کے کمشنر نے پہلی رپورٹ دی۔ دلموٹ اسسٹنٹ کمشنر راج محل نے ریلی کو ہدایت کی کہ وہ [illegible] اسسٹنٹ کمشنر پولیس کو موقع کی چھان بین ضلع مالدہ میں جہاں اصل مرکز معلوم ہوتا ہے متعین

---

[1] راج محل پہلے ضلع مالدہ میں تھا بعد میں وہ ضلع مرشد آباد میں شامل کر دیا گیا۔ [illegible] وہ بہار کے ضلع سنتھال پرگنہ [illegible] ضلع مالدہ اگرچہ بنگال میں ہے مگر راج محل علاقہ کے مقابل گنگا کے پار واقع ہے۔ دونوں مرکز باہم مل کر کام کر رہے تھے۔

کر دیا جائے۔ چنانچہ گھوش وہاں چلا گیا اور ایک ہفتہ تک تاجر پارچہ جات ریشمی کے بھیس میں قیام کر کے بہت سی اطلاعات اور شہادتیں جمع کیں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ ملکیچک سے متصل کئی گاؤں میں اس مقصد سے کھلم کھلا چندے جمع کئے جاتے تھے تاکہ اسلامی حکومت قائم کی جائے اور انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ اس نے یہ پتہ بھی لگایا کہ ایک شخص نذیر سردار اس علاقے میں چندوں کی تحصیل کے خاص کارکنوں میں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد گھوش نے دیکھا کہ اس کی شخصیت کا راز کھل گیا اور اب اس کے ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو وہ مجسٹریٹ مالدہ کے پاس گیا اور آٹھ آدمیوں[1] کے خلاف جن پر وہابیوں کے لئے چندے کی تحصیل کے کام میں ماخوذیت کا شبہہ تھا گرفتاری کے وارنٹوں کی درخواست کی۔

شہادتوں سے ظاہر ہوا کہ نذیر سردار ساکن قاضی گرام بستی کا سردار ہے، کئی سال سے (تحریک میں) عملی اور نمایاں حصہ لیتا رہا ہے اور یہ کہ اس نے بستی کے بہت سے آدمیوں کو مجاہد بننے کی ترغیب دی ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے چندوں کی تحصیل مختلف شکلوں میں ہوتی تھی۔ جو چندہ نہ دیتے ان کا سماجی بائیکاٹ (مقاطعہ) کیا جاتا۔

ابراہیم منڈل کی گرفتاری: شہادتوں سے ایک شخص ابراہیم منڈل کو بھی مرکز کے مددگار کی حیثیت سے جن کے پاس نذیر سردار ساری متحصلہ رقوم بھیج دیا کرتا تھا، جان لیا گیا۔ ابراہیم منڈل پاکرتیں ڈپٹی مجسٹریٹ کی عدالت کے قریب موضع اسلام پور میں رہتے تھے، جو ریلوے لائن سے کچھ دور نہ تھا۔ مجسٹریٹ مالدہ سے درخواست کی گئی کہ ابراہیم کے خلاف وارنٹ جاری کر دے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ خود براہ راست وارنٹ لے کر نہیں گیا تاکہ کہیں اس کی آہٹ پا کر ابراہیم نکل نہ بھاگے۔ اس نے گھوش کو سڑک سے اسلام پور بھیج دیا۔ گھوش

---

[1] یہ تھے نذیر سردار ساکن موضع قاضی گرام، عبدالواحد ساکن موضع ٹکرپور، گھورن خان ساکن موضع معظم پور، جمال الدین شیخ ساکن موضع کشور پور، منیر الدین ساکن موضع معظم پور، موکت لال ساکن موضع معظم پور، دکھو ساکن موضع آنا بیگی۔

ایک مسلمان معلّم کے بھیس میں گھوشن (معتّن) کی تلاش کے بہانے سے وہاں جا کر اتفاق
سے اُس کی مڈبھیڑ ابراہیم کے ایک بھتیجے سے ہوگئی جو سیدھا اسے اپنے چچا کے گھر لے گیا جو
مطلوب شکار تھا۔ لڑکے نے بتایا تھا کہ میرے چچا کسی معلّم کی اعانت کے لئے ہر طرح
میں سب سے موزوں آدمی ہیں۔ الغرض ابراہیم دو کانسٹبلوں کی مدد سے جو گھوش کے پیچھے پیچھے
آئے تھے گرفتار کر لئے گئے۔ اسسٹنٹ کمشنر ولموٹ اور اس کا نائب تیز بھی فی الفور پہنچ
گئے۔ وہ ابراہیم کی گرفتاری میں گھوش کی مدد کے لئے اپنے محل سے ہاتھی پر گئے تھے۔

وہابی تحریک سے متعلق شہادتیں: جو شہادتیں لی گئی تھیں ان کی روشنی میں ریلے نے
رپورٹ دی کہ دوسرے ضلعوں میں بھی مسلمانوں میں اسی طرح کی تحصیل و تبلیغ جاری ہے اور
جب تک اس مجنونانہ تحریک کو بند کرنے کے لئے عملی اقدامات نہ کئے جائیں اس کے دور دور
پھیلنے کا امکان ہے۔" اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ "اس تحریک میں کوئی بڑا
زمیندار یا کاشتکار شامل نہیں۔" زمین نہ رکھنے والے کاشتکاروں کو زیادہ تر یہ امید دلا کر
راغب کیا گیا کہ کامیابی کے بعد ان کی زمین پر سے لگان اٹھا دیا جائیگا۔ اس لئے قدرتاً
زمینداروں سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اس تحریک میں ساتھ دیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بہار اور بنگال میں ہمیشہ اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینے
والے زیادہ تر یہی بے زمین کاشتکار تھے۔ باراسات کی شورش میں بھی یہی لوگ پیش
پیش تھے۔ اگرچہ تحریک کی زیر سطح اقتصادی لہریں خصوصاً بنگال میں اس کے سیاسی
دھارے میں دب کر رہ گئیں (اور اس لئے ہنٹر اور اوکینلی جیسے مصنفین نے اس کی دم میں
مذہبی لیبل (چٹ) باندھ دیا) بہرحال وہ معنی خیز اور لائق توجہ ہیں۔

گرے کی تحقیقات: یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک نیل کا کاشتکار گرے ان تحقیقات
میں نمایاں طور پر وہابیوں کی شرکت اور اس کا بڑا مددگار تھا۔ باراسیٹ کے دور سے
بھی نیل کے کاشتکاروں کی غرض بہت کچھ متعلق تھی اور پہلا جوابی حملہ انہیں نے کیا تھا۔ وہ
وہابیوں کے اس علاقے کے کاشتکاروں میں کام کرنے اور اپنے مفاد پر اس کے ممکن
ردعمل سے اب تک متشوش تھے۔

وہابی تحریک کے متعلق رسائل: روپیہ تحصیل کرنے کے متعلق شہادت کے علاوہ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ باغیانہ رسالے بھی تقسیم کئے جا رہے تھے۔ مالدہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ پولیس نے جو رسائل پکڑے ہیں ان میں سے دو کا اس نے مطالعہ کیا۔ ایک تھا "تفسیر وآیہ" جو سنہ ۱۲۶۰ ہجری میں مہدی گنج میں طبع ہوا۔ یہ ایک بہت کثیر الاستعمال پارہ عم کی تفسیر تھی۔ دوسرا رسالہ مشرقی بنگال میں پٹنہ کے سازشیوں کے ایک نہایت سرگرم حامی ڈھاکہ کے حاجی بدرالدین کے مختلف مذہبی مسائل پر فتاوی کا مجموعہ تھا۔ یہ جہاں جنگجوؤں کی ترغیب کے لئے بڑی خوبی سے تیار و نشر کیا گیا تھا۔

مقدمہ قائم کرنے میں حکومت کی پس و پیش: آخر میں ریلی نے اپنی رپورٹ میں یہ اندازہ کیا کہ گرفتار شدہ لوگوں کو تعزیرات ہند کی دفعات ۱۲۱ اور ۱۲۲ کے تحت ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کرنے کی کوشش میں اعانت کا مجرم قرار دیں۔ اس نے اقرار کیا کہ اگرچہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ فراہم کردہ روپیہ ابلاغ و منتقلی کی منزل سے آگے گذر سکا لیکن اس مقصد کے لئے گرفتار شدہ آدمیوں کا طرز عمل قابل قدر شہادتوں سے ثابت ہے۔

صوبائی حکومت نے اس معاملہ کو گرفتار شدہ آدمیوں کے خلاف الزامات قائم کرنے کے لئے ثبوت کے لئے قانونی مشیر کے حوالہ کر دیا۔ اس نے جواب دیا کہ اگرچہ یہ واضح ہے کہ کئی اضلاع میں باغیانہ نفرت پھیلانے کی تبلیغ برابر جاری رہی لیکن تحصیل کردہ رقم کی آخری حوالگی کے متعلق کسی ثبوت کی غیر موجودگی باعث دشواری ہے۔ احمد اللہ کے مقدمے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جو اسی نوعیت کا تھا اس نے لکھا کہ اس مقدمے میں روپیہ کا کھوج پٹنہ سے سرحد تک لگا لیا گیا تھا۔ اس مقدمے میں یہ بات نہیں۔ اس نے شبہ ظاہر کیا کہ جب تک روپیہ کی روانگی کے متعلق مزید ثبوت مہیا نہ ہو تعزیرات ہند کی دفعات ۱۲۰ اور ۱۲۲ کے تحت ان پر الزامات عائد ہو سکتے ہیں۔ اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ ان تمام افسروں میں جو اس مقدمے میں کام کر رہے ہیں احمد اللہ کے مقدمے کی

مطبوعہ روداد کے نسخے تقسیم کر دئے۔ جائزہ کیونکہ وہابیوں کی تنظیم اور ان کے بعض سربراہوں کی گرفتاری اور قانونی چارہ جوئی کے موضوع پر یہ کارآمد رہا ہے۔

حکومت ایک قانونی دشواری سے دوچار ہوگئی۔ متذکرہ بالا اشخاص گرفتار تو کئے گئے تھے بعض بدیہی شہادتوں پر، مگر ان کے جرم کے واقعی ثبوت جمع کرنے کے لئے کئی مقامات میں بالتفصیل تفتیش چلانا ضروری تھا جب تک حکومت ہند سے ۱۸۱۸ء کے آئین ۳ کے لئے استجازہ کی جائے یہ سب اشخاص غیر معینہ مدت تک بند نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اس آئین نے جو قانونِ تحفظ ہند کا پیش خیمہ تھا، مرکزی حکومت کو آدمیوں کی احتیاطی نظر بندی، وہ ان کو جس مدت تک ضروری سمجھے مقدمہ چلائے بغیر زندان میں محبوس رکھنے کے لئے غیر معمولی اختیارات سے مسلح کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر نے حکومت ہند سے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ تحریک کے صرف سرکردہ کو گرفتار رکھا جائے اور باقی کو رہا کر دیا جائے مگر ان کمتر اشخاص کی حرکات پر نظر رکھی جائے۔ . . . .

. . . . لفٹنٹ گورنر نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ اگرچہ تحصیل کردہ رقوم کے سرحد پہنچنے کا کوئی ثبوت نہیں خود موضع اسلام پور میں ان لوگوں کے خاندان موجود ہیں جو سرحد پر آباد ہو گئے۔ ان کے خاندانوں کے ارکان کی پرداخت ابراہیم کی تحصیل کردہ رقوم سے کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں مقصد حقیقتاً ایک ہی تھا وہابیوں کی امداد۔ اس رائے کے مطابق لفٹنٹ گورنر نے حکم دیا کہ صرف ابراہیم منڈل اور نظیر سردار کو مقید رکھا جائے، باقی رہا کر دئے جائیں۔

ابراہیم منڈل سے ناروا سلوک: ابراہیم منڈل راج محل جیل میں قید کئے گئے۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھے مگر وہ ایک بہت چھوٹی سی مرطوب کوٹھری میں رکھے گئے جس کی تشریح خود جیل کے ڈاکٹر نے یوں کی ہے کہ "یہ مرطوب اور غیر ہوادار ہے، سونے کے لئے کوئی چبوترہ نہیں، اس سے متصل کوئی بیت الخلا نہیں، کوٹھری ہی کا ایک گوشہ اس مقصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس طریقے سے ہوا بعض اوقات اس کوٹھری ہی کو خوشبو کے [illegible] پر منحصر کرنا بالکل ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔" ملحوظ رہے کہ یہ تھا وہ سلوک جو

بھیج دیئے جاتے۔ اس نے انسپکٹر جنرل پولیس سے کہا کہ حکومت بنگال سے تحریک کرے
کہ وہ صوبہ مدراس و بمبئی کی حکومتوں سے رابطہ قائم کرے کہ ان علاقوں میں وہابیوں کی
کارروائیوں کی تحقیقات کرائے اور یہ بھی پتہ چلائے کہ ان کے اور بہار و بنگال کے
وہابیوں کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے۔ جنوبی مغربی ہندوستان میں اس تحریک کا مندرجہ
ذیل مختصر تذکرہ دونوں حکومتوں کی دو رپورٹوں پر مبنی ہے۔ اگرچہ یہ رپورٹیں ۱۸۶۵ء
میں وہابیوں کی عدم تحقیقات کے متعلق رودادوں کا ایک حصہ ہیں تاہم ایک نتیجہ مجموعہ
دستاویزات ہیں۔ رپلی کو خاص طور پر یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ ہند اور جنوب مغرب
کے وہابیوں کے درمیان کسی رابطے کا امکان موجود ہے۔ اس سوال کا جواب ملا کہ تحریکات
میں یہ تھا کہ اس مسئلہ پر کوئی نمایاں واضح شہادت موجود نہیں۔ ان سے رپلی نے جس طرح
شمالی اور مغربی علاقوں کا معائنہ کیا، ان علاقوں کا بذات خود نہیں کیا اور ان میں کوئی
دلچسپی نہ لی اور معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔

بہرحال وہابی جنوبی مغربی ہند کے ضلعوں میں کافی دیر تک موجود رہے۔ ان کا سب
کام جو اندرون ہندوستان میں وہابیوں کو کرنا تھا یعنی چندے جمع کرنا اور انگریزوں کے
خلاف لڑنے کو بھیجنا۔ سرگرمی سے ہوتے رہے۔ فوج میں تداخل، اپنے آدمیوں کے گھسنے
کا کام جو ۱۸۳۶ء میں شروع ہوا تھا۔ اب بھی جاری تھا۔ اخبار اور رسائل بھی چھپ کر
جاتے اور ان میں کثرت سے مضامین شائع کئے جاتے۔

وہابی مبلغ اسمٰعیل کی مدراس میں خدمات: انسپکٹر جنرل پولیس مدراس نے رپورٹ
دی کہ کچھ عرصے سے مدراس میں وہابی تحریک پر نگرانی رکھی جاتی رہی ہے۔ ۱۸۶۶ء میں ایک
شخص ...... مسمی اسمٰعیل جو پہلے ۱۲ دیسی فوج میں سپاہی تھا اور ایک پرجوش وہابی
مبلغ ہے ۱۸۱۹ء کے ضابطہ ۲ کے تحت (جو بنگال کے ۱۸۱۸ء کے ضابطہ ۳ کے مساوی ہے)
مدراس میں مقید ہے۔ وہ پہلے ۱۸۵۹ء میں بغاوت پھیلانے کی علت میں فوجی ملازمت سے
خارج کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں نگنور میں اس پر اس قسم کی حرکات کا شبہ ہوا۔ اس کے
بعد وہ برما چلا گیا جہاں وہ دیسی فوجوں میں وہابی تعلیمات کی تبلیغ کرتا رہا۔ اس نے وہ

تھیٹمیو (برما) سے کلکتہ چالان کر دیا گیا۔ اور پھر ۱۸۶۳ء میں اُس پر وزیرآباد پنجاب میں باغیانہ حرکات کا شبہہ کیا گیا۔ آخر ۱۸۶۶ء میں شمالی سرکار میں ایسی ہی حرکات کے لئے قید کر دیا گیا۔

وہابی مبلغ احمد اللہ کی بنگال میں کارروائیاں: ایک اور وہابی مبلغ جس نے مدراس کا خاص کر کے مدراس میں مقیم دیسی پیدل فوج کی رجمنٹ میں بہت کام کیا وہ بنگال کا ایک شخص مسمی احمد اللہ تھا۔ اس کی کارروائیوں نے بالخصوص فوج میں کچھ اعلیٰ فوجی حکام کو چونکا دیا۔ چنانچہ مدراس کے ایڈجوٹنٹ جنرل نے کمانڈر انچیف مدراس کی ہدایت پر مدراس کے تمام رجمنٹ افسروں کے نام حکم جاری کر دیا کہ "وہ ایک کٹر وہابی متوطن بنگال احمد اللہ سے ہوشیار رہیں جس کا اصل مقصد سپاہیوں کو بغاوت پر اکسانا ہے .... وہ ہر جگہ جہاں کہیں مدراس کی فوجیں ہیں گھومتا پھرتا اور باغیانہ پیغامات پہنچایا کرتا ہے۔"

احمد اللہ مبلغ کی رائے پور میں گرفتاری: احمد اللہ ۱۸۶۹ء میں رائے پور میں گرفتار کر لیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انسپکٹر جنرل پولیس صوبہ جات زیریں کے پاس اس کی گرفتاری کی رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص گذشتہ ستمبر میں رائے پور سے آیا تھا۔ بعض معروف وہابیوں سے ملے۔ پولیس افسر نے جن کے پاس ایڈجوٹنٹ جنرل مذکور کا گشتی حکمنامہ موجود تھا۔ ملزم کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد اُس نے اقرار کیا کہ ۱۸۶۰ء میں وہ وزیرآباد گیا تھا اور وہاں ۲۱ دیسی فوج کے کچھ جوانوں سے ملا تھا۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے یہ بھی بتایا کہ اب وہ رجمنٹ رائے پور میں مقیم ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ احمد اللہ اسمٰعیل خان کا پیر ہے جو ایک معروف وہابی تھا اور چند سال ہوئے ۲۸ مدراس دیسی فوج کے سپاہیوں میں بغاوت کی تبلیغ کے لئے برہانپور میں گرفتار کیا گیا اور قید عمر کی سزا دیکر کوئمبٹور کے جیل میں مقید کیا گیا۔ احمد اللہ ۱۸۶۴ء میں ایلور، ضلع گوداوری بھی گیا تھا اور اُس وقت سے وہابیت روبہ ترقی ہے۔

احمد اللہ نے بیان دیا کہ وہ کپڑے، چمڑے اور ہڈی کی تجارت کرتا ہے۔ بمبئی سے کپڑے خریدتا اور مختلف جگہوں میں بیچتا ہے۔ اس بیان سے اس کی لگاتار سیر و سیاحت کی توجیہ تو ہو گئی۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ تبلیغی کاموں کو اصلی کاروباری کاموں کے ساتھ

خلط ملط کر دینے کی وہابی چال بھی چلتا تھا۔ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی باقاعدہ سوداگری کو تسلی بخش طور پر ثابت کر سکے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈائیور نے احمد اللہ کے متعلق مزید تفصیلی معلومات طلب کیں جو اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری میں کام دے سکیں۔ ریلی نے جواب[1] دیا کہ مجھے پٹنہ کے علی کریم سے احمد اللہ کے متعلق کچھ اطلاعات ملی ہیں۔ ۱۸۵۰-۵۲ء کی تحریک میں علی کریم بہار کے مشہور سربراہوں میں تھے۔ وہ جون ۱۸۵۱ء کو بہار سے نکل بھاگے تھے مگر کھیرا اور مانڈھ میں کئی لڑائیوں میں لڑے تھے۔ اس تحریک کے فرو ہونے کے بعد وہ بھوپال چلے گئے۔ ان کی گرفتاری کا وارنٹ جو بہار میں تھا بیگم بھوپال کی سفارش سے منسوخ کر لیا گیا۔ وہ واپس آئے اور پٹنہ میں آباد ہو گئے۔ پٹنہ واپس آکر انھوں نے وہابیوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے ریلی کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ریلی نے سفارش کی کہ حکومت ان کی پیشکش قبول کرے لیکن نامنظور کر دی گئی۔ ریلی نے لکھا کہ اب علی کریم سے احمد اللہ کے متعلق کسی مزید اطلاع کی توقع نہیں لیکن احمد اللہ کو گرفتار کرنے کے لئے ضابطہ ۳ مجریہ ۱۸۱۸ء کے تحت کافی شہادت موجود ہے۔

انسپکٹر جنرل مدراس نے مدراس میں وہابیوں کی کارروائیوں پر اپنے عام تاثر کا اظہار کرتے ہوئے رپورٹ دی کہ یہ زیادہ تر ان کے مذہبی عقائد سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ کہ اگرچہ انھوں نے کسی فعل کا علانیہ ارتکاب تو نہیں کیا۔ ”لیکن ممکن ہے کہ جبری عیسائی قانون کے تحت کبھی کبھی ان کے طبعی جذبات اُبل پڑیں“

شہر مدراس میں وہابیوں نے ایک اخبار بیچی (میٹوک) کے نام سے نکالا جس کے خریدار تمام صوبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ دوسری جگہوں میں بھی تحریک کی رفتار سے تعلق رکھتے تھے ورنہ ایک دور دراز کے شہر میں ایک گمنام اخبار کی خریداری نہ کرتے۔

---

[1] جے۔ تیچ۔ ریلی ڈی آئی جی کی چٹھی بنام آئی جی پولیس ایل پی نمبر ۲۰۳ مورخہ کلکتہ یکم دسمبر ۱۸۶۹ء

صوبہ بمبئی کے پولیس کمشنروں کی رپورٹیں: حکومت بنگال کے ایک اسی قسم کے سوال کے جواب میں حکومت بمبئی نے رپورٹ دی کہ صوبہ (بمبئی) کے مختلف پولیس کمشنروں نے اپنے اپنے علاقوں کے متعلق مندرجہ ذیل رپورٹ دی ہے:۔

شہر بمبئی کے پولیس کمشنر نے رپورٹ دی ہے کہ اس شہر میں ایک سو کے قریب وہابی ہیں۔ کسی شہادت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بنگال میں ان کے ہم وطنوں سے ان کا کوئی تعلق ہے۔

کیرا کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رپورٹ دی ہے کہ چند برس ہوئے کچھ وہابیوں نے نڈیاد میں ایک مسجد قائم کی تھی، لیکن بوہروں نے ان کو نکال دیا۔ سورت اور بہروچ میں بھی وہابی اثر کچھ زیادہ نہیں کیونکہ ان کے فرقے کے خلاف مقامی آبادی کے جذبات اتنے مخالف نہیں۔ لیکن جب نربدا کے پاس ریل کا پل مرمت کیا جا رہا تھا تو وہاں کے کچھ کاریگر (غیر بمبئی والے) جیسا کہ کہا جاتا ہے وہابی بھی تھے۔ کام ختم ہونے کے بعد چلے گئے۔

جنوبی علاقے کے کمشنر پولیس نے رپورٹ دی کہ ضلع کلادگی میں کچھ وہابی خاندان بیکوٹ میں رہتے ہیں، جو زیادہ تر بوہرے ہیں۔

پنچ محل کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رپورٹ دی کہ کوئی مدت ہوئے ۱۸۶۲ء میں وہابیوں کی ایک معتدبہ تعداد اپنے شریک ریاست کے ساتھ ٹونک سے گودھرا آئی تھی۔

پونا میں کچھ عرصہ ہوا ایک شخص برکت اللہ ساکن فراشخانہ آیا اور جہاد کی تبلیغ کی۔

"پونا میں کسی مولوی کو اس زور شور سے ایسی تیز زبان میں وعظ کہتے نہیں سنا گیا جیسا اس شخص نے کیا۔ اسے ایک ایسی رجمنٹ کے احاطے سے نکل جانے کی تنبیہ بھی کی گئی۔ وہ جگہ چھوڑنے کے بعد سے نکل

> تو گیا مگر بمبئی چلا گیا جہاں ایک متمول وہابی عنایت اللہ کے پاس ٹھہر گیا۔ چند وہابی جو شہر اور صدر بازار میں رہتے ہیں وہ اپنے مشغلہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ بیجاپور سے بھی رپورٹ ملی ہے کہ مدراس کی طرف سے ایک وہابی مولوی بار آیا تھا۔ زیادہ تر مقامی وہابی جونہیوں سے لئے گئے ہیں مذکورہ بالا تحقیقات کے ساتھ ساتھ بمقام پٹنہ میں بھی تفتیش جاری رہی۔

خورشید علی اور مبارک علی کی گرفتاری: پولیس کو ایک مخبر سے معلوم ہوا کہ احمد اللہ کے مقدمہ کے سرکاری گواہ الٰہی بخش متوفی کا بھائی خورشید علی جو اب الٰہی بخش کے بیٹے کی طرف سے اس کی دوکان کی نگرانی کرتا ہے وہ شخص ہے جس کی معرفت مبارک علی وہابی سرحد کو روپے بھیجتے ہیں۔ الٰہی بخش کی جوتوں کی دوکان متعلق بیرونی اجناس سے جوتے خریدتا اور اس کام کے لئے روپے بھیجا کرتا۔ ایک بڑا اہم واسطہ تھی اسی دوکان کو جس کی پہلے پولیس تلاشی لے چکی تھی یہ سمجھ کر کہ حکام اب اس پر شبہ نہ کریں گے منتخب کرنے کے لئے وہابی نے مبارک علی کی ڈھٹائی پر رائے زنی کی خورشید کی دوکان کی تلاشی لی گئی اور کاغذات پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان سے مختلف رقوم کے جمع کرنے اور سنہ ۱۲۸۴، سنہ ۱۲۸۵ ہجری (سنہ ۱۸۶۶) میں دو رقوم ۲۰۰۷۹ روپیہ اور ۴۰۹ روپیہ کی ترسیل کا پتہ چلا۔ ان ترسیلات کی کوئی توجیہہ پیش کی گئی نہ کاروبار کے مرہون منت، لیکن منافع کی تائید و توثیق کی۔ چنانچہ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ کو خورشید علی اور مبارک علی دونوں گرفتار کر لئے گئے۔

دہلی میں تحقیقات:

پٹنہ میں تحقیقات کے دوران میں انسپکٹر پرشاد کو معلوم ہوا کہ مبارک علی نے ایک شخص امیر علی ساکن باقر گنج (بنگال) کو جو دہلی میں مقیم تھا چند خط لکھے تھے۔ انسپکٹر پرشاد فوراً دہلی پہنچا۔ امیر علی کا پتہ لگا کر اس کے گھر کی تلاشی کرائی اور کاغذات پر قبضہ کر لیا۔ اس تلاشی سے بعض عجیب نتائج حاصل ہوئے اور پنجاب، سرحد شمالی مغربی اور بہار میں مختلف مقامات میں وہابیوں کے متعلق اہم سراغ ملے۔

امید علی نے اقرار کیا کہ اس کو مبارک علی سے خطوط اور روپے وصول ہوئے تھے اور سرحد سے اس کے نام آئے ہوئے خطوط بھی اس کے پاس بھیجے تھے۔ اس نے چند وہابی کار پردازوں کے نام بھی بتائے جو سرحد کو روپے بھیجتے تھے۔ ان میں مبارک علی عظیم آبادی کا بیٹا تبارک علی (معروف بہ قادر بخش) بھی شامل تھا۔ چنانچہ تبارک علی پٹنہ میں گرفتار کر لیا گیا۔

شاہزادہ فیروز شاہ: امید علی نے ایک اور معنی خیز اطلاع دی۔ اس نے کہا کہ ایک روز جب میں اپنے رفیق کار محمد امین کی دوکان پر بیٹھا تھا میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا جو سرحد سے آئے تھے۔ ان کے بارے میں دریافت کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ وہ شاہزادہ فیروز شاہ[1] کے پاس سے آئے ہیں جو سرحد پر رہتے ہیں۔ وہ فیروز شاہ کی طرف سے دکن کے بعض راجاؤں کے نام خطوط لائے ہیں۔ شاہزادے نے ان کو مدد کے اُن وعدوں کی یاد دہانی کی ہے جو انھوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں ان سے (شہزادے سے) کیے تھے اور ان سے درخواست کی ہے کہ دریائے آکسس (جیحون) پر کُن سے آملیں۔" ان خطوط پر فیروز شاہ کی مہریں لگی تھیں۔ مہر قطر میں بالشت بھر تھی۔ ایک دائرے میں خانوادۂ تیموریہ کے کل بادشاہوں کے نام تھے اور خود فیروز شاہ کا نام مرکز میں تھا۔ یہ خط فیروز شاہ کے بھائی شہزادہ ایزاد (ایزد) بخش کو پہنچانے تھے جو اپنی ماں کے ساتھ دہلی میں ایک جھونپڑے میں رہتا تھا اور ایک پرت کی دکان[2] رکھتا تھا۔ سوال کرنے پر ایزاد بخش نے کہا کہ میں بھائی کے قاصدوں کے ہاتھ سے خط لینا نہیں چاہتا۔ آخر نذیر حسین کے ہاں جاتے ہوئے جو دہلی میں پھاٹک حبش خان کے قریب رہتے تھے راستے میں ان سے ملنے پر رضامند ہو گیا۔

---

[1] فیروز شاہ اکبر ثانی کا بھتیجا اور بہادر شاہ ثانی کا چچیرا بھائی تھا۔ ۱۸۵۷ء میں مغربی حج کو گیا ہوا تھا اور اس وقت لوٹا جب کہ شورش جاری تھی۔ اس میں اس نے نمایاں حصہ لیا تھا اور اس کے انتقال کے بعد ۱۸۶۸ء میں سرحد کے علاقے میں چلا گیا اور کچھ عرصہ تک ستھانہ کے پاس رہا۔ [2] میں نے شہزادہ ایزاد بخش کے بارے میں کچھ دہلی میں کوئی شخص بھی دہلی کے ایک شاہزادے سے گز بھر لٹھا خرید سکتا ہے۔ دنیا کا جاہ و جلال یوں ہی گذر جاتا ہے۔

نذیر حسین محدث دہلوی: نذیر حسین تفسیر اور فقہ اسلامی کے مشہور استاد شروع میں سورج گڑھ ضلع مونگیر کے متوطن تھے۔ بعد میں وہ دہلی میں جا بسے۔ شروع میں سید احمد سے ان کی ملاقات نے ان کو کچھ متاثر اور اس تحریک کا ہمدرد بنایا ہوگا گو اس کا کوئی یقینی ثبوت نظر نہیں آتا۔ مگر امیر علی کے بیان نے نذیر حسین کو یہ کہہ کر صاف صاف ملوث کر لیا کہ فیروز شاہ کے قاصد آئے تھے تو وہ بھی موجود تھے۔ نذیر حسین کے گھر کی تلاشی سے بہت مشتبہ قسم کے خطوط نکلے۔ ان میں سے بعض معروف وہابیوں جیسے جعفر تھانیسری اور مبارک علی عظیم آبادی کے خطوط بھی نذیر حسین کے نام تھے۔ ایک خط نذیر حسین کا لکھا ہوا سرحد کے وہابی سردار عبداللہ کے نام بھی تھا۔ ریلی نے ضابطہ ۳ کے تحت ان کی گرفتاری کی سفارش کی لیکن وہ ایک مشہور و معروف عالم تھے، اور ان کے خلاف کسی اطمینان بخش شہادت کے بغیر حکومت اس انتہائی اقدام سے متامل تھی۔ حکومت نے اس معاملے کی رپورٹ حکومت پنجاب کو (جس کے ماتحت خطۂ دہلی تھا) بھیج دی اور درخواست کی کہ وہ جو اقدام مناسب سمجھے کرے۔ حکومت پنجاب نے ان کو احتیاطی طور پر کچھ دن جیل میں قید رکھنے کا حکم نافذ کیا مگر اس کے فوراً بعد ہی ان کو رہا کر دیا۔

دسمبر ۱۸۶۵ء میں عبداللہ نے راولپنڈی میں جو بیان دیا تھا، اس کے مطابق نذیر حسین دہلی میں وہابی کارکنوں کے سردار تھے۔ رانی محل کے ایک درگوہ نے بھی شہادت دی کہ نذیر حسین نے اس کو سرحد جانے پر آمادہ کیا تھا۔ ریلی نے سفارش کی کہ نذیر حسین کے معاملے کی دوبارہ جانچ کی جائے اور گواہوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ کاغذات حکومت پنجاب کو بھیجے گئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مگر بعد کی تحقیقات میں وہ نمایاں طور پر نظر آئے۔

امیر علی کی گرفتاری: امیر علی کی بعض اور آدمیوں کے ساتھ احتیاطی نظربندی کی گئی۔ ایک اور ملزم محمد امین یا امین الدین بھی جو باقر گنج کا باشندہ تھا اور امیر علی کی گرفتاری کے بعد بھاگ کر ڈھاکہ چلا گیا تھا گرفتار کر لیا گیا۔

دہلی کے مجسٹریٹ کارنسٹن نے جس نے امیر علی اور دوسروں کے بیان قلمبند کیے

تھے رپورٹ دی کہ امید علی نے دوسرے صوبوں میں وہابی کارپردازوں کے متعلق جو بیانات بہم پہنچائے ہیں ان پر کام کرنا چاہیے اور اس دوران میں امید علی کو قید رکھنا اور باقی کو رہا کر دینا چاہیے۔

امیر الدین، ساکن مالدہ:

پولیس جب ابراہیم منڈل کی گرفتاری کے سلسلے میں مالدہ میں تھی اس کو معلوم ہوا کہ مالدہ کے سب سے با اثر لوگوں میں ابراہیم منڈل کے بعد دوسرا نمبر ایک شخص امیر الدین ساکن موضع سندیا نرائن پور کا ہے۔ اس کی سرگرمیاں بہت عرصے سے جاری ہیں اور پولیس ان سے ناواقف نہیں۔ مارچ ۱۸۶۵ء میں کمشنر کو ہدایت کی گئی کہ مالدہ جائے، وہاں جا کر انہوں نے ۲۰ مارچ ۱۸۶۵ء کو امیر الدین کو گرفتار کر لیا۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ اس موقعہ پر بھی یہ اطلاع کہ جس ضلع میں گرے (متذکرہ بالا) کے نام سے واقف تھے وہاں نیل والوں کے جھگڑوں میں امیر الدین ایک نہایت مستعد کارکن پایا گیا تھا جو برسوں سے کام کر رہا تھا۔ اس پر مقدمہ چلانے کے لئے حکومت کی منظوری کے انتظار کے دوران میں ہی وہ گرفتار کر لیا گیا۔ مالدہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ دی کہ سردست اس پر الزام عائد نہیں کیا جا رہا ہے اور اس کے خلاف تحقیقات ابتدائی کارروائی کی جا رہی ہے تاکہ بعد میں اس پر باقاعدہ مقدمہ چلانے کے لئے حکومت حلفیہ شہادت مہیا کر لے۔

لفٹننٹ گورنر بنگال نے مختلف مقامات میں ان تمام تفتیشوں پر حکومت ہند کو رپورٹ دیتے ہوئے ایک چٹھی میں رائے ظاہر کی کہ "وہابی تحریک نہایت پیچیدہ و شاخ در شاخ ہے۔ اس کے کارپرداز سہارنپور، جہلم، رڑکی، دانا پور، اور مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔" لفٹننٹ گورنر کو شبہ تھا کہ ان مشتبہ لوگوں کے خلاف مقدمہ کی کارروائی فوجداری عدالتوں میں کامیابی سے چل سکے گی۔ اس کی رائے تھی کہ تعزیرات ہند میں بصورت موجودہ کوئی ایسی دفعہ نہیں جس کی رو سے اس قسم کے افعال کا جو وہابیوں سے سرزد ہوئے مقابلہ اور تدارک کیا جا سکے۔ نیز حکام کی درگت کی ان لفظوں میں تشریح کی

ہو جانے کا احتمال ظاہر کیا تھا۔ وہ تبارک علی ولد مبارک علی کا خسر بھی تھا اور دونوں کے دونوں جانے بوجھے وہابی تھے اور گرفتاروں میں تھے چنانچہ ضابطہ کے تحت اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا اور ۱۴ر جون ۱۸۶۶ء کو اسے گرفتار کر کے ڈیگھا جیل میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں انسپکٹر جنرل پولیس کی درخواست پر وہ پٹنہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے کچھ ہی بعد حاجی دین محمد جب سرحد شمالی مغرب سے واپس آیا ہوا تھا تاکہ وہاں کے مقامی آدمیوں کو تحصیل زر کے کام میں غفلت سے چوکنا کرے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ مگر جب وہ دو کانسٹیبلوں کی حراست میں دہلی بھیجا جا رہا تھا تو چلتی ریل سے کود کر نکل بھاگا۔

امیر خاں اور حشمت داد خاں:

پیر محمد کے متعلق جو اطلاعات فراہم ہوئیں ان میں کئی آدمی ملوث ہو گئے۔ ان میں پٹنہ کے مشہور و معروف سوداگران چرم امیر خاں اور حشمت داد خاں بھی شامل تھے۔ یہ لوگ بہت پہلے سے ان کی طرف سے مشکوک تھے۔ ان کے بارے میں رپورٹ تھی کہ جب برکت علی کو نیک چلنی کے مچلکے دینے کو کہا گیا تھا تو یہی لوگ ضامن ہوئے تھے۔ اب صاف صاف ثبوت بھی ہاتھ آ گئے جن میں امیر خاں کا ایک خط بھی تھا۔

ترسیل زر کے لئے وہابیوں کا طریقہ کار: پیر محمد کی گرفتاری کے موقع پر بہت لوگوں نے شہادت دی تھی۔ ان میں سے شیخ جھگڑو کا بیان خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے روپے کی ترسیل میں وہابیوں کے طریق کار اور بعض مخصوص سونپے ہوئے علاقوں کے انکشافات ہوتے ہیں۔ گواہ نے اور باتوں کے ساتھ یہ اظہار بھی دیا کہ روپے سورت کارکنوں کی معرفت بھی بھیجے جاتے تھے۔ ان پر اشتباہ کا امکان کم تھا۔ آدمی الگ الگ دستوں اور رجمنٹوں کے سپاہیوں کے ساتھ کوچ کے دوران بھیجنا بھی ایک عام ترکیب تھی۔ ایسے موقعوں پر یہ وہابی انگریزی لشکریوں کے شاگرد پیشہ کی صورت اور طور طریقہ اختیار کر لیتے۔

وہابی منصوبوں میں دیسی رجمنٹوں کا کردار: یہ بیان اس بات کا بھی مزید ثبوت مہیا کرتا ہے کہ عملی منصوبے میں دیسی رجمنٹیں اہم مقام رکھتی تھیں۔ سپاہیوں پر ہوشیاری سے اپنے اعتقاد تو کھو دیتے ہی تھے رجمنٹوں کی نقل و حرکت سے بھی ایک نہایت دشوار اور خطرناک کام میں مدد لیتے تھے۔ وہابی دیرانہ چالوں کے قائل تھے، فوجی دستوں کے ساتھ کوچ کرتے ہوتے تو فوج کے ساتھ ساتھ دشمن کے کارکن (مخبروں) اور غداروں سے چوکنے رہتے۔

جمگرٹ د نے مزید بتایا کہ حاجی دین محمد اور کریم بخش حاجی پور اور علی گنج سیوان میں، عبدالرحمٰن داناپوری (ہنبیرا)، سلطان پور اور ٹھٹھ میں (جو سب پٹنہ کے ڈویژن میں ہیں) اور خدا بخش پرانے داناپور اور رسلی گنج میں تحصیل کرتے۔ مجبور خان اور محمد وخان بھی آس پاس کے علاقوں میں چندہ جمع کرتے تھے۔

داناپور، مالدہ اور کلکتہ میں گرفتاریاں: ان تفتیشوں کے بعد داناپور کے تقریباً ایک درجن اشخاص اور سوداگران چرم امیر خاں اور حشمت داد خاں ضابطہ ٣ کے تحت گرفتار کرائے گئے۔ مالدہ کے امیر الدین پر بھی جو پہلے گرفتار کئے جا چکے تھے ضابطہ ٣ عائد کیا گیا۔ حشمت داد خاں اور ان کے مختار الٰہی بخش اس وقت پٹنہ میں تھے لیکن فوراً گرفتار نہیں کئے گئے تاکہ کلکتہ میں پرانے شریک کاروبار امیر خاں چوکنے نہ ہو جائیں۔ ان کو ١٩ جولائی ١٨٦٥ء کو کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔ اور پٹنہ جیل میں لایا گیا مگر جلد ہی ان کو علی پور کلکتہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں حشمت داد خاں اور ان کے مختار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

کرامت علی کے اہم خطوط کی جانچ پڑتال: تحقیقات کے دوران ایشری پرشاد کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سرحد شمالی مغربی میں وہابیوں کے خفیہ خطوط کرامت علی کے ذریعہ سے روانہ کئے گئے تھے۔ کرامت علی کو ان خطوط کی رسد دلی اور پٹنہ میں متعلق شخص تک پہنچانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ بھی تعینات کیا گیا تھا۔ شبہ تھا کہ یہ خطوط بکسر (ضلع شاہ آباد) کے ڈاک خانے سے

علاقوں میں کئی گاؤں میں ایسے لوگ ہیں جن کے نام ایسے خطوط آتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل
پولیس نے ان خطوط کی جانچ پڑتال کے اختیار کی درخواست کی، مگر صوبائی حکومت نے
اس انتہائی اقدام کی ضرورت کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر جب اس سوال پر صوبائی حکومت
ہند سے رجوع کیا گیا تو اس نے پولیس کے افسر اعلیٰ کی درخواست منظور کرلی اور پوسٹ
ماسٹر جنرل کو ہدایت کی کہ وہ متعلق پوسٹ ماسٹروں کو حکم دے کہ ان کے ڈاکخانوں
سے گذرنے والے خطوط کا سنسر (جانچ پڑتال) ہونے دے۔ اسی طرح کمشنر اودھ کو تنبیہ
دیا گیا۔ اس مدت میں بہت سے خطوط پر قبضہ کیا گیا اور ان کی جانچ پڑتال کی گئی۔

واعظ الحق کی گرفتاری: واعظ الحق جن کو ٹیلر نے ۱۸۵۷ء میں گرفتار کیا تھا اب
پھر وہ شبہ میں پکڑ لئے گئے۔ اپنی پہلی رہائی کے بعد وہ تجارت پیشہ زندگی پر آگئے
تھے۔ چونکہ روپیہ سرحد شمالی مغربی کو زیادہ تر مکہ ہی کے راستے سے بھیجا جاتا تھا
اس لئے واعظ الحق پر شبہ کیا گیا۔ واعظ الحق کے خلاف ان کے بھتیجے عزیز الحق نے
اطلاع درج کرائی تھی۔ کمشنر نے ان الزامات کی پوری تحقیقات کی مگر ان کی شرکت کے
متعلق وہ پوری طرح متیقن نہ ہوا۔

ایلی کی روانگی پنجاب: بہار اور بنگال میں تحقیقات کی مکمل تصویر اب تک مکمل
ہو چکی تھی اور تحریک کے اکثر سربرآوردہ سردار گرفتار کئے جا چکے تھے۔ مگر دوسرے
مقامات خصوصاً پنجاب اور سرحد شمالی و مغربی میں تفتیشیں اب بھی جاری رکھنی
تھیں۔ اس لئے ایلی پنجاب روانہ ہوا۔

بہار اور بنگال میں گرفتار شدہ اشخاص کے خلاف مقدمات دائر نہیں کئے گئے
تھے کیونکہ اس سے پہلے شمال و مغرب میں تفتیشوں کی تکمیل ضروری سمجھی گئی۔ تفتیشیں
ایک دوسرے میں گتھی ہوئی تھیں، اور حکومت چاہتی تھی کہ مقدمے چلانے سے پہلے
جتنی اطلاعات مہیا ہو سکیں ان سے اپنے آپ کو مسلح کر لے۔ اس سے ان لوگوں
کی دسمبر ۱۸۶۸ء سے جولائی ۱۸۶۹ء تک گرفتاری اور ان کے خلاف اکتوبر ۱۸۷۰ء
سے مارچ ۱۸۷۱ء تک کے درمیان غیر معمولی تاخیر کا سبب واضح ہو جاتا ہے۔

کا پہلے ذکر ہو چکا اس بیان نے شمالی بہار خصوصاً ضلع ترہٹ میں جسے تقریباً اب تک پولیس افسروں نے ہاتھ نہیں لگایا اور جہاں سے معتد بہ رقوم رسال کی گئیں، وہابی تنظیم کے متعلق قیمتی اطلاعات بہم پہنچائیں اور پنجاب وغیرہ میں بھی وہابی کارپردازوں کے بارے میں اطلاع مہیا کی۔

عبداللہ نے اور باتوں کے ساتھ یہ اظہار بھی دیا کہ احمد اللہ ساکن مظفر پور ولایت علی کا ایک خلیفہ، ترہٹ کا ایک با اثر وہابی ہے۔ اور بارہ سو روپے سالانہ چندہ دیا کرتا ہے۔ ضلع میں اس کے بہت سے مرید اور کارکن ہیں، نور بخش اور حافظ جعفر علی ساکن محمد پور مظفر پور، مصطفیٰ علی ساکن دربھنگہ، عابد حسین ساکن موضع شیوہر (دربھنگہ)، اور شیخ محمد ان علی ساکن موضع مہنار (دربھنگہ) وہ مقامی سردار ہیں جو باقاعدہ پابندی کے ساتھ مرکز پٹنہ کو روپے بھیجتے رہتے ہیں۔ مظفر پور اور شیر گھاٹی (گیا) کے روپے پیر محمد فراہم کرتا ہے۔ ان کارپردازوں میں جو یہ رقوم سرحد کو پہنچاتے ہیں مولا بخش، احمد علی عظیم آبادی اور نظام الدین لکھنوی سب سے زیادہ معتبر اور تجربہ کار ہیں۔ عبدالحق ساکن موضع گڑھا مونگیر، اور عبدالغنی ایک اور معتمد کارپرداز ہیں۔

تحریک کے سرپرستوں میں امیر خاں اور نور آور خاں [illegible] سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ دس الذکر کے چندے کی رقم بارہ سو روپیہ سالانہ تھی۔ عبداللہ نے جب سرحد کو ہجرت کی تھی تو امیر خاں نے اسے (مجھے) سات ہزار روپے دئے تھے۔ تحریک کے زیادہ اہم سرپرست نواب ٹونک ہیں۔ ٹونک میں سید احمد کے بھتیجے محمد اسمعیل اور عبدالرحمن نواب ٹونک سے روپے لیتے اور سرحد کو بھیج دیتے ہیں۔

اس سے چند ماہ قبل ۱۸۶۳ء میں حکومت پنجاب نے حکومت بنگال کو کمشنر راولپنڈی کی ایک چٹھی بھیجی تھی جس میں ایک شخص مسمی فخر الدین [illegible] کی گرفتاری کی خبر دی تھی جس پر وہابی کارکن ہونے کا شبہ تھا۔

پنجاب میں وہابی کارکنوں کی گرفتاری: عبداللہ کے بیان میں معتمد کارپردازوں میں پنجاب کے کارکنوں کا ذکر حسب ذیل ہے:

یا تحریک کے کام میں عام طور پر تعاون کرنے میں شرکت نہ کریں ان کے خلاف سماجی مقاطعہ کی دہشتناک سزا موثر طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ سماجی مقاطعہ کی دھمکی جسے اُس نے حقہ پانی بند کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے بل دیہ تیوں میں تخویف کا ایک ہیتناک آلہ درست ... ور وہابی اس سے پورا کام لے رہے ہیں۔ بالخصوص غلام شاہ کے بارے میں رپٹ نے کہا پہلے وہ کلکتہ کا باشندہ تھا، عبدالجبار کا مرید ہو گیا اور سترہ برس ہوئے کہ [illegible] کے علاقے میں تعینات کیا گیا، جب سے وہ یہاں مقیم ہے، درزی کی دوکان کھول رکھی ہے۔ مگر درحقیقت وہ ابراہیم منڈل کے سب سے قابل [illegible] اور روپیہ تحصیل کرنے اور ہم عقیدہ بنانے میں اُس کی بڑی مدد کی ہے [illegible] کی گرفتاری کے بعد سے وہی مقامی سردار تھا۔

ابراہیم کا بھتیجا مولا بخش (جو غلام شاہ کے ساتھ گرفتار ہوا اور بعد میں کمشنر کے حکم سے رہا کر دیا گیا) ایک دوسرا اہم وہابی کارندہ تھا۔ وہ صرف [illegible] پرگنہ میں سرگرم کارکن نہ تھا بلکہ ضلع [illegible] میں بغاوت کی تبلیغ کرتا تھا۔ رپٹ نے غلام شاہ کے ضابطہ ۳ کے تحت گرفتار کرنے کی سفارش کی بلکہ مولا بخش کے دوبارہ گرفتار کر لینے پر بھی زور دیا۔

موضع ہنس پوکھر کے متعلق رپورٹ: ریلی ماند بھی گیا اسسٹنٹ کمشنر ضلع موضع ہنس پوکھر بغاوت کا دوسرا سرگرم مرکز ہے۔ اُس نے یاد دلایا کہ ۱۸۶۵ء ہی میں اس گاؤں کے وہابیوں کی کارروائیوں کی طرف حکومت کی توجہ منعطف کی جا چکی ہے۔ اب تک گاؤں کی مسجد میں جہاد کے لئے تحصیل جاری ہے۔ یہاں کے باشندے مرکز سے جہاں اس گاؤں سے رنگروٹوں کی بہت بڑی تعداد مقیم ہے کثرت سے مراسلت رکھتے ہیں۔ امانت منڈل مقامی سردار ہے۔ میرے خیال سے اس کی گرفتاری سے باغیانہ کارروائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس نے ضابطہ ۳ کے تحت اس کی گرفتاری کی سفارش کی۔ اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ عام باشندوں کی تنبیہ کے لئے اس جگہ رنگروٹ بند [illegible]

مشتبہ وہابیوں کی نظر بندی: آئندہ چند مہینوں تک بہار اور بنگال میں [illegible] سے مشتبہ وہابیوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ مئی ۱۸۶۸ء میں امیر محمد مقدمہ [illegible] کے [illegible]

استغاثہ سے ریلی کو اطلاع ملی کہ تین آدمی شرف اللہ، نظیر محمد ساکن موضع دھنارو ضلع رنگپور اور نظیر محمد ساکن بوگرا جو سرحد پر وہابی رنگروٹوں کو فوجی تربیت دیتے تھے اور سرحد پر انگریزوں کے خلاف کئی معرکوں میں شریک رہے ہیں، اب ہندوستان واپس آگئے ہیں اور اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ ریلی نے ان کے خلاف ضابطے کے تحت گرفتاری کی درخواست کی۔ لیکن اس کو ہدایت کی گئی کہ ان لوگوں کے بیانات کسی مجسٹریٹ کے سامنے قلمبند کرائے اور اگر مجسٹریٹ سمجھے کہ ان کے خلاف بدیہی طور پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے تبھی اس کو ضروری کارروائی کرنی چاہئے۔

بکسر میں وہابیوں کے متعلق تحقیقات: ریلی کی توجہ بکسر اور اس کے مضافاتی علاقوں کی طرف بھی منعطف کی گئی۔ پہلے جب وہ مرتضیٰ کے ساتھ شمالی مغربی سرحد پر کام کر رہا تھا تو مرتضیٰ نے اسے خبر دی تھی کہ ضلع شاہ آباد وہابیوں کے بھرتی کے اہم ترین مرکزوں میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اس علاقے کے رنگروٹ سرحد جایا کرتے اور وہاں وہابی سپاہ کی ناک (چیدہ جزو) بن جاتے۔ ریلی نے سوچا کہ تفتیش جو اب تک صرف پٹنہ اور دانا پور تک محدود رہی ہے اس کو صوبہ کے اور حصوں تک وسعت دی جائے اور جون سنہ ۱۸۶۵ء کو ایشری پرشاد کو بکسر جانے کی ہدایت کی۔

اب تحقیقات کا رخ بکسر اور اس کے قریب بہت سے قریوں کی طرف ہو گیا جو ضلع غازی پور اور یوپی تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس گاؤں کا معائنہ کر کے ایشری پرشاد نے رپورٹ دی کہ سید احمد اپنے سفر میں بہار سے گزرتے ہوئے اس علاقے کے ایک گاؤں بڑاچور بھی پہنچے تھے۔ اس گاؤں میں پٹھانوں کے ۵۰ گھر ہیں اور مشرقی و مغربی دو نصف میں بٹا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چار پٹیوں میں منقسم ہے۔ مغربی پٹی کے باشندوں نے سید احمد سے بیعت کی تھی۔ وہ [illegible] کے مولویوں کے پیرو ہیں اور اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں پابندی سے پٹنہ بھیجا کرتے ہیں۔ یہ اطلاع ایک لڑکے محمد علی خاں نے ایشری پرشاد کو پہنچائی۔ وہ مشرقی پٹی کا باشندہ ہے جہاں کے لوگ ایک دوسرے حریف حنفی مولوی، [illegible] کے پیرو ہیں۔

محمد اسحاق کی مخبری: ایک اور نوجوان مخبر محمد اسحاق[1] ساکن موضع ڈہری تھانہ مورتی ضلع پٹنہ نے ایشری پرشاد کو دو اور وہابی کارکنوں محمد عمر داناپوری و مشرف علی دانا پوری کے بارے میں خبر دی...... کہ یہ دونوں کارکن بہار کے مختلف حصوں سے چندے کے روپے جمع کرتے ہیں۔ اس نے ایک کتاب بھی پیش کی جو اس کے قول کے مطابق محمد عمر کی تھی اور جس میں پچھلے کئی سال سے تحصیل کردہ چندے کی تفصیلات درج تھیں۔ ابتدائی تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ مشرف علی کے خلاف کوئی زیادہ شہادت نہیں لہٰذا اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مگر محمد عمر کے گھر کی تلاشی لی گئی اور مختلف اشخاص نے اس کو جو خطوط لکھے تھے، اور ان میں کچھ رجمنٹ ۳۲ کی پیدل پلٹن متعینہ اور نینی تال میں متعین سپاہی بھی شامل تھے، پکڑے گئے۔ ان کے کاتبوں نے عمر سے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہمارے ان اعزا و متوسلین کی جنہیں ہم ہندوستان چھوڑ جائیں امداد کی جائے یا ان کے سرحد جانے کے لئے مالی اعانت کی جائے۔ ان میں چند ایسے بھی تھے جو سرحد سے لوٹے تھے، راستے میں رک جانا پڑا۔ اور مدد کے طالب تھے۔ ان تمام خطوط نے اس اطلاع کو موثق کر دیا کہ پیر محمد کی گرفتاری کے بعد وہی سردار تھا۔ اور اسی لئے اس سے مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ ۲۲ جولائی ۱۸۶۷ء کو محمد عمر گرفتار کر لیا گیا، حوالات میں ڈال دیا گیا اور حکومت ہند سے درخواست کی گئی کہ ضابطہ ۱۸۱۸ء کے تحت اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا جائے۔ مگر حکومت بنگال نے ضابطہ مذکورہ کے اجرا کے لئے وجوہ ناکافی سمجھیں اور حکومت ہند سے درخواست کرتے ہوئے عمر کے متعلق مزید جزئیات طلب کیں۔

محمد عمر کی گرفتاری و رہائی: اس درمیان میں رتی اور ایشری پرشاد سے کہا گیا کہ متذکرہ خطوط کے کاتبوں کا کھوج لگائیں۔ بعد میں حکام کو معلوم ہوا کہ محمد عمر رحمت علی کا بھتیجا ہے جو ۱۸۴۵ء کی سازشِ پٹنہ کے سرکردہ منتظموں میں سے تھا۔ اس تازہ اطلاع نے مزید

---

[1] یہ مشرف علی کا بیٹا تھا جس کے خلاف اُس نے کسی سرکاری نوکری کی امید پر مخبری کی۔

سرکاری تحقیقات کی رفتار تیز کردی۔ یہ پتہ بھی چلا کہ عمر کی قرابت اور بہت سے بااثر اشخاص سے تھی۔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں عملی حصہ لیا تھا۔ مجسٹریٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چونکہ صوبہ کی قریب قریب تمام عدالتوں میں عمر کے قرابتمند موجود ہیں اس لئے اگر وہ مقید بھی کیا گیا تو اس کے خلاف شہادتوں کو تلف کرنے کے لئے زبردست اثرات کام کرنے لگیں گے۔

وہ صرف ایک ہفتے کے لئے حوالات میں رکھا گیا تھا اور ایک عرصے سے یہ مدت تمام ہو چکی تھی۔ اب وہ ضابطہ ۳ کے اجرا کے بغیر مزید قید میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لئے مجسٹریٹ نے اس کو ضمانت پر رہا کر دینا، اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور اس کے خلاف شہادتیں جمع کی جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ عمر کے کسی مزید ذکر کی غیر موجودگی سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ضابطہ ۳ اس کے خلاف نافذ نہ ہوا۔

ہند میں وہابیوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاری: ۱۸۷۰ء کے وسط تک سارے ہند میں اکثر ممتاز وہابی تو مدین ڈھونڈ نکالے گئے اور گرفتار کر لئے گئے تھے مگر باوجودیکہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک زبردست تفتیشیں جاری رہیں حکومت اب تک غیر متیقن تھی آیا اس کے قبضے میں جو شہادتیں ہیں وہ قانونی عدالت میں گرفتار شدہ قیدیوں کے خلاف چارہ جوئی کے لئے کافی ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر گرفتاریاں ۱۸۶۹ء میں عمل میں آئی تھیں اور اس وقت سے برابر یہ قیدی قید رہے لیکن ۱۸۷۰ء کے وسط تک نہ ان کو گرفتاری کی وجوہ کی اطلاع دی گئی نہ ان پر کسی معین جرم کا الزام عائد کیا گیا۔ بیشتر قیدی ادنیٰ اوسط طبقے کے تھے جن کی معمولی مالی حالت نے اس غیر قانونی ایذا رسانی کو چیلنج کرنا ناممکن کر دیا تھا۔ مگر ان میں سے دو، امیر خان اور حشمت داد خان، اونچے مرتبے اور وسائل رکھتے تھے انھوں نے اس جبر و ستم کو نہ صرف درگذر نہیں کر دیا، انھوں نے مسلسل و متواتر قانونی تنازعات میں حکومت کے کرتوت کو چیلنج کیا جس نے ان کے معاملے کو زمانہ کا معرکۃ الآرا مقدمہ بنا دیا۔

امیر خاں اور حشمت داد خاں کا حکومت سے مطالبہ!

دونوں بھائی ایک میرٹھ کے پٹھان خاندان کے ممتاز رکن تھے جن کی جڑیں بار کے

عہد تک پہنچتی ہیں وہ عالم گنج پٹنہ سٹی کے باشندے تھے، کلکتہ میں چمڑے کی ایک چلتی ہوئی آڑھت کے مالک تھے اور جن کا سرمایہ دس لاکھ سے زائد کا ہوگا۔ دونوں پختہ عمر کے تھے۔ گرفتاری کے وقت امیر خان پچھتر سال کے اور حشمت داد خان ۷۲ سال کے تھے اور دونوں امیرانہ معاشرت کے پروردہ اور خوگر دہ تھے۔ دونوں ایک سال سے زیادہ سخت ایذاؤں میں رکھے گئے۔ ان کی طویل مدت قید ان کی صحت کو متاثر کرنے کے علاوہ ان کے کاروبار کو بھی جس کا اب کوئی نگراں نہ تھا غارت کر رہی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے حکومت کو کئی عرضداشتیں بھیج کر گزارش کی کہ یا تو ان کو گرفتاری کی وجہ بتائی جائے یا جلد ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ مگر سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

امیر خان اور حشمت داد خان کے مقدمے کا آغاز: آخرکار ۱۸۷۰ء میں قانون کی رو سے جو آخری علاج ان کے سامنے تھا اس کا سہارا لیا۔ انھوں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں تحریک کی کہ . . . . عدالت حبس بیجا کا پروانہ کرے۔ اس وقت ہندوستان کے تین چوٹی کے بیرسٹر انسٹی، گراہم اور بریانسن مستغیثوں کی طرف سے کھڑے ہوئے۔ حکومت کی نمائندگی ایڈووکیٹ جنرل گراہم اور مستقل مشیر حکومت نے کی۔ دعووں کی سماعت جسٹس نارمن کی عدالت میں ہوئی۔ پہلے امیر خان کا دعویٰ پیش ہوا لیکن چونکہ دونوں دعووں کے واقعات ایک سے تھے۔ ایک کے دعوے پر جو بحث کی گئی وہ دوسرے کے دعوے پر بھی صادق آتی تھی۔ بحثوں کی تفصیلات میں اور بہتوں کے ساتھ اساسی سوال بھی اٹھایا کہ آیا کوئی رعایا یا مع ہندوستانی، کو بے قاعدہ گرفتاریوں سے آزادی کا وہی حق حاصل ہے جو انگلستان میں میگنا کارٹا، بل آف رائٹس اور پارلیمنٹ کے دوسرے پاس کردہ قوانین کے تحت انگلستان میں نافذ ہیں، اس سے ہم یہاں بحث نہیں کر سکتے۔ سائلوں کے بیرسٹروں کی بالخصوص انسٹی کی بحثیں جو آج بھی کسی فرد کی مدافعت میں جذبات و عصبیت سے پاک فصاحت کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی ہیں کچھ بار آور نہ آئیں۔ ۲۹ اگست کو فیصلہ ہوا اور اجرائے پروانہ نامنظور کر دیا گیا۔

۱؎ ان کے [illegible] اب بھی محلہ عالم گنج پٹنہ سٹی میں موجود ہیں۔

جسٹس نارمن کے قتل کا واقعہ: بے محل نہ ہوگا اگر یہاں جسٹس نارمن کے قتل کا ذکر کر دیا جائے جو لارڈ میو کے قتل کے مشہور افسانے کی طرح غلط طور پر وہابیوں کے سر تھوپا گیا تھا۔ امیر خاں کے مقدمے کے فیصلے کے اعلان کے ایک سال بعد نارمن پر حملہ وقوع میں آیا تھا۔ قاتل ایک پنجابی مسمّی عبداللہ تھا جس کا وہابیوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور سرکاری طور پر جسے پاگل قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا، امیر خاں کا مقدمہ اس وقت کا ایک مشہور و معروف مقدمہ تھا، اور حملہ اس کے اتنا جلد بعد واقع ہوا کہ حکام کے مخالف وہابی گروہ اور کچھ عام آدمیوں نے اس گندہ فعل کے ارتکاب میں وہابیوں کو ملوث کر دینے کا اچھا موقع تاک لیا۔

جس دوران میں اجرائے پروانہ کے مقدمہ کی سماعت جاری تھی، انگلستان کی ایک عدالت میں لارڈ میو گورنر جنرل اور لارڈ گرے لفٹنٹ گورنر کے خلاف مستغیثوں کی طرف سے ان کی ایذا رسانی اور جسمانی حبس کے لئے ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ اس کا کیا ہوا۔

جسٹس نارمن کے فیصلے کے اعلان کے فوراً بعد انسٹی نے چیف جسٹس اور جسٹس مارکبی کی عدالت میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی درخواستیں دیں۔ چیف جسٹس نے درخواست قبول کرنے سے انکار کیا مگر اپیل کرنے والوں کو ہدایت کی کہ اگر مناسب سمجھیں تو عدالت کے دستور کے مطابق ان کو رجسٹرار کے دفتر میں داخل کریں۔ چونکہ ہائی کورٹ کا ایک جج مصروف ہوگا اس لئے اس نے اپیل کی کوئی قریب تاریخ مقرر کرنا بھی منظور نہ کیا۔

۱۲ ستمبر کو انسٹی نے جسٹس نارمن اور چیف جسٹس دونوں کے فیصلوں کے خلاف پریوی کاؤنسل میں اپیل کی اجازت طلب کی۔ ابھی تاریخ [illegible] ہی نامنظور کر دیا گیا۔ اس طرح حکومت اور ایک فرد کے درمیان قانونی کشتی کا یہ دور ختم ہوا جو اندھا دھند گرفتاری سے آغاز [illegible] کا مدعی تھا۔

قیدیوں کا رہا ہونا [illegible]: ایک لحاظ سے وہابیوں کی سعی کامیاب ہوئی۔ جن قیدیوں کے خلاف اتنے زمانے سے مقدمہ کے بغیر کارروائی کی گئی تھی اس کو جلد انجام دینے کے لئے ان کوششوں نے حکومت کو مجبور کر دیا۔ امیر الدین

اور ابراہیم منڈل کے مقدمات کی سماعت پہلے شروع ہوئی۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں امیرالدین
کا مقدمہ مالدہ میں اور ابراہیم منڈل کا راج محل میں مسموع ہوا۔ دونوں کو جزیرہ انڈمن
میں عمر قید کی سزا دی گئی اور ان کی جایدادوں کی ضبطی کا حکم صادر ہوا۔

امیرالدین مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔ بعض رعایتیں جو جزیرے کے قیدیوں
کو دی گئی تھیں، جن کا ذکر ہو چکا، وہ اب منسوخ کر دی گئی تھیں اور زیادہ سخت قیود
نافذ کر دیے گئے تھے۔ اس لیے بعد کے چند سال تک امیرالدین کو سخت۔۔ سخت مصائب
جھیلنے پڑے۔ بعد میں انھیں ایک مقامی مدرسے میں معلم مقرر کر دیا گیا۔

۱۸۸۳ء میں دوسرے وہابی قیدیوں کے ساتھ انھیں بھی رہا کیا گیا۔ پٹنہ شہر میں بسنے
کی اجازت کی منظوری کے وقفے میں وہ عبدالرحیم کے ساتھ پٹنہ میں رہے۔ چند اور آدمیوں
کی طرح انھیں ایک بار مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے حاضری دینی ہوتی تھی اور پولیس کو
اطلاع دیئے بغیر کہیں باہر نہ جا سکتے تھے۔

اگرچہ ابراہیم منڈل کو بھی عمر قید کی سزا دی گئی تھی معلوم نہیں کہ وہ واقعی انڈمان کبھی بھیجے
گئے یا نہیں۔ اس بارے میں جعفر کا بیان واضح نہیں۔ ایک مقام پر وہ ایک عام خیال ظاہر کرتے
ہیں کہ امیرالدین، تبارک علی اور ابراہیم سب گرفتار کیے گئے اور "وہ" انڈمان بھیج دیے گئے
مگر یہ واضح نہیں کہ "وہ" میں ابراہیم بھی شامل تھے۔ کیونکہ جعفر اگرچہ بعد میں پہلے دو کے
جزیرے میں پہنچنے اور ۱۸۸۳ء میں ان کے رہا ہونے کا ذکر کرتے ہیں، وہ ابراہیم کا ذکر
کہیں نہیں کرتے۔ ایک دوسرا مولف[1] لکھتا ہے کہ ابراہیم فی الواقع انڈمان نہیں بھیجے
گئے۔ وہ ۱۸۷۸ء میں امیر خاں کے ساتھ رہا کر دیے گئے تھے اور اس مدت کے اندر
میں وفات پا گئے۔ یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

ملزمان پٹنہ کے مقدمہ کا آغاز: وہابی قائدین کے مقدمات کی سماعت کا دوسرا دور
مارچ ۱۸۷۱ء میں پٹنہ میں شروع ہوا۔ اس میں سات آدمیوں کا چالان ہوا تھا جو عزیزت

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تاریخ ۵۵

ہند کی مختلف دفعات کے تحت ملزم قرار دیے گئے تھے۔ ملزمین تبارک علی، پیر محمد، دین محمد، امیر الدین، امیر خاں، حشمت داد خاں اور مبارک علی تھے۔ امیر خاں اور حشمت داد خاں پر تحریک کی مالی امداد کا جرم عائد کیا گیا۔ مبارک علی پر چندے کی رقوم کی تحصیل و ترسیل کا الزام لگایا گیا۔ ان کے بیٹے تبارک علی پر یہ الزام تھا کہ وہابی فوج کے ایک دستے کی انگریزوں کے خلاف معرکۂ امبیلہ میں قیادت کی تھی۔ ان پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ فوجی تعلیم دیتے اور سرحد پر رنگروٹوں کو قواعد کراتے تھے۔ باقی تین پر باغیوں کی مختلف طریقوں سے اعانت کا الزام تھا۔

یہ ملزمین مختلف وقتوں میں اور مختلف جگہوں میں گرفتار کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض، جیسے مبارک علی، کو وقفے کے دوران میں رہا کر دیا گیا۔ دوسرے ملزمین جلد جلد تمام صوبہ بنگال کے ایک جیل سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے تھے لیکن بعض اور جیسے برادران خاں اور غالباً تبارک علی بھی جولائی ۱۸۶۹ء سے برابر قید رہے، لیکن سماعت مقدمہ کے وقت وہ سب اکٹھے حاضر کئے جاتے تھے، اور مبارک علی کو بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

وہابیوں کے املاک کی ضبطی اور سزائیں: تجویز سزا کی کارروائیاں ڈی ایم بار بر جائنٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں منعقد ہوئیں۔ ۲۷ مارچ کو سارے ملزمین کو عدالت سیشن کے سپرد کیا گیا۔ پرنسپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی جو ۹ مئی ۱۸۷۰ء کو شروع ہوئی۔ سماعت کے دوران میں سارے ملک سے بلا کر لائے جانے والے ایک سو سے زیادہ گواہوں کے اظہارات لئے گئے۔ سماعت وقفوں کے ساتھ ۱۹ جولائی ۱۸۷۰ء تک جاری رہی۔ اینسٹے اور انگرام نے، جنہوں نے پروانہ کے مسئلہ کی سماعتوں میں برادران خاں کی طرف سے وکالت کر چکے تھے، اس مقدمہ میں بھی ان کی نمائندگی کی۔

سارے ملزمین کو وہی کی بغاوتی سزائیں عمر قید بہ جزیرۂ انڈمان اور تمام جائیدادوں کی ضبطی سنائی گئیں۔ یہ استثنا حشمت داد خاں جو رہا کر دئیے گئے کیونکہ ان کے خلاف

ف۱ ان کی قیمتی جائدادیں جن میں کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ کی شاندار عمارت بھی تھی فروخت کر دی گئیں اور ان کی بہت سی رقوم کی ضبط کر لی گئیں۔

کوئی بدیہی شہادت نہ ملی اور مقدمہ قائم نہ کیا جا سکا۔ پیر محمد بعد میں ہائی کورٹ سے اپیل پر رہا ہوئے۔

امیر خاں و حشمت داد خاں کا انتقال: امیر خاں کی عمر اب ۸۰ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ان کی جان توڑ کوششوں سے ان کو انڈمان نہ بھیجا گیا۔ نو برس سے زیادہ جیل کاٹنے کے بعد نومبر ۱۸۷۸ء میں گورنر جنرل لارڈ لٹن کی سفارش سے رہا کئے گئے۔ رہائی کے جلد ہی بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی حشمت داد خاں نے کچھ پہلے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ دونوں پٹنہ میں مدفون ہیں۔ مبارک علی مقدمہ کے دوران شدید زدوکوب کے نتیجے میں فوت ہو گئے۔ باقی قیدی انڈمان بھیج دئے گئے۔ تبارک علی امیر الدین کے ساتھ مارچ ۱۸۷۲ء میں وہاں پہنچے کئی سال سخت مصائب جھیلنے کے بعد وہ اسٹیشن محرر مقرر کئے گئے۔ ۱۸۸۲ء میں عام معافی کے وقت رہا کئے گئے۔ اور عبد الرحیم کے ہمراہ پٹنہ واپس آئے۔

یہ تھا انجام وہابیوں کے خلاف کارروائیوں کے آخری دور کا۔ وہابی سربراہوں کو گرفتار کر کے ان کو انڈمان کی دور افتادہ قیدیوں کی نوآبادی میں طویل المعیاد سزائے قید دے کر اور ان کی مادی املاک کو ضبط کر کے تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے حکومت کے بس میں جو کچھ بھی تھا سب کر گزری۔ مگر سید احمد نے جو شعلہ روشن کیا تھا وہ بالکل نہ بجھا۔ سطح کے نیچے نیچے چنگاری سلگتی رہی اور کبھی کبھی شرارے بھڑک اٹھتے۔

۱۸۷۵ء: وہابی بھوپال اور رنگون میں۔

بہار میں پرنس ویلز کی آمد کے وقت حکومت کو وہابیوں سے کچھ گڑبڑ پھیلانے کا اندیشہ ہوا۔ ان کے موجودہ تنظیمی مرکزوں اور کارروائیوں کی تحقیقات کی گئی۔ بشیری پرشاد نے دسمبر ۱۸۷۵ء میں ذیل کی خفیہ رپورٹ تیار کی۔

اس نے ظاہر کیا کہ اس ملک میں وہابیوں کی کارروائیوں کے تین مرکز ہیں جو پٹنہ بھوپال اور رنگون میں واقع ہیں۔ ان میں سے پہلا مرکز مقامی وہابیوں کی گرفتاریوں اور قید و بند سے بہت کمزور ہو گیا ہے اس لئے انھوں نے اپنی جدوجہد وقتی طور

میں پھیلا دی ہے۔ پٹنہ میں دو مستعد کارکن ولایت علی کے بیٹے محمد حسن اور عبداللہ ہیں
آخر الذکر نے افغانی قومیت اختیار کر لی ہے۔ مؤخر الذکر کے ایک بیٹے کے بارے میں رپورٹ
کی گئی کہ وہ لارڈ میو کے قتل کے وقت انڈمان گیا اور اس کے ارتکاب قتل میں ملوث ہونے
کا شبہ کیا گیا[1]۔ دوسرا مرکز عبداللہ کی گدی پٹنہ سٹی میں پٹیلوں کی دوکان ہے۔ جگہ
یہ محض نمائش ہے۔ وہ قیمتی موتی کی فروخت کے بہانے سے مختلف دیسی ریاستوں کا چکر
لگاتا پھرتا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد ریاستوں سے چندہ جمع کرنا ہے۔ پٹنہ کے
مرکز سے بہت ملحقہ صورت الزہرہ کا مرکز ہے۔ جو نذیر حسین کی وجہ سے پیدا شدہ ہے۔ یہ
اب بھی ہندوستان میں وہابیوں کا ایک ممتاز تذکرہ جاتا ہے اور دارالہام کہلاتا ہے۔"

دوسرا مرکز بھوپال تھا جس کے سردار منشی جمال الدین تھے جنھوں نے بھوپال کی ایک
سابقہ بیگم سے شادی کر لی تھی۔ وہاں دوسرے ممتاز وہابی صادق حسن، عبدالجبار، عبدالحق
اور علی کریم تھے۔ مؤخر الذکر شخص خاص طور پر ایک بیباک وہابی اصول کردار تھا۔

تیسرا مرکز رنگون تھا۔ وہاں سے وہابیوں کی بھوپال کے مرکز سے کثرت سے خط و کتابت
تھی۔ محمد حسین کے ایک بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ وہاں بھی گیا تھا[2]۔

۱۹۲ء: وہابیوں کی جدوجہد شاہ آباد میں

۱۸۶۱ء میں بہار کا ضلع شاہ آباد وہابی تحریک کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بہت
نمایاں ہوا۔ وہاں کے سربراہ ابراہیم اور حکیم عبدالغنی تھے جو غدر کے زمانے میں آرہ کی
عدالت میں ناظر فوجداری تھے۔ ابراہیم کے بڑے بھائی علی نے ۱۸۵۷ء کی شورش میں نمایاں
حصہ لیا تھا۔ بعد میں وہ گرفتار ہوئے اور موت کی سزا کا فیصلہ ہوا۔ ناظر کی حیثیت سے

---

[1] لارڈ میو کے قتل میں وہابی ملوث نہ تھے، (دیکھئے) یہ خیال ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے وہابیوں
کو قتل میں ملوث کرنے کی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ غالباً یہ بیان غلط ہے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں محمد حسن
کے کسی بیٹے کے وہاں جانے کی اصلیت معلوم نہیں ہوتی۔

باپ پر فرض عائد ہوتا تھا کہ بیٹے کی پھانسی کے انتظامات کرے اس لئے انھوں نے ملازمت سے استعفٰی دے دیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد کچھ جائداد غیر منقولہ جس کی سالانہ آمدنی تین ہزار تھی، چھوڑ کر انتقال کیا۔

کلکتہ پولیس کی وہابیوں کے متعلق رپورٹ: کلکتہ پولیس کی رپورٹوں[1] سے سنہ ۸۱-۱۹۸۰ میں ابراہیم کی جدوجہد کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۰۹۰ میں ڈھاکہ کے ایک شخص بدیع الزماں نے ممتاز وہابیوں کا ایک جلسہ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں نذیر حسین دہلوی بھی شامل کئے گئے تھے۔ چونکہ وہ پولیس کے زیر نگرانی تھے۔ نذیر حسین نے دہلی میں جلسہ کرنے سے اختلاف کیا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کوئی دور دراز کا اندرونی قصبہ منتخب کرنے کی رائے دی۔ ابراہیم نے مشورہ دیا کہ یہ جلسہ مظفر پور کے قریب ایک گاؤں تاجپور میں منعقد کیا جائے۔ جلسے میں کوئی تین ہزار وہابی مولوی جمع ہوئے۔ جلسے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بغاوت پھیلانے کے لئے حکمت عملی تیار کی جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ مختلف فرقہ وارانہ اغراض کے لئے چندے فراہم کئے جائیں دہلی، پٹنہ اور آرہ میں مدرسے کھولے جائیں جن میں وہابی عقائد کی تعلیم دی جا سکے۔ تقسیم کے لئے کتابیں اور رسالے چھاپے جائیں۔ چندے کے لئے مطبوعہ اپیلیں تقسیم کی گئیں اور دوسری جگہوں میں شائع کی گئیں۔" رپورٹ کے بیان کے بموجب "اپیل کی پذیرائی بہت حوصلہ افزا ہوئی، اور غریب طبقوں نے بھی جیسے درزیوں دھوبیوں ورشتوں نے بھی مستعدی سے چندے دئے۔ کئی مولویوں کو خود خرچ کے رسالے دئے گئے اور ان سے تبلیغی دوروں کے لئے کہا گیا۔ ابراہیم نے کلکتہ، ڈھاکہ، غازی پور، بنارس وغیرہ کے دورے کئے اور ان جگہوں میں تقریریں کیں۔"

وہابیوں کے خفیہ اجلاس پر پولیس کا چھاپہ:[2] اس کے بعد کی ایک پولیس رپورٹ

---

[1] کلکتہ پولیس کی خفیہ اطلاعات۔ سے ملخص جو ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ نے جوائنٹ سکریٹری گورنمنٹ بنگال کو بھیجیں میمو ۲۵۳ مورخہ ۲۰ فروری ۱۸۹۱ء اور ایضاً میمو ۱۴۲۲ مورخہ ۲ مئی ۱۸۹۱ء

میں کمشنر پٹنہ کو اطلاع دی گئی کہ ممتاز وہابیوں کا ایک اور جلسہ سراج گنج میں منعقد ہوا،[۱]
جہاں نذیر حسین بھی اپنی بھانجی کی شادی کی شرکت کے بہانے سے گئے ہوئے تھے۔ اس
تقریب نے وہابیوں کے اجتماع کے لئے ایک آسان حیلہ مہیا کر دیا۔ سربرآوردہ حاضرین
میں نذیر حسین، محمد حسین لاہوری اور ابراہیم آروی تھے۔ جلسہ کے بانی و مہتمم ابراہیم تھے اور
مقصد یہ تھا کہ ان کا تعاون حاصل کیا جائے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ملک کے دارالحرب
ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ سرحد پر وہابی ریاست کا ہندوستان
سے رابطہ اور اعانت نسبتہً بہت کمزور پڑ گئی ہے، ہندوستان سے مزید رضاکاروں اور امداد
کی ترسیل کی کوششیں کرنا چاہئیں۔ خفیہ اجلاس کی خبر حکام کو ملی اور مجسٹریٹ مولویوں کو
اچانک جا لینے کے لئے جھپٹے، لیکن اس جگہ نہ کوئی قابل مواخذہ چیز دستیاب ہوئی نہ کوئی گرفتار کیا جا سکا۔

ابراہیم آروی کی تبلیغی مہم: جولائی ۱۸۸۱ء میں پی نولن سپرنٹنڈنٹ پولیس پٹنہ نے
کمشنر کو رپورٹ کی کہ ابراہیم نے اپنے کلکتہ کے ایک دورے میں تبلیغ کی ہے کہ ہر مسلمان پر
واجب ہے کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو جائے اور یہ کہ کسی غیر سرکاری شغل میں
آدھے معاوضے پر کام کرنا حکومت کے ماتحت اس قسم کے کام پر دونے معاوضے پر
کام کرنے سے بہتر ہے۔ نولن نے ابراہیم کی تقریر کے بعض خاص خطرناک پہلوؤں پر
[illegible] کہ ابراہیم نے احتجاج، شورش، مقدمہ بازی، فراہمی چندہ
سرکاری ملازمتوں سے استعفے کی ترغیب و اغوا اس طور پر کہ فوجی سپاہیوں پر اثر انداز ہوسکیں،
کے تمام طریقے استعمال کئے۔ نولن نے مزید اظہار رائے کیا کہ ابراہیم یقیناً ایسا آدمی معلوم ہوتا
ہے جس پر نگرانی رکھنی چاہئے۔ اس نے یہ رپورٹ بھی کی کہ ابراہیم ایک طور کا آمدنی
ٹیکس فی روپیہ ایک پیسہ لگا کر روپیہ جمع کر رہا ہے۔ بیگم بھوپال اس فنڈ میں چندہ

---

(۱) کلکتہ پولیس کی خفیہ [illegible] سے ملخص جو ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ ہیبرٹ نے کمشنر پٹنہ
کو بھیجی تھیں۔ دیکھئے نمبر [illegible] مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۸۰ء

دہندگان میں نمایاں حصہ لیتی تھیں جو بظاہر جمع تو کیا جاتا تھا ایک دیوانی مقدمہ[1] میں مالی اعانت کے لئے جس میں ضلع آرہ کے وہابی الجھے ہوئے تھے مگر دراصل یہ ستھانہ کے مذہبی دیوانوں کے لئے مقصود تھا۔

مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ ۱۸۸۱ء تک وہی طریق کار جاری تھا جو ولایت علی یا ان سے بھی پہلے شروع کیا گیا تھا۔ ابھی تک رنگروٹ جمع کرنے، روپے فراہم کرنے اور سپاہیوں کو دور دراز پہنچا دیا جاتا تھا۔ تنظیم کی عظیم تربیتی و تادیبی طاقت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے اگرچہ پے در پے ضربوں سے پرانے ڈھانچے میں سے بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا پھر بھی بے جھجک پرانے طریق عمل پر کام ہوتا تھا۔

ابراہیم آروی کے خلاف تحقیقات: دوسرے سال بھی ابراہیم کے خلاف تحقیقات جاری تھی "پولیس انسپکٹروں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس شاہ آباد کو ان کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ بھیجی۔ جس میں خبر دی کہ محمد عمر کی طرح ابراہیم کے تعلقات بھی اعلیٰ درجے کے ہیں اور طاقتور اور ذی اثر رشتہ داروں سے مربوط ہیں۔ شادیوں کے ذریعہ سے ان کا رابطہ خاندان صادقپور سے بھی ہے۔ وہ عبدالعزیز ساکن رحیم آباد ضلع دربھنگہ، عظمت حسین مختار کلکتہ، عبدالرحیم کے رشتہ دار عبدالرؤف، لطیف حسین اور اُن کے بھائی عبدالغفور (عبدالغفار) ساکن بہادرپور[2] کی شمولیت سے روپے کی تحصیل میں مشغول ہیں۔ اس سال جو روپے جمع ہوئے ان کی میزان دس ہزار سے زائد ہے۔ اس کی تقسیم ابراہیم نے کی مگر معلوم نہ ہوا کہ انہوں نے اس کو بہت سلیقہ سے نہ تحصیل کردہ رقوم میں سے بہت قلیل حصہ مدرسہ اور دوسرے ظاہر کردہ رقوم میں سے بہت قلیل حصہ مدرسہ اور دوسرے ظاہر کردہ مدات پر صرف ہوا۔ باقی رقم کثیر غیر محسوب اور نامعلوم طریق پر کیونکر نہ گئی

---

[1] اس کا تعلق آرہ کے سنیوں (حنفیوں) اور وہابیوں کے درمیان عام مسجد میں نماز میں آمین بالجہر سے تھا۔ یہ سنیوں (حنفیوں) اور وہابیوں کے درمیان نہایت بے حقیقت مذہبی اختلافات میں سے ایک ہے جو اکثر جھگڑوں اور بلووں کا باعث ہوا ہے۔ مذکورہ مقدمہ میں سنیوں (حنفیوں) کو عدالت زیریں میں کامیابی ہوئی تھی۔ وہابیوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کی تھی۔ [2] بہادرپور پٹنہ اور دانا پور کے درمیان شاہراہ پر ایک گاؤں ہے۔ خاندان صادقپور کی ایک شاخ (الٰہی بخش کے اسلاف) پہلے بہادرپور کے باشندے تھے۔

سرحد کی طرف بھیج دی گئی۔

وہابی تحریک کے خلاف موثر کارروائی ۱۸۷۰-۷۱ء: آخری رپورٹ میں دکھایا گیا کہ وہابی بالعموم اور اس سے پہلے ۱۸۶۴-۶۵ء میں اپنے سربراہوں کی سزایابی سے سخت تنگ حال ہیں لیکن ان سزاؤں کے خلاف اندر اندر سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ مزید متنبہ کیا گیا کہ جب کبھی ان کو طاقت ہو جائے تو یہ بے چینی حکومت کے خلاف پھوٹ پڑ سکتی ہے۔

گذشتہ صدی کے آخری ربع میں یہ بات ہندوستان میں وہابیوں کی صورتِ حال کا صحیح اندازہ تھا۔ حکومت کی زبردست پولیس کی تنظیم کا یہ رجحان نشانہ بنکر اور پے در پے سزاؤں اور اخراجِ ملک کی ضربوں سے بے دست و پا ہو کر وہابی بالعموم بے ضرر مفلوج ہو گئے اور ان کے پیروؤں کی عام جماعت بے شک بہت کمزور اور مجبور ہو گئی۔ پھر بھی پچھلی نصف صدی میں انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ حکومت ۱۸۷۰ء سے بہت عرصہ بعد تک اس کمزور جماعت سے خائف رہی۔ یہ وہ تاریخ ہے جو عموماً ہندوستان میں وہابیوں کی کشمکش کے ختم کی نشان دہ سمجھی جاتی ہے۔

سرحد پر مذہبی ریاست ۱۸۶۳ء-۱۹۰۲ء:

آخوند سوات: معرکہ امبیلہ (۱۸۶۳ء) کے بعد بقیہ ترو وہابی عبداللہ کی سرکردگی میں دریائے سندھ کے شمالی چاگرزئی ملک میں جا رہے۔ آخوند سے ان کے تعلقات اب تک خوش نہ تھے، اُس علاقے میں ان کے قیام کے لئے اُس نے کچھ انتظامات کر دیے۔ کچھ عرصے کے بعد وہابیوں نے چاگرزئیوں سے دو گاؤں تنگورہ اور بٹگرام کی بستیاں حاصل کر لیں اور ۱۸۶۸ء کے آغاز تک امن و امان سے وہاں ٹھہرے رہے۔ لیکن وہاں وہ بعض ہمسایہ قبائل کی پوشیدہ عداوت کے سائے میں بسر کرتے تھے۔ اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب آخوند سوات اور علاقے کے ایک دوسرے روحانی اقتدار والے کوٹھا کے ملا[1] کے مابین اختلافِ رائے اور کشیدگی تھا۔ یہ ملا کبھی سید احمد

---

[1] یہ ملا عام طور پر معروف بہ کوٹھا ملا ہے۔ سوات اور بنیر کے علاقوں میں ایک با اثر پیر تھا۔ کوٹھا یوسف زئی علاقے میں جنوبی مغربی کونے میں واقع ہے۔

کے رفقا میں سے تھا اور اب تک اس کے پیرو کھلم کھلا وہابی کہہ کر ہی پکارے جاتے تھے۔ یہ
نام ایک قسم کا مذہبی دشنام ہو گیا تھا، وہابیوں کے ساتھ آخوند کے تعاون میں کچھ ذہنی
قیود داخل تھیں۔ وہ کوٹھا ملا کا کھلم کھلا مخالف تھا کیونکہ ملا کوٹھا اور سوات ہی کے
علاقوں میں خاصہ اثر اور اتباع حاصل تھا۔ آخوند کو اپنے حریف کے بڑھتے ہوئے اثر سے
اندیشہ رہتا تھا۔ مگر علاقے کے سیدھے سادھے اور بے تعصب مسلمانوں میں وہابیت کا داغ
کوٹھا ملا پر ضرب لگانے کے لئے ایک آسان ڈنڈا بن گیا اور اس کے متبعین وہابی کی حیثیت
سے مبغوض و مردود قرار دیئے گئے۔ آخوند کے متبعین کی نظروں میں ہندوستانی زیادہ مشتبہ
تھے۔ وہ اب بھی ایک ایسی طاقت کی نمائندگی کرتے تھے جس کی بنا سید احمد نے ڈالی تھی علاوہ
بریں وہ ایک مسلح اور ترتیب یافتہ جماعت تھی جو اس کے حریف کوٹھا کے ملا کے
لئے طاقت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی۔

وہابی اور نیج کتا: ——— اس زمانے میں بعض حالات نے آخوند کی پوشیدہ
عداوت نے وہابیوں کو بعض ایسے اقدام کے لئے مجبور کر دیا جس نے آخوند کو زیادہ مشتبہ کر دیا۔
اب تک وہ چگارزئی علاقے میں رہتے رہے لیکن مقامی لوگوں نے مدد دینے اور سامان مہیا
کرنے کے معاوضے میں ان پر اتنے لگان لگائے اور مسلسل ادا کرنے پر مجبور کیا کہ ان
کی زندگی بہت دشوار ہو گئی۔ چگرزئیوں پر آخوند نے دباؤ بھی ڈالا کہ وہابیوں کو نکال
باہر کریں کیونکہ عبداللہ اور ان کے متبعین کو ان کے درمیان گھر بنا دیا گیا۔ ان حالات میں وہابیوں
نے بنیر میں نیج کتا کے عظیم خاں کی اس کے علاقے میں منتقلی اور سکونت کی پیشکش کو
فوراً قبول کر لیا۔ چنانچہ وہابی مٹورا کو ترک کر کے نیج کتا کے عظیم خاں کی اس کے علاقے
میں منتقلی اور سکونت کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ چنانچہ وہابی مٹورا کو ترک کر کے
نیج کتا کو منتقل ہو گئے جہاں شاہزادہ فیروز شاہ ان سے آ ملے۔ اس جماعت کی بنیر میں
آمد کو جب آخوند اپنا رقیبہ اثر تصور کرتا تھا۔ اور ساتھ ہی اس حقیقت کو کہ ان کا مربی
عظیم خاں بھی کچھ کم زبردست حریف نہ تھا آخوند نے اپنے اثر کے لئے خاص خطرہ تصور کیا۔
اس نے جرگہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ہندوستانیوں کو بنیر سے خارج کر دے۔ اپنے آپ کو

ان سے امداد کا وعدہ کیا، اپنے قلعہ میں پناہ اور وادی میں کچھ زمین پیش کی۔ بتی کوٹ کے سردار
الّائی جرگے نے بھی انگریزوں کے خلاف مدافعت کے اقدامات پر ان سے صلاح مشورے کئے۔
لیکن حکام بھی ان جنگی تیاریوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ یہ حلیف اپنے اجتماع
سے قوت پیدا کریں میجر جنرل وائلڈ نے ۱۸۶۸ء–۶۹ء میں اچانک ان پر چھاپا اور حلیف پھرتی سے منتشر
ہو گئے۔ تب ہندوستانی پوری پٹ جو دریائے سندھ کے پار کے حسن زئیوں کا ایک گاؤں
تھا جا رہے۔ ہندوستانیوں کے آفات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کا لامتناہی
سلسلہ یہاں ختم ہوا۔ اس وقت سے ایک کافی طویل مدت تک پوری ان کا مرکز رہا۔

وہابی نو آبادی کا وہابی نو آبادی کی ریاست کا مفصل بیان، ان کی حربی طاقت کی ساخت
اور تعداد اور آخوند کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیں ریلی کی بعض رپورٹوں سے معلوم ہوتے
ہیں جو اس نے اس وقت بھیجی تھیں جب وہ متذکرہ بالا معرکہ کی تفتیش کے لئے سرحد گیا تھا۔
اس نے رپورٹ کی تھی کہ ہندوستانیوں کی جماعت جو تین سو (۳۰۰) افراد پر مشتمل ہے
دریائے سندھ کے پار پہاڑ میں رہتی ہے اس کے خاص سربراہ عبداللہ کے علاوہ فیض علی، اور احمد اللہ اور حبیب اللہ
کے تین بیٹے امان اللہ، مطیع اللہ اور عبدالقدوس ہیں۔ ایک اور دقیق شخص اسحاق برادر مقصود علی اس وقت مکہ
میں تھے ان کو اپنے رفقا کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنے کی ترغیب کی کوششیں کی گئیں۔ محاربہ فوج آٹھ دستوں
میں منقسم ہے، ہر ایک دستہ ایک جمعدار کے زیر کمان ہے اور وہ یہ ہیں: مالدہ کے رجب اور رحمت اللہ
حکیم پور کا عبدالغفور، رامپور بولیہ کے معین الدین اور شریعت اللہ، جسور کا نور الدین، عظیم گڑھ کا محمد اکبر اور ذبیح اللہ۔
محاربین یا سپاہیوں کی تعداد ۲۶۳ ہے جن میں ۷ دا آرہ اور غازیپور سے آئے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کی تعداد
ستر ہے۔ ان کے پاس ۲۷ گھوڑے اور ۲۷ خچر ہیں جو بلوآہ میں رکھے جاتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ان
کے پاس دو چھوٹی توپیں، ٹوپیوں والی گزدار بندوقیں اور سنگینیں ہیں اور ان کے لئے ٹوپیاں بھی بنتی
ہیں۔ مگر ان میں امداد کے رک جانے سے عام بدحالی پھیلی ہوئی ہے۔" ریلی کی رپورٹ کے مطابق اس وقت
حال نے عبداللہ کے کچھ متبعین کو وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن عبداللہ نے ان کو متنبہ کر دیا ہے کہ
ان میں سے جو اب واپس آئیں گے ان کے لئے زندان اور پھانسی ہے۔ ریلی نے
سفارش کی کہ اگر یہ اعلان کر دیا جائے تو بہت مناسب ہوگا کہ فیاض علی

نے حکومت پر زور دیا کہ عبداللہ کو چھوڑ کر ان کے باقی متزلزل متبعین کو وطن واپس آنے کی اجازت دے۔

وہابیوں کا حکومت سے مطالبہ: یہ سوال کہ حکومت سرحد پر بعض وہابیوں کی ہتینہ تجویز کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کرے ۱۸۷۲ء میں پھر اٹھا، جب کہ حکومت کو الٰہی بخش، برادر مقصود علی ساکن موریچ گڈھ اور محمد حسن ولد ولایت علی کی کچھ تجویزیں سرحد کے کچھ وہابیوں کو وطن کی مراجعت کے بارے میں وصول ہوئیں (حکومت کو بہت شک تھا کہ یہ دونوں اشخاص سرحد کے وہابیوں کی واقعی نمائندگی کرتے ہیں) یہ درحقیقت ہتھیار ڈالنے کی پیشکش نہ تھی، بلکہ وہ حکومت سے کچھ ضمانتیں چاہتے تھے جن میں مزاحمت کے بعد انتقامی کارروائیوں سے براءت بھی داخل تھی۔ مجسٹریٹ نے خیال کیا کہ اگرچہ وہابی اب کوئی قابل اعتنا جماعت نہیں رہی لیکن سرحد پر ان کا وجود ایک بڑی آفت ہے جو جاہل اور متعصب مسلمانوں کے دماغوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس نے حکومت سے خواہش ظاہر کی کہ جو لوگ مراجعت قبول کریں ان کو غیر مشروط معافی دیدے۔ لیکن کمشنر کو حکومت کے وقار کا زیادہ خیال تھا۔ وہ غیر مشروط معافی کے حق میں نہ تھا۔ اس نے دو شرطیں پیش کرنے کی رائے دی۔ ایک یہ کہ صرف وہی نہیں جو آنا چاہتے ہیں بلکہ سارے کے سارے وہابی مع قائدین واپس آجائیں، دوسری یہ کہ جو واپس آئیں وہ بعض مقررہ علاقوں میں پولیس کی نگرانی میں رہیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا کہ چونکہ حکومت کو وہابیوں کی طرف سے اب تک ہتھیار ڈالنے کی کوئی باقاعدہ پیشکش وصول نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے یہ ساری بحث قبل از وقت ہے اور یہ حکومت کا کام نہیں کہ ایسے امور میں پہل کرے۔

الیشری پرشاد کی مخالفت: الیشری پرشاد نے بھی وہابیوں اور ان کو معافی دینے کے موضوع پر کمشنر کے لئے ایک لمبی چوڑی یادداشت تیار کی۔ اس نے اس قوی پہلو پر زور دیا کہ "مجاہدین ایسے ملک میں ہیں جہاں سے وہ رزق حاصل نہیں کر سکتے۔ لامحالہ ان کو اسی ملک کی مالی اعانت پر گذر کرنا پڑتا ہے۔ جب تک سرحد کا مرکز باقی رہیگا وہاں کے قائدین ہندوستانی وہابیوں کو باغیانہ کارروائیوں پر اکساتے رہینگے۔ عام طور پر

مانا جاتا تھا کہ کچھ مدت تک سید احمد کے ظہور ثانی کا انتظار کرنے کے بعد وہابی حوصلہ کھو بیٹھینگے اور خود واپس آجائینگے۔ مگر اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ دوسرا امام بھی منتخب کر سکتے ہیں۔ آخوند سوات سرحد میں ایک معزز و موثر شخص ہے۔ وہابیوں کا سردار عبداللہ بھی سرحد میں ایک متقی بزرگ کی حیثیت سے معروف و مشہور ہے۔ وہ آخوند کی محبت حاصل کر لے سکتا ہے جو ایک بوڑھا آدمی لب گور ہے اور اس کی جانشینی کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس صورت میں پٹھانوں کی ایک کثیر تعداد کی اطاعت حاصل کر لے سکتا اور ان کو حکومت کے خلاف کارروائیوں میں استعمال کر سکتا ہے[1]۔ عبداللہ کے وہابی ہونے کی بنا پر ایشری پرشاد نے اس امکان کو رد کر دیا کہ وہ آخوند کی جانشینی کے لئے کھڑا ہوگا۔ کیونکہ آخوند خود ایک گوجر اور شاید ذات کا ہندو ہے۔ اس لئے ایشری پرشاد نے یہ زیادہ مناسب قرار دیا کہ تمام وہابیوں کو شرم اور ذلت سروں پر لادے ہوئے وطن واپس آنے دیا جائے۔ خود ان کی مراجعت ان کی شخصیتوں پر سے کلاہ افتخار و وقار اتار لیگی اور ان کے مقصد کے پودے بن کو فنا کر دیگی۔

امیر عبداللہ: بہرحال ان قبل از وقت مباحث کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہابی قائدین خصوصاً عبداللہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ایک مقصد کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ عبداللہ نے حکومت کے ساتھ طویل اور زور دار آویزشوں میں مسلسل مصیبتیں اور ناکامیاں برداشت کی تھیں۔ ممکن نہ تھا کہ آخر لمحے میں ان کے قدم ڈگمگا جائیں۔ وہابیوں نے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں اور حکومت سے ... اجازت مراجعت کی درخواست کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ دوسری طرف حکومت اس معاملہ میں پہل کرنا نہ چاہتی تھی

---

[1] یہ تصور دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایشری پرشاد نے جس امکان کا ذکر کیا ہے، وہ فی الواقع واقع ہو جاتا۔ یہ ہر کہ ایشری پرشاد کا تصور محض وہم نہ تھا اس واقعہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ عبداللہ ذاتی طور پر ایک بار آخوند سے ملے تھے اور وہابیوں کے متعلق تمام شبہات رفع کر دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔

انھوں نے قبولِ اطاعت کی ہر تجویز یا دھمکی کو بھی سختی سے ٹھکرا دیا۔ قوتِ ارادی میں روئی سے ادنیٰ ضعف جو ان کے بعض متبعین میں تھوڑی دیر کے لئے بھی ظاہر ہوجاتا اس کا موثر طور پر مقابلہ کرتے اور دفع کر دیتے۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبدالکریم سردار منتخب ہو گئے۔ ان کے عہد (۱۹۰۲ء) میں مرکز اسمست میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ برندو ندی کے کنارے ایک زرخیز گاؤں تھا۔ اس وقت تک ہندوستان سے ہر قسم کا فائدہ بخش تعلق منقطع ہوچکا تھا اور مرکز (ہر چند اب بھی موجود ہے) مقامی سیاسی ماحول میں مدغم ہوگیا۔

باب ۱۰

وہابی تحریک کا جائزہ

(۱) وہابی تحریک کی نوعیت:

وہابی تحریک کا آغاز تو ایک سماجی مذہبی جذبہ کے تحت ہوا تھا لیکن جلد ہی اس نے خصوصًا برادرانِ حق کی قیادت میں اور بعد میں سیاسی رُخ لے لیا۔ بعد میں بعض بندۂ غرض مصنفوں نے پوشیدہ اغراض سے اس کے مذہبی پہلو کے دکھانے میں بالقصد مبالغہ اور غلو سے کام لیا۔ اس تحریک کے متعلق جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ خالص مذہبی تحریک تھی اور خاصتہً سکھوں کے خلاف چلائی گئی تھی۔ یہ اُس کی تمام تاریخ کے درخت کو حد سے زیادہ کاٹ چھانٹ کر ننگا کر دینا ہی نہیں بلکہ اس کے اصلی اغراض و مقاصد کا جان بوجھ کر حلیہ بگاڑ دینا ہے۔

وہابی انگریزوں کے خلاف جو لڑائیاں لڑے ان میں سے بعض کا بیان اوپر کیا گیا۔ یہ بھی دکھایا جا چکا کہ جب سکھوں کا وجود ایک سیاسی وحدت کی حیثیت سے ختم ہو چکا تھا اس کے بعد بھی مدت دراز تک ان کی حربی کشمکش جاری رہی، گو یہ بھی صحیح ہے کہ سید احمد کے حینِ حیات میں سرحد شمالی مغربی کو بنیادِ عمل منتخب کر لیا گیا تھا اور پہلا دور سکھوں ہی کے خلاف پیکار سے شروع ہوا تھا۔

تھی کہ سید احمد اپنے پیچھے کسی مخالفانہ کارروائی کے خطرے سے محفوظ تھے۔ اس کے پیچھے بعض ریاستوں کا بلا مداخلت غیرے ایک محفوظ خطہ تھا جن کے سرداروں سے وہ کئی برس سے مراسلہ و مرابطہ کر چکے تھے اور اپنا مقصد عظیم ان پر واضح کر چکے تھے۔ اور جنوب و مشرق کی طرف اپنی مجوزہ پیش قدمی کی صورت میں وہ بلوچستان، بہاولپور اور سندھ کی ریاستوں سے جو ان کے مجوزہ راستے میں پڑتی تھیں دوستانہ تعاون کی امید رکھ سکتے تھے۔

وہابی تحریک کا بنیادی مقصد: سید احمد کا سرحد کو مرکز منتخب کرنا زیادہ تر انھیں خیالات کے زیر اثر تھا۔ لیکن اس انتخاب سے ناگزیر ہو گیا کہ پہلی جھڑپ سکھوں سے ہو جن کا علاقہ سید احمد کی مشرق کی طرف پیش قدمی میں پڑتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہابیوں کو انگریزوں کے خلاف سکھوں سے مگر ایک متحدہ محاذ قائم کرنا تھا لیکن کسی فریق نے یہ سیاسی پختگی نہیں دکھائی۔ اس کے برخلاف سکھ انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ کر چکے تھے۔ سکھوں سے تصادم ایک ناگہانی واقعہ تھا اور اس سے تحریک کا اصل مقصد ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ انگریزوں کے ساتھ طاقت کی آزمائش ابتدائی قدم تھا۔ کیونکہ خود سید احمد کی تحریر اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ان کے دماغ میں یہ خیال رچا ہوا تھا کہ ان کے اصل دشمن "سوداگر اور بنیے" (انگریز) تھے۔

سید احمد نے اپنے مکتوب میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض کے اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ سید محمد سکندر شاہ حیدر آباد کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "لامشیت ایزدی سے ہندوستان مشرکین اور یورپی تاجروں نے کئی معزز و موقر لوگوں کی زمینوں پر تغلب و تصرف کر لیا ہے۔ اہل علم و اہل صدق کی شان و وقار کو خاک میں ملا دیا ہے"۔ ایک اور خط میں دولت راؤ سندھیا کے بہنوئی ایک ہندو راؤ کو لکھا ہے "دور دراز ممالک کے اجنبی، ملکوں کے حکمران بن گئے ہیں اور سوداگر اور بنیوں نے سلطنت کا درجہ حاصل کر لیا"۔

ایک اور مکتوب میں "میرا اصل مقصد جہاد قائم کرنا اور جنگ کو ہندوستان لے جانا ہے، خراسان کی سرزمین میں پڑا رہنا نہیں"۔ شاہ اسمٰعیل نے جو کہ ان میں سید احمد کے دوسرے نمبر پر تھے تحریک کے اصل مقاصد کے متعلق چند سوالات کے جواب میں زیادہ وضاحت سے تشریح کی ہے۔ میر شاہ علی کے جواب میں لکھتے ہیں "ہماری طاقت رنجیت سنگھ اور کمپنی کے برابر تو نہیں مگر یہ تم سے کس نے کہا کہ امام کا ارادہ اس چھوٹی سی فوج کے ساتھ لاہور اور کلکتہ کی طرف پیش قدمی کرنے کا ہے؟ اس کے برعکس وہ دن رات مسلم فوج کی تکثیر و ترقی میں مصروف ہیں ......" یہ اقتباسات اپنی دلیل آپ ہیں اور کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ سید احمد کے مکتوبات میں ہندوؤں کی طرف [illegible] اشارہ یا کوئی ایسا حوالہ جس سے اس تحریک کا ہندوؤں کے من حیث ہندو ہونے کے خلاف ہونا ظاہر ہو۔ اس کے برخلاف ان کا ایک معنی خیز مکتوب ایک بااثر ہندو سردار ہندو راؤ گوالیار کے نام ہے جس میں اسے یقین دلایا ہے کہ جب انگریزوں کو شکست ہو جائیگی تو کچھ شرائط کے ساتھ ہندو حکمران سرداروں کے اختیارات بحال کر دیئے جائینگے۔ سید احمد نے لکھا تھا "جوں ہی ارض ہندوستان غیر ملکی دشمنوں سے پاک ہو جائے اور اہل ہند کی جدوجہد سے ان کا مقصد حاصل ہو جائے ریاست اور منصب کے عہدے اور منصب مستحقین کو دے دیئے جائیں گے اور ان کی طاقت اور اختیارات کی بنیاد مستحکم ہو جائیگی" سید احمد نے اس کو مزید فہمائش کی کہ ان رضاکاروں کے خاندان کی نگرانی کرے جو ہندوستان سے ان کے ساتھ سرحد کو ہجرت کر کے آ گئے ہیں۔ سید احمد کا ہندو راؤ کو مدد کا یقین دہانی ہی نہیں بلکہ فوجی امداد کا مطالبہ نہایت معنی خیز اور غور طلب ہے۔

متعدد ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہابیوں نے جو چندے جاری کئے تھے ان میں ہندوؤں نے بھی شرکت کی۔ رپورٹ میں بمبئی کے ایک جلسے کا واقعہ پیش کیا ہے جس میں ایک وہابی مقرر کے سامعین میں زیادہ تر ہندو تھے اور مقرر نے عیسائی مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا[1]

[1] جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۲۸ صفحہ ۲۶۳

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سرحد کو روپیہ بھیجنے کا نہایت رازدارانہ اور خطرناک کام اُن ساہوکاروں کی معرفت ہوتا تھا جن میں بہت سے ہندو تھے۔

وہابی تحریک کا دینی پہلو: ان تمام باتوں کے معنی تحریک کے دینی پہلو سے چشم پوشی نہیں۔ درحقیقت تحریک کی بڑی کمک نی کم سے کم سید احمد کے حین حیات میں دینی تھی، مگر مذہبی پہلو کا منشا قوم کی حیاتِ نَو سے بعض سماجی مذہبی برائیوں کی اصلاح تھا نہ کہ دوسرے فرقوں کے خلاف مذہبی تعصب کے بیج بونا۔ سید احمد غیر خدا کے پرستار اور منافق وزیاکار مسلمانوں کی مذمت میں بہت بیباک تھے۔ حقیقتاً سکھوں کی مخالفت سے زیادہ وہ ایسے مسلمانوں کی مخالفت پر زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ امت مسلمہ میں سماجی مذہبی اصلاحات کی ضرورت کا یہ چارا اسی لئے کیا جاتا تھا کہ اسے آنے والی سیاسی کشمکش کے لئے قوی تر اور لائق تر بنایا جائے۔ جیمس اوکینلی، سرسید اور ان کے بعد کچھ اوروں نے اس کے مذہبی پہلو کی نشان دہی ہی (جو حقیقی چیز ہے) نہیں بلکہ پوری تحریک کو مذہبی اور صرف سکھوں کے خلاف قرار دینے میں غلطی کی ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا جرح و دلائل کے مقابلے میں تحریک کی پوری تاریخ سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔

وہابی تحریک کے متعلق ہنٹر کا نظریہ: وہابی تحریک کی تاریخ کی ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی اصلی غرض وغایت کی غلط ترجمانی کرنے والے صرف ہنٹر اور دوسرے یورپی مصنفین جیسے تھنڈری نہیں بلکہ بہت سے ہندوستانی بھی ہیں اور زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ خود اس کے کچھ متبعین بھی ہیں۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ تحریک کے سب سے پہلے اور سب سے لبیا حالات لکھنے والا اور شائع کرنے والا ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر تھا۔ اُس نے لکھا کہ بعض سیاسی اقتصادی اسباب کی بنا پر ہمارے مسلمان من حیث القوم حکومت (برطانوی) کے مخالف ہیں۔ یہ خیال اُس کی کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے "ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ کیا وہ ایمان سے ملکہ کے خلاف بغاوت کے لئے مجبور ہیں؟" وہابی تحریک کی تاریخ کی جدید تدوین اور بالخصوص اس کے طرز تنظیم کے سمجھنے میں ہنٹر کی تحریریں بڑی

قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اس نے اپنے غور و فکر سے تحریک کی مخالفِ انگریز ہونے کا جو نتیجہ نکالا ہے وہ ہے تو بالکل ٹھیک مگر اس موضوع پر اس کے عام طرزِ بیان میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اُس نے تحریک کے فرقہ وارانہ پہلو پر مبالغہ کے ساتھ زور دیا ہے۔ اُس نے ہر بات کو ہندو مسلم فرقہ وارانہ تصادم کی اغراض سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں اُس نے تحریک کے زیادہ وسیع سیاسی مذہبی پہلوؤں سے اغماض کیا ہے۔

ہنٹر کے استدلال سے مسلمانوں کے ماتھے پر مخالفتِ حکومت کا جو ٹیکہ لگتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقے نے بڑا مان کر اس کی تردید کی۔ اس طبقے کے لکھنے والوں نے حکومت کی وفاداری کے بلند بانگ اعلانات میں گزشتہ تحریک کو تعبیر کیا نیز وہابی تعلیمات کی تردید میں وہابیوں کو مسلمان ماننے سے بھی انکار کیا ہے۔ اس کی مقدار اتنی ہے اور صاف طور پر ایسی نوعیت وغیرہ کی ہے کہ یہاں تفصیل سے اس پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ خود ہنٹر[1] اُس بلند بانگ اعلانِ وفاداری کے متعلق مشتبہ ہو گیا۔

ہنٹر کے نظریہ کی تردید: ہندوستانی مسلمانوں کے اور زیادہ ذمہ دار طبقے نے بھی ہنٹر کے نظریہ کی تردید کی۔ ان میں سر سید احمد خاں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اور ہنٹر کی کتاب پر ان کا تبصرہ و تنقید اس طبقے کی تحریرات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ انھوں نے یہ تنقید[2] ہنٹر کے دعوے کی صاف صاف تردید میں لکھی۔ انھوں نے ثابت کیا کہ وہابی نہ انگریزوں کے خلاف ہیں نہ حکومت کے۔ انھوں نے اس نکتے پر زور دیا کہ وہابی تحریک خالصۃً سکھوں کے خلاف چلائی گئی تھی۔ تحریک پر ان کی بعض رائیں قابلِ توجہ ہیں۔ شاہ اسمٰعیل کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس مبلغ نے اپنی تمام زندگی میں ....

۱؎ اور انڈین مسلمانز صفحہ ۱۴۲ ۲؎ یہ تنقید جو علیحدہ شائع کی گئی ہے وہ گراہم کی "سر سید احمد کی زندگی اور کارنامے" میں ۱۸۸۵ء لندن میں دوبارہ مختصراً شائع کی گئی ہے، جو صفحہ ۲۰۵ تا ۲۴۴ ہے۔ یہ اقتباسات اُسی سے ماخوذ ہیں۔

ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جسے اس کے ہم مذہبوں کو انگریزوں کے خلاف اکسانے سے تعبیر کیا جا سکے۔" ایک اور مقام پر انھوں نے ظاہر کیا کہ انھوں نے کہا تھا کہ "انگریزی حکومت میں مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔" برادران علی کے متعلق انھوں نے لکھا کہ "ولایت علی اور عنایت علی۔ اور ان کے ذیلی متبعین سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے مترشح ہو کہ انھوں نے ہندوستان میں انگریزی طاقت کے خلاف کوئی سازش کی تھی۔ آخر میں انھوں نے نتیجہ نکالا کہ وہابی جہاد جسے ہمارے مؤلف (ہنٹر) نے انگریزوں کے خلاف ظاہر کیا ہے دراصل صرف سکھوں پر چڑھائی کے لئے مقصود تھا۔"

سرسید احمد خاں کا طرز اصلاح: مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی احیا میں سرسید کی خدمات رہنمائی اتنی مسلم ہیں کہ یہاں ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں لیکن وہابی تحریک کے سیاسی پہلو کے متعلق ان کا نظریہ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر ہم قوم میں مغربی خیالات کی نشر و اشاعت کرنے اور تعلیم عامہ کے لئے ان کی جدوجہد کے پس منظر میں اس موضوع پر ان کے نظریوں کو دیکھیں تو ہم ان کی توجیہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے ایک نیا مکتب فکر پیش کیا جس نے ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل مغربی خیالات سے کنارہ کش رہنے یا مخالفت کرنے میں نہیں بلکہ ان خیالات کے اپنانے اور اپنے آپ کو ان کے مطابق کر لینے میں مضمر ہے۔ انگریزی حکومت اور مغربی خیالات کے خلاف کسی سیاسی تحریک کا اجرا و قیام ان کے مکتب فکر سے متضاد تھا اسی لئے انھیں اس تحریک کی نوعیت کی یہ عجیب تاویل و تعبیر کرنا پڑی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی بعض نہایت ضروری سماجی مذہبی اصلاحات جاری کرنے کے لئے وہابیوں کی مساعی سے ہمدردی اور تحسین کا احساس بھی اس تنقید کے اکثر حصوں میں صاف نمایاں ہے۔

حریف سکھ تھے یا انگریز؟: مصنفوں کے ایک گروہ میں خود وہابی بھی ہیں جنھوں نے معلوم اسباب کی بنا پر یہی لنگڑی لولی تاویل پیش کی ہے۔ ان میں سب سے پہلے جعفر تھانیسری تھے۔ اپنی تصنیف کے آخری حصے میں انھوں نے سید احمد کے کوئی ۹۵ مکتوبات کا متن اور بعض اور اصحاب جیسے شاہ اسمٰعیل کی تحریریں شائع کیں۔ واضح رہے کہ سید احمد کے مکتوبات کے کئی اور مجموعے بھی موجود تھے، مگر یہ سب مخطوطات تھے اور آسانی سے دستیاب نہ تھے۔ ان کے مطبوعہ نسخے سہل الحصول تھے۔ اور تحریک کے ایک سرکردہ رکن کے قلم سے نکلی ہوئی

تحریر کی حیثیت سے اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ مطبوعہ مکتوبات کی اصلیت بلا تاخیر مان لی گئی تھی یہاں تک کہ فی الحال محفوظ نسخوں سے مقابلہ کیا گیا[1] اور یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ بعض مکتوبات میں کئی دقیق تبدیل الفاظ اور دوسرے تصرفات کئے گئے ہیں[2]۔ یہ ترمیمات یا انحرافات ایسے ہیں کہ بعض بنیادی باتوں میں پورے مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔

واقعات کے متعلق عمداً تحریف: جعفر کے اس طریق کار پر یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تالیف ایسے وقت میں شائع ہوئی جب انگریز پوری طاقت سے برسر اقتدار آچکے تھے اور ان کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی تھی۔ لیکن وہ ان مکتوبات کی اشاعت سے قطعی احتراز کر کے اپنے ضمیر کو سلامت رکھ سکتے تھے۔ الفاظ میں عمداً تحریف کر کے وہ واقعات کے توڑ مروڑ یا غلط بیانی اور تحریک کی ضرر رسانی کے مجرم بھی ٹھہرتے ہیں۔ ایک دوسرے مولف جو اسی تذبذب کا شکار ہوئے وہ عبدالرحیم عظیم آبادی تھے۔ وہ اپنی بیش بہا کتاب تذکرہ صادقہ میں بالقصد غلط بیانی کے مرتکب تو نہ ہوئے مگر انگریز حاکموں کی رواداری عدل گستری اور رحمدلی کی مدح گوئی ہی نہیں کی ہے بلکہ برادران علی کے انگریزوں کے خلاف جد و جہد کو خفیف کر کے دکھایا ہے۔

تحریک پر خود وہابیوں کی ان نگارشوں کے ساتھ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر کچھ انگریز مولفوں کے تبصروں کا ذکر بھی کر دیا جائے جنھوں نے خود سید احمد کے زمانے میں تحریک کی انگریز دشمنی کے اظہار میں زیادہ صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ ہیلو یوسف زئیوں پر اپنی رپورٹ میں سید احمد کے بارے میں لکھتا ہے "یہ شخص کوئی اور نہ تھا بلکہ میر سید احمد بریلوی ہی تھا جو ان علاقوں میں سید بادشاہ کے نام سے معروف تھا ...... جس کے کردار ایک مختصر عرصے تک کامیاب رہا جب کہ وہ مختلف ہمسایہ مسلم حکمرانوں کے کمزور دل اور لوگوں کو بہکایا کرتا تھا کہ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں جو اسلامی سلطنت کے

---

[1] دیکھیے ص ۲۵ – ۲۲۶ نیز ملاحظہ ہو مقالہ [illegible] سید حسن عسکری بعنوان "سید احمد بریلوی کی تحریک کا [illegible]" [illegible] جلد [illegible]

تمنا ہے نہ انتظامی اختیارات کی آرزو۔ نہ کبھی دولت جمع کرنے کا خیال میرے دل میں آیا۔" یہ
بار بار دہرایا جانے والا دعویٰ محض خالی خولی عجز و انکسار کی نمائش نہ تھی۔ فتح پشاور کے بعد ان
کا کردار اس کی صداقت کی بیّن دلیل ہے۔ سلطان محمد خاں صاف طور پر جنگ میں زبردست
شکست کھا چکا تھا لیکن سید احمد نے حکومت اُس کو واپس کر دی۔ انھوں نے اپنا اقتدار یہیں
تک محدود رکھا کہ قاضی اور اخلاق عامہ کے محتسب مقرر کئے۔ اس سلسلہ کی ایک اور مثال
یہ ہے کہ کچھ پہلے رنجیت سنگھ نے جو پیشکش کی تھی کہ وہ اپنی مخالفانہ کشمکش ترک کر دیں تو ستلج کے پار
علاقے میں انکو آزاد ریاست عطا کر دی جائیگی۔ اسے انھوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سید احمد کا عزم
اپنے لئے کسی ریاست کا حصول نہ تھا بلکہ اس سے بہت اعلیٰ و ارفع۔

سید احمد کے ریاست کا تخیل بھی ایک خاص رنگ کا تھا۔ ان کا خاص نقطۂ نظر یہ تھا
کہ سلطان کا دنیاوی اقتدار اور امام کے مذہبی فرائض ساتھ ساتھ چلیں۔ انھوں نے دونوں
کے میدانِ عمل کی مبہم طور پر تعیین کر دی تھی، مگر ساتھ ہی امام کے لئے ایک [illegible]
نگراں اگو غیر مخل ہ کے تقرر کی سفارش کی۔ مگر یہ نظریہ ان کی زندگی تک خوابیدہ سا رہا۔ نہ
نافذ کیا جا سکا نہ پوری طرح عمل میں لایا جا سکا۔

سید احمد پر بعض سماجی مذہبی صورت حال اور غیروں کی اقتدار کے روز افزوں نفرت
کا بہت سخت اثر تھا۔ وہ ان مفسدات کو دفع کرنے کے لئے اپنے نسبتاً [illegible]
زندگی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا مقصد مخلصانہ اور بے غرضانہ تھا۔ وہ اپنے مشن کی تکمیل کے
بعد شاید اپنے قدیم مشغلہ کی طرف لوٹ آنے کا قصد رکھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کچھ عجب
سے کسی قدر ایک ہندوستانی گیری بالڈی نظر آتے ہیں۔ مگر گیری بالڈی کے برخلاف زندگی میں
اپنے مقصد کا کامیاب انجام دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔

وہابی تحریک کا سیاسی پہلو: تحریک کے سیاسی حصے نے جو سید احمد کی زندگی میں صاف
عیاں تھا بعد کے دور میں فیصلہ پایا۔ خالص مذہبی اور اخلاقی حیثیت کا زور سیاسی جذبات
میں منتقل ہوگیا۔ منفرد بھی بغیر محسوس تغیر ہوئے جو شروع ہو گیا تھا۔ مذہبی عنصر پر
زور گھٹنے لگا۔ تحریک کے قدیم ترقی پذیری کے تحت ہی اس کے انحطاط کے آثار نظر آنے لگے

تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پٹنہ کے داعیوں نے بھی اس کو صاف طور پر محسوس کر لیا تھا اور اپنی تعلیمات کو زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اس دور میں وہابی داعیوں کی تعلیمات سے متعلق رودادوں میں خالص مذہبی مباحث کا کوئی حوالہ مشکل سے ملتا ہے۔ بے شک اب بھی اسلام کے ان فرائض کا جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کی بجا آوری پر زور دیا جاتا تھا مگر وہابی کارکنوں کا اصل کام چندے جمع کرنا اور مرکز کی فوجوں کے لئے سپاہ کا اغوا رہ گیا تھا۔ ان کی تعلیمات کا نچوڑ غیر ملکی حکام سے جہاد کا فرض رہ گیا تھا۔ ۱۸۲۵ء سے لیکر غزوۂ امبیلہ کے اختتام تک انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کے سلسلے میں شاید ہی کوئی مذہبی مسئلہ سامنے آیا ہو۔ اس کے برخلاف اس زمانے میں اور اس کے بعد تک بھی وہابی انگریزوں کے لئے مستقل سیاسی خطرہ بنے رہے۔ وہ مخالفت و مزاحمت کے مستعد کارکن بنے رہے اور ہمیشہ قبائل کی معمولی معمولی بے چینی کو ہوا دیکر انگریزوں کے خلاف عام جنگ کی شکل دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اس زمانے میں وہابیوں کی جدوجہد کا رقبہ اور ان کے اثر کی حدود بھی بہت کچھ وسیع ہو گئی تھیں۔ وہابیوں کی سازشوں کا جال جو کچھ پہلے پٹنہ سے تمام بنگال تک پھیلا ہوا تھا، اب ۱۸۶۴ء کی تحقیقات کے دوران میں ملک کے زیادہ حصوں میں پشاور سے بجنور تک اور ڈھاکہ سے پٹنہ تک پھیلا ہوا تھا۔

غیر وہابی عناصر کی شمولیت ظاہر ہے کہ اتنی وسیع الذیل تحریک بیشتر غیر وہابی عوام کی عملی اعانت و حمایت کے بغیر زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی تھی۔ سرحد کو روپے کی خفیہ ترسیل کے کام میں ہندوستانی ساہوکاروں کا تعاون جو پہلے سے جاری تھا اس زمانے میں اور بڑھ گیا۔ اس زمانہ کی سرکاری رودادوں میں ہندو ساہوکاروں کے بارے میں اکثر حوالے ملتے ہیں جن کا کاروبار سارے شمالی ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ اگر سب نہیں تو کچھ ساہوکاروں کو ضرور معلوم ہوگا کہ جن لوگوں کے معاملوں میں یہ حصہ لے رہے ہیں وہ کوئی معمولی کاروباری نہیں بلکہ ان کے پیچھے کوئی زیادہ گہرا اور شاید خطرناک مقصد پوشیدہ ہوگا۔ روپے کی ترسیل ہندوؤں کے لئے محض کمیشن اور زر مبادلہ کے منافعوں کا لالچ اس خطرناک کام

میں اتنے ساہوکاروں کی مستعدی سے شمولیت کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

وہابی تحریک کا قومی رنگ: غیر وہابی عناصر کی زبردست اعانت اور اسی قسم کی دوسری تدبیروں نے اس تحریک کو قومی رنگ دے دیا۔ قدرتاً ان کو مذہبی جھگڑوں یا فرقہ وارانہ موشگافیوں سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ ہندوستان میں اس تحریک کا روزنامچہ نویس ریباتسیک اس غور طلب مسئلہ کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلاتا ہے: "لیکن وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ وہابیوں کی اصلی تعلیمات پر جیسے اخلاق، پاکبازی، مشرکانہ رسوم کا قلع قمع جن کی شروع میں بڑے جوش و خروش سے تاکید کی جاتی تھی ایسی چھا گئیں کہ ان سب کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا[1]۔ ایسی مثالیں جہاں ان کے داعی و مبلغین صرف دینی امور پر بحث کرتے اور سیاسی مسائل سے اجتناب کرتے اب قریب قریب معدوم ہیں۔ ایسے مسائل پر گفتگو سے سامعین آہستہ آہستہ مجلس سے کھسک جاتے۔ ہنٹر بھی تحریک کی روش میں اس تغیر پر یوں تبصرہ کرتا ہے: "اخلاقیات کی مستحسن ترویج سے آغاز کرنے کے بعد انھوں نے اپنے پیغام کے روحانی عنصر کو بتدریج ترک کر دیا اور فطرت انسانی کے بدترین جذبے کو یعنی کہ انتقام و بزدلانہ مقصد کو فروغ دینا شروع کیا[2]"۔

اس سے معلوم ہوگا کہ قدرتاً عوام کو تحریک کے مذہبی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی مگر اس کی سیاسی اور مخالفِ حکومت اپیل ہی زیادہ عملی اور معقول دکھائی دی جس پر جینے کے لئے وہ تیار ہو گئے۔ اس طرح تحریک کی روش میں تغیر نے عوام میں اس اپیل کو وسیع تر کر کے اس کی حمایت و مقبولیت میں اضافہ کر دیا۔

ایک جدید مصنف اٹھارہویں صدی کے نصف دوم اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مختلف شورشوں کی نوعیت کا جائزہ لیتے ہوئے وہابی تحریک کے متعلق رائے زنی کرتا ہے: "وہابی تحریک کی مقبولیت عام … نے اپنی مضبوط

[1] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۲، صفحہ ۲۶۲۔

[2] اور انڈین مسلمین صفحہ ۷۵

مربوط تنظیم سے ملک کے طول و عرض میں ڈھاکا سے پشاور تک کے رنگروٹ اور روپے حاصل کر کے اپنا بول بالا کر لیا تھا۔ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جن تحریکوں کو جنم دیا اُن میں وہابی تحریک سب سے زیادہ بیداری اور سختی سے مخالفِ انگریز تھی اور ان کی تمام جدوجہد میں یہ صورت قائم رہی ......[1]

وہابی تحریک کے دو خاص پہلو تھے، سماجی مذہبی اور سیاسی۔ اول الذکر اسلامی معاشرے کی اصلاح سے متعلق تھا اور آخر الذکر کا تعلق انگریزوں کے ساتھ جہاد سے تھا۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں نے نیز بعض اور حالات نے تحریک کی رفتارِ ترقی کو متاثر کیا۔ اس کی تمام مدتِ رفتار میں ان پہلوؤں کی علیحدہ علیحدہ افادیت بدلتی رہی۔ اس لئے مجموعی طور پر تحریک کی عام نوعیت پر رائے زنی گمراہ کن ہوگی۔ پھر بھی نمایاں طور پر صاف نظر آتا ہے کہ سید احمد کی شہادت کے بعد کے دور میں تحریک کا سیاسی پہلو رفتہ رفتہ غالب آگیا اور اس کی تاریخ پر چھا گیا۔ زیادہ تر اسی دوسرے پہلو سے چشم پوشی کے سبب سے ہی عموماً اس کی نوعیت پر غیر متوازن نظر ڈالی جاتی ہے۔

(ب) وہابی تحریک کی کچھ خدمات اور اس کی ناکامی کے اسباب

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہابی تحریک کے کئی رُخ تھے۔ تحریک کے الگ الگ میدانوں میں اس کی کامیابی اور ناکامی کی مقدار بہت حد تک مختلف رہی ہے۔ اس لئے ان پر جدا جدا غور کرنا ہوگا۔ تحریک کی ناکامی پر عمومی طور پر یہ کہہ دینا کہ اس کا سبب سیاسی مقصد (انگریزوں پر فتحیابی) حاصل کرنے میں ناکام ہو جانا تھا گمراہ کن ہے۔ سیاسی میدان میں اس کی ناکامی پر بحث کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ غیر سیاسی عالم میں اس کی بعض خدمات کا مختصر ذکر کر دیا جائے۔

سماجی مذہبی اصلاح: سماجی مذہبی میدان میں اس کی کامیابی کی مقدار بہت کچھ ہے اس تحریک نے ہندی مسلم معاشرہ اور مذہب کے ساتھ تصادم اور کشمکش کا مقابلہ یک [illegible] معنی

---

[1] ایس بی چودھری مصنف CIVIL DISTURBANCES DURING THE BRITISH RULE IN INDIA کلکتہ (1955) صفحہ ۵۰

مبحث ہے جو علیحدہ اور پوری طرح مذاکرہ اور استقصا کا متقاضی ہے۔ ہم یہاں اس کے بعض خاص پہلو پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اس تحریک کے نشو و نما کے وقت جو سماجی مذہبی صورت حال تھی وہ مفصلاً بیان کی جا چکی ہے۔ بعد کی صورت حال پر ایک سرسری نظر وہابیوں کے آوردہ فرق ہی کو نہیں بلکہ ترقی کو نمایاں کر دیگی۔ بیواؤں کے نکاح ثانی کی ترویج و تبلیغ، ماتمی رسوم، بعض تیوہاروں اور تقریبوں میں تباہ کن فضول خرچی کا ترک، امید سے مردے علماء کی گردنوں کو ملاؤں کے پنجے سے چھڑانا، قبروں کی پرستش، مردوں سے مدد یا مانگنے کے عام رواج کا ترک، اور پاک و صاف پیشہ اختیار کرنا یہ تھے وہابیوں کے آوردہ بعض اصلاحات کے کچھ درخشاں پہلو۔

اردو کی خدمت: وہابی تحریک کا ایک اہم اور نظروں سے پوشیدہ ضمنی فیضان وہ زوردار جنبش ہے جو اس نے اردو زبان خصوصاً نثر نگاری کی رفتار ترقی کو دی۔ اپنے پیغاموں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش میں دوسری تبلیغی تحریکوں کی طرح اس نے مقامی زبانوں کے استعمال پر بہت زور دیا۔ اگرچہ اعلیٰ طبقہ کی عام زبان فارسی تھی، وہابی قائدین نے اردو کا زیادہ استعمال کیا اور اسی زبان میں بہت زیادہ رسالے لکھے۔

سیاسی تنظیم کا نمونہ: وہابی تحریک نے اپنے پیچھے انگریزوں کے خلاف دیرانہ اور پائیدار کشمکش کی ایک حوصلہ افزا روایت اور ایک مستحکم و مربوط عمومی ہندوستان گیر سیاسی تنظیم کا ایک نمونہ بھی چھوڑا۔ اکثر حکمت عملیاں اور سیاسی چالیں جن کی ابتدا و عمل درآمد وہابیوں سے ہوئی بعد میں ابتدائی سیاسی جماعتوں خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس نے اختیار کر لیں اور ترقی دی۔ مجہول عدم موالات یا عدم تعاون، پنچایت کی ترویج، وفادار عناصر کا سماجی بائیکاٹ، حقہ پانی بند جیسا کہ ہنٹر نے تعبیر کیا ہے، یہ تمام حربے آزادی کی کشمکش کے دوران میں کمال کو پہنچ کر سیاسی احتجاج کے زبردست وسیلے بنائے گئے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی ابتدا وہابیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے ایک عام جلسے کی تقریر میں وہابیوں کے یکجا کئے ہوئے چندوں کی تحصیل کے ایک غیر نمایاں و دورس طریقہ کا ذکر خاص طور پر نمونہ کے طور پر کیا تھا۔ ضروری خبروں کے اعلان اور تمام ملک سے آدمی اور روپے کے بھیجنے بھیجوانے

ملحوظات سے جن کا ذکر ہو چکا سرحد کے علاقے کو اپنی کارروائیوں کا صدر مقام منتخب کیا
تھا۔ ان میں سے اکثر ملحوظات نظری اعتبار سے بالکل معقول و مناسب تھے۔ مگر ان کے
قیاسات کی ایک اہم کڑی یعنی قبائلیوں کا نہ صرف سہارا نہیں بلکہ عملی تعاون کے حصول
کی امید بعد کے واقعات سے خاک میں مل گئی۔ قبائلیوں کی متوقعہ ہمدردی اور اعانت کے
عوض انھیں ان کی پوشیدہ عداوت بلکہ کھلم کھلا مقاومت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

وہابی تحریک کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ قبائلیوں نے تحریک کی اصل غرض و غایت
کو نہ سمجھا اور اس کے سربراہوں سے حقیقی اور مستقل اعانت دریغ رکھی۔ اس میں وہابیوں
کا کوئی قصور نہ تھا۔ سید احمد کے دور سے ہی انھوں نے قبائلیوں کے ساتھ غیر معمولی
تحمل اور رواداری کا برتاؤ کیا۔ قبائلیوں نے بار بار ان کے ساتھ بدعہدی و غداری کی
کی جو جان و مال کی بربادی کا موجب ہوئی مگر وہ سب کو نظر انداز کرتے رہے۔ وہ نصف
صدی سے زائد تک پند و نصائح اور عمل سے اتحاد مقصد اور آزادی کے لئے قربانیوں کے
جذبے کو ان کے ذہن نشیں کرتے رہے مگر سب لاحاصل رہا۔ زیادہ تر انگریز مصنفوں نے
اور ان کے تتبع میں بعض جدید مصنفوں نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہابیوں کے شدید
دینی جوش نے قبائلیوں کی ہمدردی کھو دی۔ لیکن اس قیاس کی صحت میں کوئی دلیل پیش
نہیں کی جا سکتی کہ اگر یہ مفروضہ تقشف عمل میں نہ آتا تب بھی قبائلیوں کی روش کچھ اور نہ
ہوتی۔ اس کے برعکس شروع ہی سے جب وہابی متشددانہ اصول نافذ کرنے کی طاقت
نہ رکھتے تھے قبائلی وہابیوں کے ساتھ برتاؤ میں تلوّن و تزلزل اور اکثر اوقات غداری کا ثبوت
دیتے رہے۔ یہ زیادہ تر نتیجہ تھا تحریک کے متعلق وہابیوں اور قبائلیوں کے مختلف نقطۂ
نظر کا۔ قبائلی صرف اپنے سردار کے وفادار ہوتے ہیں اور عموماً دین و مذہب یا کسی تنظیم کے
تخیل سے زیادہ نسلی رشتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ قبائلیوں میں کبھی وہ بے غرضانہ جوش و جذبہ
نہیں دیکھی گئی جس سے وہابی سرشار رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ نہایت موقع پرست اور زر پرست
رہے۔ اگر وہ اس جد و جہد کی اصلی غرض و غایت کا ذرا بھی احساس رکھتے تو وہابیوں
کے نافذ کردہ تشدد و تقشف کے نام نہاد عائد کردہ الزام کو کبھی بھی اپنے اوپر

بھوپے ہوئے منتقمانہ دیندارانہ اقدامات کے متعلق کچھ نہ کچھ تو کرتے۔ لیکن وہابیوں کی اصلی
ناکامی یہ تھی کہ وہ اپنی وہ جوش اور بلند نظریہ جس نے خود ان کو متحرک کیا، قبائلیوں میں
پیدا نہ کر سکے اور ان کو اپنے اعلیٰ معیار عمل تک اٹھا نہ سکے بیشک یہ ہے کہ ہر تحریک میں عام افراد
متعلقہ میں اتنا جوش و جذبہ نہیں ہوا کرتا جتنا ان کے قائدین میں ہوتا ہے۔ لیکن بصورت موجودہ

ایک مرد ذات ستھا نہ سکے تنہا وہ پدر حشل کردار کے موا قبائیلیوں نے تحریک کی اصل
روح کو کبھی کسی مدت کے لئے واقعی طور پر اخذ نہیں کیا۔ اسی صورتِ حال نے وہابیوں کو اپنے
ہندوستانی مرکز کا زیادہ محتاج بنا دیا۔

امدادی مراکز سے دوری: بلاشبہ وہابیوں کی ہر قسم کے مادی سہارے کے لئے اپنے
ہندوستان کے مرکزوں کی قطعی محتاجی ان کی ناکامی کا دوسرا اہم سبب تھا۔ یہ مرکز بالکل
انگریز حکام کے رحم و کرم پر مبنی تھے ورنہ بلا زحمت دبا دیا یا بیخ و بن سے اکھاڑ بھی دیا
جا سکتا تھا۔

فوجی تدابیر کے ابتدائی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی کی ایک محفوظ و مختصر
راہ نکال لی جائے سامان: ذخائر کے بھیج بھی دو کا رستہ جو صرف یہی نہیں کہ ہزاروں ہزار
میل طویل ہو بلکہ بیشتر دشمن کی سرزمین سے گزرتا ہوا بھی ہے۔ وہابیوں نے ایسے رستے
کے خطرات کا اندازہ ضرور کر لیا ہوگا صرف وفاداری اور رازداری خواہ کتنی ہی اعلیٰ ہوتی
جائے زیادہ عرصہ تک اسے محفوظ نہ رکھ سکتی تھی۔ وہابی اسے محسوس تو بہت کرتے تھے
مگر ان کے پاس کوئی چارہ کار کم سے کم اس وقت کچھ اور نہ تھا۔

وہابی تحریک نے ہر صحیح العقیدہ فرد پر سرحد کو ہجرت کے فریضہ پر بہت زور دیا۔
قریب قریب سارے وہابی رسائل اس کی ترغیب و تاکید کے مضامین سے بھرے پڑے
ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے ان لوگوں کو جو کسی عذر سے فی الوقت ہجرت نہ کر سکیں رخصت
دی کہ جب تک وہ ہجرت کے قابل نہ ہوں تحریک کی مالی اعانت کرتے رہیں۔ اس طرح
ہندوستان میں تحریک کے مالی معاونین کا ایک طاقتور گروہ پیدا ہو گیا۔ وہابیوں کا مقصد شاید
یہ تھا کہ جیسے ہی سرحد پر ان کے قدم مضبوطی سے جم جائیں گے وہ ہندوستان کے مرکزوں

سے استمداد کے محتاج نہ رہینگے۔ مگر وہ منزل کبھی نہ آئی۔

قدیم اسلحہ سے جدید آلات حرب کا مقابلہ: آخر میں وہابیوں کا مادی وسائل میں اپنے حریفوں کے تقابل میں کچھ مہیا نہ کرسکنا ان کی ناکامی کا دوسرا اہم سبب تھا۔ خدا کا خوف، جوشِ جانبازی کسی مقصد کی کامیابی کے لئے کتنی ہی ضروری ہو، مادی وسائل کا کامل بدل نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں تمام مشرق کی طرح وہابی بھی حالات و ماحول کے مجبور اور بے بس شکار ہو کر رہ گئے۔ صنعتی انقلاب و دیگر فنی ترقیات نے مغرب کو وہ مادی وسائل خصوصاً ایسے اعلیٰ درجہ کے آلات حرب مہیا کر دیے تھے جن کے حصول کی اہل مشرق مستقبل قریب میں توقع نہ رکھ سکتے تھے۔ مکہ میں وہابیوں کا بارود کا تیار ہونے کا کارخانہ اور اس سے بھی زیادہ دقیانوسی بانس کے ٹکڑوں کی دستی توپیں نو ایجاد انفیلڈ رائفلوں کا کیا بدل ہو سکتی تھیں جو ۱۸۵۸ء کی مہم کاٹھ میں پہلی بار جدید استعمال کی گئی تھیں۔ آخری جائزے میں مغرب کا یہی مادی تفوق وہابیوں کے خلاف محاربہ میں فیصلہ کن ثابت ہوا اور یہی چیز مشرق و مغرب کے درمیان جنگ کی راہ کشائی [illegible] زوال پذیر سلطنت مغلیہ کی شکست سے لیکر ۱۸۵۷ء کی تحریک کی پامالی تک بہت سے بڑے بڑے اور مہتم بالشان معرکوں میں بھی فیصلہ کن ثابت ہوا کی۔ وہابی بھی اسی کا نشانہ بن گئے۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ زبردست حوادث جو اٹھارہویں صدی ہی سے بار بار رونما ہوتے رہے، ان کے اسباب و نتائج کو ۱۸۵۷ء کے قائدین پوری طرح سمجھے نہ وہابی۔ جب وقت و حوادث کے اسباب و نتائج ہی نہ سمجھے جائیں تو ان کے خلاف علاج و تدابیر کے اقدامات کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

تمت

اخلاف مجاہدین صادق پور کا "شعر"

آنکھ جب کھولی تو دیکھا میکدہ لوٹا ہوا | مے سبوئے بہہ چکی تھی دورِ خم ٹوٹا ہوا
ہر طرف بکھرے ہوئے تھے بادہ و جام و سبو | مست رقصی تھی [illegible]
مجھ زنداں میں ساقی غائب [illegible] | غضب کے خوف سے سہمے ہوئے تھے بادہ نوش

ہائے وہ اک سید ندوی شراب [illegible] | اور اک سر سید احمد خاں کی [illegible] فرنگ
وہ جنونِ سرفروشی [illegible] | دی تو تاثیر [illegible]

ضمیمہ جات

ایک کتب خانہ ورثہ میں ملا تھا جس پر انھوں نے گرانقدر اضافہ کر رکھا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کے بڑے بیٹے احمد اللہ کو ورثہ میں ملا۔ مگر ان کی گرفتاری کے موقع پر کچھ حصہ ضبط اور کچھ ضائع ہو گیا۔ الٰہی بخش ایک مشہور طبیب تھے مگر طبابت کو کبھی پیشہ کی طرح اختیار نہ کیا البتہ وہ دوائیں مفت تقسیم کرتے تھے۔ وہ فوجی تربیت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

احمد اللہ الٰہی بخش کے بڑے بیٹے سنہ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ولایت علی اور خاندان کے دوسرے افراد سے پائی۔ محمد حسین کی ایک بیٹی سے ان کی شادی ہوئی اس پہلی شادی سے ان کے چند بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں۔ پھر دوسری شادی سے ایک بیٹا ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے حکیم عبدالحمید اپنے زمانہ میں ہندوستان کے مشہور ترین اطبا میں سے تھے۔ اپنے باپ کی طرح عبدالحمید بھی شہر کے سماجی اور سرکاری حلقے میں بہت موقر تھے۔ پٹنہ میں مطبوعہ تصنیف اور علمی ذوق رکھنے والوں کی ایک فہرست جو حکومت ہند نے طلب کی تھی، اس کے جواب میں پٹنہ کے کلکٹر ایل نے لکھا تھا کہ: "یہ شہر کے ایک فاضل ترین شخص ہیں علما میں ان کو اس سلسلہ میں ایک علمی سند سمجھتا ہوں۔ اور میری رائے میں اب علم و فضل کا ذوق بہت کم ہو گیا ہے"۔ مقامی حکام اور عمائد شہر سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ کچھ مدت تک ڈپٹی کلکٹر اور انکم ٹیکس کے اسیسمنٹ کے بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ وہ پٹنہ کی تعلیم عامہ (پبلک انسٹرکشن) کی کمیٹی کے ممبر بھی مقرر کئے گئے تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں ٹیلر نے ان کو اور دیگر شہری شاہ محمد حسین اور واعظ الحق باشندگان پٹنہ کے ساتھ وہابیوں کے ایک قائد ہونے اور حکومت کے خلاف سازش کے شبہہ میں گرفتار کر لیا۔ مگر تین ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ یہ تمام واقعات اور آخر کار ان کی گرفتاری اور سنہ ۱۸۶۵ء کے مقدمہ کے حالات بیان ہو چکے۔

فیاض علی الٰہی بخش کے دوسرے بیٹے تھے جو سنہ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ولایت علی کی وفات کے بعد فرحت حسین نے ان کو پٹنہ بلا لیا۔ کچھ عرصہ تک یہ تنظیمی کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ فیاض علی خوش مزاج، خوش پوشاک اور تنہائی پسند تھے۔ وہ وعظ بہت کم کہا کرتے۔ یہ

کام ان کے چھوٹے بھائی یحییٰ علی کے سپرد تھا۔ فرحت حسین کی وفات کے بعد وہ پھر سرحد شمالی مغربی چلے گئے وہاں دم حیات وہیں مقیم رہے۔ انھوں نے اولاد نہیں چھوڑی۔

یحییٰ علی الٰہی بخش کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ فیاض علی سے دس سال چھوٹے تھے۔ ان کا قد اوسط، رنگ گورا اور جسم گٹھا ہوا۔ ڈاڑھی چھوٹی۔ چہرے پر چیچک کے نشانات تھے۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک لڑکی حمیدہ سے ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی ولایت علی سے بیعت کی تھی اور ان کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ یہ سرحد کے دونوں سفروں میں ولایت علی کے ساتھ تھے اور ۱۸۵۲ء میں ان کی وفات کے بعد پٹنہ واپس آئے۔ وہ بڑے بہادر تھے، اور بڑے بڑے خطروں کے مقابلے میں ان کی شجاعت و جرأت کے واقعات تذکرۂ صادقہ میں مذکور ہیں۔

بارہ سال (۱۸۵۲ء-۱۸۶۳ء) پٹنہ کے قیام کے دوران میں انھوں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے کارنامے انجام دیے۔ شاہ محمد حسین کی وفات کے بعد انھوں نے پٹنہ کی زمام تنظیم اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ ہر جمعہ کو تھوڑی جاتے (جو محمد حسین کی جائے قیام تھا)، اور صادق پور سے تھوڑی ہی دور واقع ہے۔ وہاں وہ نماز جمعہ پڑھتے، مریدوں سے ملتے اور مختلف امور پر گفتگو کرتے۔ رات میں دیر سے صادق پور لوٹتے۔ ہر منگل کو ولایت علی کے مکان میں وعظ کہتے، اور دور سے آنے والے رنگروٹوں کو دینیات اور دوسرے مسائل پر درس دیتے۔ اس زمانے میں وہ سرحد کو آدمی اور سامان کی ترسیل کے لئے پٹنہ کی نہایت خفیہ اور پیچیدہ تنظیم کے سربراہ تھے۔ اس زمانہ میں احتیاط کے پیش نظر ان سے مراسلات کسی اور کے فرضی نام سے ارسال کئے جاتے۔ پہلی بیوی سے ان کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی، اور دوسری سے ایک بیٹا تھا۔

تذکرۂ صادقہ کا جو نسخہ میرے استعمال میں ہے اس میں ان کے ایک مکتوب مورخہ ۲۱ جمادی الاول ۱۸۶۶ء[1] جو انھوں نے صادق پور کے گھر کے انہدام و بربادی کی خبر سن کر اپنی بیوی کو لکھا تھا منقول ہے۔ یہ ان ذات کا تنہا مکتوب ہے جو بچ رہا ہے اور انسانی نقطۂ نظر سے

---

[1] تعجب ہے کہ مہینہ کا نام قمری تقویم کے مطابق اور سال عیسوی تقویم سے درج ہے۔

بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ معمولی مدح و ثنا اور سابقہ خطوط کے حوالے کے بعد لکھتے ہیں
"ایک اہم بات قابلِ تحریر یہ ہے کہ قدیم مسجد کے متصل دونوں مکانوں کے انہدام کی
خبر معلوم ہوئی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو سخت کرب ہوا اس لئے کہ دونوں ہمارے
آبائی مکان تھے اور زیادہ اس لئے کہ وہاں اللہ کا ذکر ہوتا اور ہمیشہ اس کے احکام بجا لائے
جاتے۔ اور ان عبادت گزار مومنین صادق ان کو اپنے عزیز و اقارب کی طرح عزیز رکھتے تھے۔
اس کے بعد خود ہی وہ اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے آنحضرت صلعم
کی زیارت کی آپ نے ان کو تسکین دی کہ اللہ تعالیٰ اپنے سچے مومنوں کی عبادت اور ایمان
کا امتحان کرتا ہے۔ سوال میں پورے اترتے ہیں ان کو راحت جاوداں نصیب ہوتی ہے۔ جیسے
دشمنان خدا نے ماضی میں بیت المقدس کو تباہ کر دیا تھا مگر آخر اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی اور
اس کے تباہ کرنے والے مغلوب ہو گئے اسی طرح ان کے (مومنوں کے) گھروں کے تباہ کرنے
والے مغضوب و مقہور ہوں گے اور گھر دوبارہ تعمیر ہو جائیں گے۔"

ولی اللہ: الٰہی بخش کے دوسرے بیٹے تھے، مگر وہ اپنے تینوں بھائیوں کی طرح تحریک پر
زیادہ کام نہ کر سکے، کیونکہ ابتدائے عمر ہی میں ان کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ پچاس سال
کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

فتح علی: الٰہی بخش کی طرح یہ بھی معمر تھے۔ ان کے بھی متعدد فرزند تھے جنھوں نے
تحریک کی تاریخ میں امتیاز حاصل کیا۔ وہ وارث علی کے بیٹے اور ننھیال کی جانب
سے بہار کے ایک مشہور صوفی حضرت احمد چرم پوش کی خاندان سے تھے۔ وہ چودھویں صدی میں
بہار کے مشہور صوفی حضرت شرف الدین مخدوم سے نسبتاً مربوط تھے۔ خانقاہوں کے عام
دستور کے مطابق فتح علی کے مکان پر بھی پیری مریدی کی بہت دھوم دھام تھی لیکن سید احمد کی
پٹنہ میں تشریف آوری کے موقع پر انھوں نے سید احمد کو اپنے گھر دعوت دی اور اپنے تین بیٹوں
کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور یہ زیادہ تر ان کے بڑے بیٹے ولایت علی کی ترغیب
سے انجام پایا۔ انھوں نے سید احمد کے ہمراہ سرحد کے سفر کی خواہش بھی ظاہر کی مگر ان کی
کبرسنی کی وجہ سے ان کو گھر ہی کی خدمت پر آمادہ کیا گیا۔ وہ غزوہ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء)

کے فوراً بعد رحلت کر گئے۔

ان کی پہلی بیوی دختر شیخ ہدایت علی مہدانوی شادی کے فوراً بعد لاولد قضا کر گئیں۔ دوسری بیوی رفیع الدین حسین خاں کی دختر تھیں آخر الذکر مغبورہ پٹنہ سٹی کے ایک متمول رئیس سے ہوئی۔ اس نکاح سے ان کے چھ بیٹے ہوئے۔ ان میں سے دو کم سنی میں قضا کر گئے بیٹے دو ولایت علی، و عنایت علی کی زندگیوں پر بحث ہو چکی۔ تیسرے بیٹے طالب علی سرحد گئے اور وہیں وفات پائی۔ چوتھے فرحت حسین گھر کے مرکز پٹنہ کے سربراہ رہے اور ہمیشہ یہیں مقیم رہے۔

فتح علی کے پاس بھی کتابوں اور مخطوطات کا ایک گراں بہا ذخیرہ تھا جو ان کے پوتے عبدالرحیم کی گرفتاری کے زمانہ میں ضبط کر لیا گیا۔

طالب علی: ولایت علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی اور انھیں کے ہمرکاب سرحد چلے گئے۔ وہاں ابتدائی معرکوں میں شریک رہے اور پنجتار ہی میں بعارضہ ذات الجنب وفات پائی۔

فرحت حسین: ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں متولد ہوئے وہ پست قامت، لاغر اندام اور گندمی رنگ کے تھے۔ ڈاڑھی چھوٹی، بھویں جڑی ہوئی اور ان کے درمیان پیشانی پر ایک سرخ تل تھا۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک بیٹی سے ہوئی جس کے بطن سے عبدالرحیم مؤلف تذکرہ صادقہ پیدا ہوئے۔ بعد میں انھوں نے دو اور شادیاں کیں۔ وہ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷-۵۸ء) میں ۴۶ برس کی عمر میں رحلت فرما ہوئے۔

وہ پٹنہ کے مرکز کی تنظیم کے سربراہ ہوئے اور وقتاً فوقتاً ولایت علی کی پٹنہ سے غیر حاضری میں ان کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے گھر میں روزانہ جلسے ہوتے جہاں سماجی مذہبی مسائل پر تقریریں ہوتیں۔ ان میں مستورات بھی حاضر ہوا کرتی تھیں۔ ان سے علیحدہ تقریریں کی جاتیں اور کبھی ان کی بیوی بھی وعظ کہتیں۔ اس گھر سے مدرسہ کا مصرف بھی لیا جاتا۔ طلبہ کی ایک کثیر تعداد مختلف موضوعات پر درس لیتی۔ اکثر مولانا یحییٰ علی پڑھاتے۔ طلبہ کے طعام و قیام کے اخراجات بیت المال سے پورے کئے جاتے۔

پٹنہ کی شورش کے موقع پر پیر علی اور شورش کے دوسرے سربراہ وہابیوں سے مربوط

فرحت حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ان کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ ان کے انکار کے اسباب اور ۵۸-۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں کی عام روش پر اوپر بحث کی جا چکی۔

عبداللہ: ولایت علی کی دوسری محل مردالنساء سے ۱۲۳۶ھ (۲۱-۱۸۲۰ء) میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد ولایت علی کے سرحد کے متعدد سفروں میں ان کے ساتھ تھے اور وہاں مختلف معرکوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۴۷ء میں پٹنہ کی مراجعت کے بعد وہ دینی تعلیم میں مصروف رہے۔ اسی زمانے میں فرحت حسین کی بیٹی سے ان کی شادی ہوگئی۔

ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا عنایت علی سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ رہے اور پٹنہ چلے آئے۔ چند سال فرحت حسین کے پاس رہ کر تنظیمی امور میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ فرحت حسین کے انتقال کے بعد اپنے دو بیٹوں اور دو بہنوں کے ساتھ سفر حج کو روانہ ہو گئے۔ حج سے افغانستان آئے اور وہاں سے سوات سید اکبر شاہ کے پاس چلے گئے جو سرحدی مجاہدین کے پرانے سرپرست اور میزبان رہے تھے۔ وہاں وہ وہابی نو آبادی کے سردار منتخب ہوئے۔ غزوۂ امبیلہ انھیں کی قیادت میں لڑا گیا۔ ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی عبدالکریم ان کے جانشین ہوئے۔ قلعہ کی تعمیر، توپ اندازی اور سواری کے فنون میں ان کی مہارت مسلم تھی۔

عبدالرحیم: فرحت حسین کے بیٹے تھے۔ شعبان ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خاندان کے متعدد بزرگوں جیسے فیاض علی و عبدالحمید وغیرہ سے حاصل کی۔ ان کے والد کی وفات اور عبداللہ کی سرحد پر تعیناتی کے بعد گھر میں تنظیمی کاموں کا سارا بوجھ ان کے اور یحییٰ علی کے کاندھوں پر آ پڑا۔ انبالہ کے مقدمے میں یحییٰ علی کے ساتھ یہ بھی مدعا علیہ تھے۔ اور حبس دوام کے سزایاب ہوئے۔ بحرۂ سیاہ سے رہائی کے بعد ۱۸۸۳ء میں ان کی میعاد سزا ختم کی گئی۔ پٹنہ واپس آئے۔ اور اپنا آبائی مکان ایسا منہدم پایا کہ اس کی شناخت بھی ناممکن تھی۔ تمام افرادِ خاندان منتشر تھے۔ خاندانی کتب خانہ بھی جو گذشتہ چودہ پشتوں سے منتقل ہوتا آیا تھا، نہ چھوڑا گیا تھا۔ رہائی کے بعد بھی ان کی نقل و حرکت پر سیاسی پابندیاں برقرار تھیں۔ ہر دو ہفتے پر پولیس میں حاضری دینا پڑتی تھی۔

قید میں بیس برس وطن سے غیر حاضری کے بعد اب انھوں نے اپنے عزیزوں اور تمام شہر کی زندگی میں ایسا انقلاب پایا کہ تمیز و شناخت ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اس نئی دنیا اور متغیر ماحول میں جو ان کی نگاہ میں غیر دینی اور غیر اخلاقی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا اور افسردہ پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے حکومت سے سفر حج کی اجازت طلب کی جو بڑی بڑی مشکلوں سے منظور ہوئی۔ بمبئی اور جدہ تک پابندیاں برقرار رکھی گئیں۔ حجاز میں بھی ان کو برطانوی قنصل میں حاضری دینے کا حکم تھا۔ بعد میں سنہ ۲۱ میں [illegible]

انڈمان سے مراجعت کے بعد انھوں نے اپنی خانگی زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر جوڑا۔ اس زمانے میں ان کے کچھ اولاد ہوئی اور اپنی کئی اولاد کی شادیاں کیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے خاندان کے ارکان کی سوانح۔ وہ کتاب تیار کیں جو تذکرہ صادقہ کے نام سے زیادہ معروف ہیں اور جو تحریک کے اہم ترین مطبوعہ ماخذ میں سے ہے۔ وہ ۶۹ سال کی پختہ عمر میں سنہ ۱۳۲۳ میں رحلت فرما گئے۔

باقر علی فتح علی کے بھائی بشارت علی کے بیٹے اور ولایت علی کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی کم سنی میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور چچا نے ان کی پرورش کی۔ سید احمد کے سرحد کے ابتدائی قیام کے دوران میں وہ رسد کی تقسیم پر متعین تھے۔ ذخائر کے حصول تحفظ اور تقسیم کے عام کاموں میں محمد ولی پھولتی کے معاون تھے۔ ان کو یہ امتیاز نصیب تھا کہ وہ پہلے مجاہد تھے جس نے اپنے مقصد معینہ کے لئے جان دی۔ وہ ۲۰ دسمبر سنہ [illegible] کو معرکہ کوڑہ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف تیس سال تھی۔

قمر الدین حسین رکن الدین حسین کے بیٹے اور مغیوہ (پٹنہ سٹی) کے رفیع الدین حسین خاں کے پوتے تھے۔ ان کی شادی احمد اللہ کی بہن سے ہوئی تھی۔ سید احمد کے ہمرکاب سرحد گئے تھے۔ اور مظہر علی جب پشاور کے قاضی مقرر ہوئے تھے تو یہ بھی وہیں متعین کئے گئے تھے۔ [illegible] سلطان محمد خان کے ناگہانی [illegible] انقلاب کا شکار ہوئے۔ ان کی بیوہ کا عقد ثانی ولایت علی سے ہوا۔

عبدالغنی [illegible] کے بیٹے تھے۔ وہ بنگال کے نواب ظفر جنگ کے عہد [illegible]

میں پٹنہ میں جج کے عہدے پر مامور تھے۔ وہ زاہدانہ فقیرانہ اور فیاضانہ طبیعت رکھتے تھے۔ نواب
نے اُن کو اعزازی خلعت اور بہت کچھ انعامات بخشے۔ سب مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیے۔
خود قرآن مجید کی نقلیں لکھ کر ان کی فروخت سے گذارا کرتے۔ سید احمد جب پٹنہ میں وارد
تھے تو انھوں نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صادق پور کے قائدین کے نام سید احمد کے
مکتوبات میں ان کے نام بھی ایک مکتوب تھا۔ وہ ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء میں تقریباً ایک
سو سال کی عمر میں رحلت فرما ہوئے۔

مظہر علی اگرچہ خاندان صادق پور کے رکن نہ تھے مگر تحریک کے اہم مقامی قائدین میں سے
تھے۔ اور ان کی ابتدائی زندگی کا ایک مختصر تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ انھوں نے غالباً
سید احمد کے دورۂ پٹنہ سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ سید احمد
اپنے پٹنہ کے دورہ کے دوران میں کچھ دن ان کے ہاں رہے۔

مظہر علی تحریک کے ایک دلیر اور بہادر کارکن تھے۔ ایک جلوس کے تعزیے کو نقصان
پہنچانے کے الزام میں ان پر مقدمہ قائم کیا گیا تو بھاگ کر گورکھپور چلے گئے۔ بعد میں جب
سید احمد سے ان کی ملاقات ہوئی تو فرار ہو کر اپنے ضامنوں کو پریشانی میں ڈالنے پر
ان کو سرزنش کی اور واپس جانے کی ہدایت کی جس کی انھوں نے تعمیل کی، مگر ان کے پٹنہ
پہنچنے سے پہلے مقدمہ اٹھا لیا گیا تھا۔

وہ سید احمد کے ہمراہ سرحد گئے اور بہت سے معرکوں میں حصہ لیا۔ شاہ اسمٰعیل نے
غزوۂ [illegible] میں ان کی بہادری کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ ۱۸۳۰ء میں جب پشاور
پر قبضہ ہوا اور جس کے شکست خوردہ سردار سلطان محمد کو لوٹا دیا گیا تو سید احمد نے مظہر علی کو
اپنے نمائندہ کی حیثیت سے وہاں چھوڑ دیا تھا۔ وہ قاضی اور احتساب عامہ کے محتسب
بھی مقرر کئے گئے تھے۔ وہابیوں نے خود ایک عارضی نظام حکومت قائم کر لیا تھا اس
میں یہ عہدے کلیدی اہمیت رکھتے تھے۔ اُن کا یہ تقرر دلیل تھا ان کی پرہیزگاری، علمی
فضیلت اور اس اعتماد کی جو سید احمد ان پر رکھتے تھے۔ پشاور کے قیام میں ان کو سلطان
محمد کے غدارانہ منصوبے اور متوقع بغاوت کی بھنک ملی۔ شاہ اسمٰعیل کو پوری صورت حال لکھ بھیجی۔ شاہ صاحب نے ایک

طویل مراسلے میں سلطان محمد کے طرفداروں کے متعدد اتہامات کا جواب دیا جن کی منظہر علی نے ان کو اطلاع دی تھی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے وقت پر پشاور سے نکل جا سکتے تھے لیکن وقت ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے اس زبوں صورتِ حال کا پورا اندازہ کرنے اور اپنے سردار کو رپورٹ دینے کے لئے وہیں ٹھہر گئے۔ آخر وہ سلطان محمد کے اچانک غدارانہ حملے میں نہایت بے رحمی سے قتل کئے گئے۔

---

(۲)

سید احمدؒ کا ایک نایاب غیر مطبوعہ مکتوب

سید احمدؒ کے مکتوبات کے شائع شدہ اور مخطوطہ مجموعے بہت سے موجود ہیں۔ مگر یہ مکتوب کسی مجموعے میں موجود نہیں۔ یہ بالخصوص خاندان صادقپور کے ارکان کے نام ہے اور اسی کی ایک نقل اسی خاندان کے ایک[1] رکن کے پرانے کاغذات سے دستیاب ہوئی۔

اس کے مکتوب الیہ خاندان صادقپور کے سارے اہم ارکان اور ضلع پٹنہ کے دوسرے مومنین ہیں۔ سوء اتفاق سے اس میں تاریخ تحریر درج نہیں۔ مگر اس کے وقت کا کچھ اندازہ اس کے مضمون سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ سرحد سے ولایت علی کی رخصت کے کچھ بعد لکھا گیا۔ اور یہ واقعہ ۱۸۲۸ء کے بعد ہو سکتا ہے۔ :

۱۸۲۶ء کے آخر کا۔ کیوں کہ ولایت علی . . . .

کی محل ثانیہ حیدرآبادی سے عبداللہ کی پیدائش ۱۲۴۶ھ (۳۱-۱۸۳۰ء) سے کئی مہینے پہلے ہوئی۔ ولایت علی کے سرحد سے دکن پہنچنے، حیدرآباد میں قیام کرنے اور شادی کرنے میں صرف وقت کا اندازہ کر کے ہم حیدرآباد میں ان کے پہنچنے کا اندازی وقت دیر سے دیر ۱۸۲۹ء قرار دے سکتے ہیں۔

---

[1] مولوی عبدالغفار صادقپوری مذکرہ بالا کے بیٹوں کے پاس ہے۔

پورے مکتوب کا انگریزی ترجمہ درج ذیل ہے۔

از امیر المومنین سید احمد بخدمت جامعین علم و فضل، مخزنِ صدق و ایمان ۔۔۔۔ مولانا عبد العلی، فتح علی، الٰہی بخش، اکرم الحق، واعظ الحق، منعم الحق، محمد حسین، شیخ علی جان، سید جمال علی و دیگر مومنین عظیم آباد[1]

بعد تحیاتِ سلام و دعائے حسنات واضح باد۔

آپ کے خطوط ملے اور ان کے مضامین سے تمام حالات مجھ پر منکشف ہوئے۔ الحمد للہ میں مع الخیر ہوں، دن رات مقصد کی ترقی کے لئے مصروف کار رہتا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے جہاد کے قیام اور کفار کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بہت کچھ امداد حاصل ہو گئی ہے۔ اس ملک کے مومنین، شرفا، عوام اور سادات، سب کے سب جہاد اور اپنی جانیں نثار کرنے کے لئے تیار ہیں اور میری اطاعت کا عہد قبول کر لیا ہے، انشاء اللہ فتح کی خبر آپ کو جلد مل جائیگی۔

ہر زندہ مخلوق، اللہ کی رضا جوئی اور خالق کے لئے جاں سپاری میں مصروف ہے۔ اس کی نسبت ہر ماسوا کی محبت سے اعلیٰ و رفیع ہے۔ گو اس اعلیٰ درجے کے خلوص ایمان اور اس بلند روحانی مرتبے کا حصول عوام الناس کے لئے دشوار ہے۔ مگر ہر شخص پر جو دین اسلام کا متبع ہے اتنا تو فرض ہے کہ نور و ظلمت کے درمیان کشمکش اور کفر و اسلام کے درمیان جنگ میں اسلام کی آبرو کے جذبے کو بروئے کار لائے۔ ہر وہ شخص جو ایسے نازک موقع پر مجاہدوں کی صف میں شامل نہ ہو وہ فسق کا مجرم ہے، اور جو شخص جان کے خوف سے اس نازک گھڑی میں کترا جائے، وہ بدبخت پیشانی پر اللہ سے علیحدگی کا داغ لگانے کا مرتکب ہے[2]

---

[1] مکتوب الیہم میں عبد العلی، فتح علی، الٰہی بخش اور محمد حسین خاندان صادق پور کے ارکان ہیں جن کے سوانح پیش کئے جا چکے۔ اکرم الحق اور واعظ الحق پہلے باڑھ کے باشندے تھے۔ سید احمد کے باڑھ کے دورے کے موقع پر اکرم الحق نے ان سے بیعت کی تھی۔ علی جان دانا پور کے باشندے تھے اور سید احمد کے دانا پور کے دورے کے موقع پر ان سے بیعت کی تھی اور بہت بعد تک تحریک کے لئے کام کرتے رہے۔ [2] یہاں کچھ خط کھنچا ہوا ہے۔ عبارت کا تسلسل منقطع سا ہے کیونکہ اس کے بعد کی عبارت میں عام اصول کے بیان سے ہٹ کر یک بیک خاص امر ترسیل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

مجاہدین کی فتوحات مومنوں کے لئے ایمان افروز اور منافقوں کے لئے دل سوز ہیں۔ [illegible]
لکھئے۔ آپ نے ۲۱۶۹ روپے کی ہنڈی کے بارے میں جو لکھا تھا کہ شیخ عبداللطیف کو بھیج دی گئی ہے
وہ مجھے پہنچ دی۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسی مضمون کا شیخ عبداللطیف کا ایک خط مجھے ملا جس میں یہ بھی
لکھا تھا کہ انھوں نے ایک سات ہزار کی ہنڈی بھی مجھے روانہ کی ہے۔ مگر یہ رقم اب تک مجھے
نہیں ملی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی مل جائیگی۔ جس طرح جو رقمیں آپ حضرات نے [illegible]
وہ سب مل گئیں۔ مگر واضح رہے کہ اب سے پہلے روپیہ کی ترسیل بند رہی اور کچھ وصول
نہ ہوا تھا۔ اب اللہ کے فضل سے ترسیل زر کا ایک آسان ترین ذریعہ دریافت کر لیا گیا ہے۔
مومنین مخلصین کو چاہئے کہ روپیہ مولانا اسحٰق کے نام دہلی بھیج دیا کریں وہاں سے مجھ کو مل
جایا کرینگے۔ میں نے ان کو (اسحاق کو) ایک آسان اور محفوظ [illegible] کا
طریقہ لکھ بھیجا ہے۔ چنانچہ مجاہدین کے اخراجات کے لئے دو ہزار روپے وصول کر لئے ہیں۔
لہٰذا جو کوئی رقم بھیجنا چاہئے وہ اس کی ہنڈی مولانا اسحاق کو دہلی بھیج دیا کرے وہاں سے
مجھے مل جایا کریگی۔

مولوی ولایت علی، محمد زکی، شیخ باقر علی، قمرالدین حسین اور شیخ محمد حسن نے بھی خط لکھے
ہیں۔ ان کی رسیدیں مرسلہ رقوم کی وصولی کے بعد بھیج دی جائیں گی۔ اطمینان رکھئے۔ میں
نے (پہلے) ولایت علی کو مفوضہ کام کے لئے دکن بھیجا تھا۔ مولوی عنایت علی بھی بیمار ہو کے
اس ضلع (پٹنہ) کو روانہ ہو گئے۔ اس جماعت کے باقی لوگ بخیر ہیں بجز مولوی [illegible]
حسین کے جو طبعی موت سے انتقال کر گئے۔ ان کے عزیزوں کے لئے یہ صبر و تحمل کا وقت
ہے۔ حافظ قطب الدین مومنین اور مخلصین کی تعلیم کے لئے ادھر (؟) تعینات کر دئے گئے
ہیں اگر وہ اس ضلع (پٹنہ) میں پہنچ جائیں تو ان کی اعانت و تعاون کی کوشش کرنا۔

والسلام

(۴)

غزوۂ امبیلہ کے موقع پر عبداللہ اور سید عمران کا مشترک مکتوب ایک سرحدی قبائلی سردار کے نام

(انگریزی ترجمہ)

سلام کے بعد، کفار کی ایک بڑی فوج سلیم خاں، یار حسین اور شیخ جانا پر اس ملک کی غارتگری کی غرض سے آئی ہے۔ اس لئے تم کو لازم ہے کہ اس خط کے ملتے ہی بنی مرکس او امد چینہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور درہ (امبیلہ) کے دوسرے حصوں میں اعلان کر دو کہ مرتی اور ننداڑ یعنی وادی جنگ تک پر قبضہ کر لیں اور اپنی (دفاعی) طاقت کو مستحکم بنا لیں۔ اس ہدایت کی تعمیل میں تمھیں ایک لحظہ بھی دیر نہ کرنی چاہئے۔ اگر اس میں تاخیر یا سستی ہوئی تو مفسد کفار تمام پہاڑی خطے، خصوصاً چمبر، بنیر، سوات وغیرہ کے صوبے لوٹ کر غارت کر دینگے اور اپنے علاقوں سے ان کا الحاق کر لینگے۔ تب ہمارا دین و مذہب اور دنیاوی املاک سب کچھ تحس نحس ہو جائیگا۔ اس لئے اسلام اور ایمان کے تقاضے اور دنیاوی مفاد کو مدنظر رکھکر تم کو اس موقع پر غفلت نہ برتنا چاہئے۔ یہ کفار انتہائی دغاباز اور غدار ہیں، جس طرح بھی ممکن ہوگا ان پہاڑوں پر آجائینگے اور ملک کے عوام میں اعلان کرینگے کہ ہمیں تم سے کوئی پرخاش نہیں، ہماری لڑائی ہندوستانیوں سے ہے ہم تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچائینگے اتنا بھی نہیں کہ کسی کے سر کا ایک بال بھی بیکا ہو، ہندوستانیوں کو فنا کر کے فوراً واپس چلے جائینگے اور تمہارے ملک میں ہم کوئی مداخلت نہ کرینگے۔ وہ عوام کو مال و دولت کا لالچ بھی دینگے اس لئے تمھیں واجب ہے کہ ان کے فریب میں نہ آؤ ورنہ جیسے ہی وہ موقع پائینگے وہ تمھیں بالکل تباہ و برباد کر دینگے آزار پہنچائینگے طرح طرح کی رسوائیاں دینگے۔ تمہارے تمام مال و زر پر قبضہ کر لینگے اور تمہارے دین کو بھی ضرر پہنچائینگے۔ اس وقت تمھیں یاس و حسرت کے سوا کچھ نہ ملیگا۔ ہم اس معاملے کو تمھارے ذہن نشین کئے دیتے ہیں۔

مہر عبداللہ

مہر سید عمران

۱۔ پیگٹ اینڈ میسن مذکورہ۔

(۵)

جے ایچ ریلی، این گھوش ڈی آئی جی اور سب انسپکٹر پولیس اسپشل ڈیپارٹمنٹ صوبہ جات زیریں کے عیارانہ اور من مانے طریق کار کی روداد

اگست ۱۸۶۷ء میں نوبوکسٹو گھوش سب انسپکٹر پولیس کے خلاف ایک نالش کی گئی کہ اس نے ایک شخص تنوک سنگھ پر کچھ نخاسیوں کی چوری کا الزام لگا کر مستغیث کو دق کرنے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے اور عداوت سے ناجائز طور پر فوجداری مقدمہ قائم کر دیا تھا۔ ای ڈرومنڈ مجسٹریٹ پٹنہ کی عدالت میں نالش کی سماعت ہوئی۔ اس نے ۱۵ اگست کو ملزم گھوش کو عدالت سیشن کے سپرد کر دیا۔

ڈبلیو اینلی سیشن جج کی عدالت میں اس کی سماعت[لہ] ہوئی۔ جج کی اعانت کے لئے ایک جوری بھی مقرر ہوئی۔ ملزم پر مستغیث کو نقصان پہنچانے کی غرض سے اس کے خلاف ناجائز مقدمہ قائم کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔

جیوری نے کثرت رائے سے اسے مجرم قرار دیا اور اسے ایک سال کی قید سخت اور ایک سو روپے جرمانہ کی سزا دی۔ جج نے بھی جیوری کی تجویز سے اتفاق کیا۔

اس مقدمے میں اینلی کا فیصلہ اس آزادانہ اور دلیرانہ طرز عدالت کی بہترین روایات میں سے ہے جن میں قانون کے آگے تمام انسان امیر و غریب کی مساوات یکساں قائم رکھنے کے لئے نہایت مستعدی اور باریک بینی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس فیصلے کے کچھ ضروری اقتباسات ذیل میں اس لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ یہ ریلی اور اس کے ماتحت پٹھوؤں کے عیارانہ اور من مانے طریق کار کی نشان دہی کرتے ہیں:۔

"اس مقدمے میں کوئی حکم خواہ وہ حکومت ہی کا کیوں نہ ہو کسی ایسے فعل کے لئے سند نہیں ہو سکتا جو ملک کے تحریری قانون کے خلاف ہو، چہ جائیکہ وہ حکم کسی ادنیٰ حاکم کا ہو۔ اگر مسٹر ریلی نے ملزم کو بے داغ ٹھہرانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے تو وہ اسے پورا کرے اس

لہ محافظ خانہ عدالت ڈسٹرکٹ جج پٹنہ۔ بنڈل ۱ (۱۸۶۷ء) مقدمات سیشن ۱-۶۵ء

سے مجھے کوئی بحث نہیں۔ مجھے جس چیز سے بحث ہے وہ یہ ہے کہ قانون کو اپنے
راستے پر چلنا ہے، اور یہ کہ اس عدالت میں ملزم کے خلاف جو الزام پیش کیا
گیا ہے وہ اس عدالت کے احاطۂ اختیار میں ہے، اور اس کی جانچ کو آخری حد
تک پہنچایا جاتا ہے .... مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ استغاثہ
کے زور یا کمزوری سے ملزم سزایاب ہو یا رہا ہو جائے۔ میرا فرض ہے کہ میں
اس عذر کی جانچ کروں جس کی بنا پر اس عدالت کو کارروائی روک دینے کی
درخواست کی گئی ہے۔ میں نہیں مانتا نہ کوئی ہوشمند انسان مان سکتا ہے کہ
حکومت نے مسٹر ریلی اور ان کے ماتحتوں کو بھی مدینہ کی طرح یا خفیہ اختیار دیا
کہ وہ جس کو چاہیں لا کے دوسرے جیسے مخبر کی اطلاع پر بے لاگ شہادت سے
یہ اطمینان کئے بغیر کہ ایسے اسباب الزام درست ہے گرفتار کریں ...
... اس کے بعد نہ کہ قبل ایسا اقدام کریں جس میں ان کے ہموطنوں
کی جو قانون کے آگے ان کے برابر ہیں آزادی ہی نہیں بلکہ جان کا خطرہ بھی مضمر
ہو ....

اب میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ اسپیشل پولیس تو ان کے ان حقوق کی پابند
نہیں جن کا تعلق تھانے کے پولیس افسروں سے ہے ..... مسٹر ریلی
کہتے ہیں کہ ان کے محکمہ کو کیا اختیارات ملے ہیں وہ نہیں بتا سکتے، نہ وہ گورنمنٹ
کے کسی ایسے حکم کا حوالہ دے سکتے ہیں جس سے یہ اختیارات ظاہر ہوں
میں یہ نہیں مان سکتا کہ اگر وہ چاہتے تو مجھے اس سے آگاہ نہ کر سکتے تھے
یا یہ کہ ان کا حافظہ اتنا کمزور ہے جیسا کہ اس مقدمے کی سماعت میں معلوم ہوتا
ہے، ایسے محکمہ کے صدر ہونے کے پیش نظر میں اسے باور نہیں کر سکتا .....؟

۱؎ یہ روداد سماعت سیشن سے متعلق ہے جس میں گھوش سزایاب ہوا لیکن بعد میں غالباً وہ رہا ہو
گیا ہوگا ۱۹۰۸ء در بعد میں وہ ملازمت میں نہیں تھا مگر ان کاغذات میں اس کی رہائی کا کوئی ذکر نہیں۔

اس مقدمے کا کوئی تعلق وہابیوں سے نہ تھا۔ مگر یہ ۱۸۶۸ء میں ٹھیک وہابیوں کی تفتیشوں کے آغاز میں وقوع میں آیا۔ اس ڈراما میں دو ایکٹر تو وہی ہیں جو وہابیوں کی تحقیقات میں تھے۔ اس مقدمے میں ان کے جس من مانے اور انتقامی طریقے کا، یہ جج نے اس سختی سے تنبیہات لگائے ہیں وہ ان کی بعد کی کارروائیوں کا بھی ٹھیک نمونہ ہیں۔ یہ مقدمہ ریلی کے جابرانہ مزاج کا کچھ پتہ دیتا ہے۔ جس کا خیال تھا کہ اس کا اسپیشل محکمہ ملک کے عام قوانین سے بلند ہے اور اس کو کامل اختیار حاصل ہے کہ جس کسی کو چاہے گرفتار کرلے اور اس پر مقدمہ چلا دے۔

یہ مقدمہ پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر کے غصے و غیر معمولی برافروختگی کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ ریلی نے ایسے بدنام آدمی کو پٹنہ میں (جہاں وہ سزایاب ہوا) وہابیوں کے خلاف تفتیشوں کے لیے متعین دوبارہ مستعد کیا تھا۔

(۶)

سید احمدؒ کے بعض مکتوبات شائع کردہ محمد جعفر و مندرجہ نسخہ مخطوطہ کی مختلف تعبیرات

(ترجمہ بہ انگریزی)

سوانح احمدی

(۱) رنجیت سنگھ کی طرح ہمیں طاقت اور وسائل میسر نہیں، مگر تم سے کس نے کہا کہ امام اس قلیل طاقت سے لاہور پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس کے برعکس وہ دن رات مسلمانوں کے وسائل میں اضافہ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ (صفحہ ۲۸۹-۹۰)

(۲) میرا اصل مقصد پنجاب کے سکھوں کے خلاف جہاد قائم کرنا ہے اور افغانستان اور یاغستان کے ملکوں میں بیٹھے رہنا نہیں۔ صفحہ ۲۴۸

(۳) دراز موکفار (سکھ) جو پنجاب پر مسلط ہیں وہ بڑے کارآزمودہ، چالاک اور دغاباز ہیں صفحہ ۲۶۱

(۴) بدنہاد سکھ اور بدبخت مشرکین نے دریائے سندھ کے سواحل سے دارالحکومت دہلی تک ہندوستان کے مغربی حصوں پر تسلط جما رکھا ہے (صفحہ ۲۷۵)

نسخہ مخطوطہ پٹنہ یونیورسٹی

(۱) رنجیت سنگھ اور کمپنی جیسی طاقت اور وسائل ہمیں میسر نہیں مگر تم سے کس نے کہا کہ امام اس قلیل طاقت سے لاہور اور کلکتہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بعد کی عبارت وہی ہے۔ (صفحہ ۹۹)

(۲) میرا اصل مقصد جہاد قائم کرنا اور جنگ کو ہندوستان میں جاری رکھنا ہے اور سرزمین خراسان میں بیٹھے رہنا نہیں (صفحہ ۹۸)

(۳) عیسائی کفار جنہوں نے ہندوستان پر قبضہ کر رکھا ہے بڑے عیار اور دغاباز ہیں (صفحہ ۳۹)

(۴) بدنہاد عیسائیوں اور بدبخت مشرکین نے ہندوستان کے بہت سے حصوں پر دریائے سندھ کے ساحل سے سمندر کے ساحل تک جو چھ مہینوں کی مسافت ہے تسلط جما رکھا ہے (صفحہ ۳۹)

واضح رہے کہ نمبر ۱ میں دو لفظ یعنی الفاظ "کمپنی" اور "کلکتہ" "رنجیت سنگھ" اور "لاہور" کے بعد اضافہ کر دئے گئے ہیں۔ نمبر ۲ میں "ہندوستان میں جہاد" کے عوض "سکھوں کے خلاف جہاد" درج کیا گیا ہے۔ نمبر ۳ میں "عیسائی کفار" کی جگہ "دراز موکفار" (سکھ) درج کیا گیا۔ نمبر ۴ میں "سمندر کے سواحل" کے عوض "دہلی" درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کا توضیحی فقرہ "چھ مہینے کی مسافت" بالکل حذف کر دیا گیا ہے ورنہ عبارت میں تضاد واقع ہو جاتا۔

(۷)

وہابی اور خلاف وہابی نگارشات پر تبصرہ

وہابی نگارشات :-

وہابی تحریک نے اردو نثر نگاری کی رفتار کو بالخصوص بہار میں[1] بہت ترقی بخشی کیونکہ بہار ایک مدت دراز تک برطانوی ہند میں اس کا صدر مقام رہا۔ تحریک اصلاً تبلیغی تھی اور ایسی تمام تحریکوں کی طرح اس نے عوام کے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچنے کے لئے زیادہ تر مقامی زبانوں سے کام لیا جن کو عوام زیادہ سمجھ سکیں۔ وہابی سربراہوں نے مختلف کثیر التعداد اور کتابچے تحریر کئے۔ ان میں سے زیادہ تر مذہبی اور سماجی موضوعات پر ہیں جن میں مختلف مذہبی نظریات کی تشریح آسان زبان میں کی گئی ہے تاکہ عوام الناس ان کو بلا امداد غیرے سمجھ سکیں۔ انھوں نے اکثر مذہبی اور سماجی رسوم پر بھی لکھا ہے جن میں کچھ رسوم کی نمائشی پیروی کے عوض ان کے حقیقی مفہوم اور روح معنے کو سمجھنے پر زور دیا گیا ہے۔

وہابی مصنفین اپنی تحریروں میں باغیانہ مضمون سے بہت احتیاط برتتے تھے۔ ایسے مضامین وہ دورہ کرنے والے واعظین کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ اس پر بھی بعض جوشیلے پرکاری افسر خالص مذہبی رسالوں میں بھی غلط معنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تاہم بعض وہابی تصانیف جیسے جہاد نامہ اور حرق الاشرار میں دین اور آزادی کے لئے جہاد کی فضیلت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اکثر وہابی رسائل اب ناپید ہیں۔ وہابی خود حکومت کے مخالف سمجھے جاتے تھے اس لئے ان کی تحریریں بھی مشکوک تصور کی جاتی تھیں۔ لوگ اس بات سے خوف زدہ رہتے تھے کہ یہ خطرناک تصنیفات ان کے پاس پائی جائیں اس لئے ان کو علیحدہ کر دینے کی کوشش میں رہتے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ یہ ضائع ہوگئیں۔

اپنی اس کتاب کی تالیف کے دوران میں پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر کے دفتر میں مجھے

---

[1] پروفیسر اختر احمد اورینوی نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" میں اردو نثر کی ترقی میں وہابیوں کی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۷ء

کچھ وہابی رسالے اور چند گمنام رسائل ملے جن پر یہ شبہ تھا کہ پھلواری شریف کے مجدد و تثبیت کے تحریر کردہ ہیں۔ ان سے متعلق کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے ان کو قابل اعتراض قرار دیا اور غالباً ممنوع بھی رکھا اور رسائل مطبوعہ و مخطوطہ دونوں، پٹنہ اور دوسرے مقامات کے لوگوں کے نجی کاغذات سے دستیاب ہوئے۔ ان میں سے اکثر خاندان صادق پور کے افراد کے لکھے ہوئے ہیں اور کچھ بے نام ہیں۔

کچھ وہابی کچھ مخالف وہابی رسالوں کی مختصر توضیحی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے[1]۔

---

[1] نیز ملاحظہ ہو ہنٹر، انڈین مسلمانز صفحہ ۲۲۰-۲۲ بعض وہابی رسائل کی فہرست کے لئے۔

اکابرِ صادقپور کی تحریرات کا سب سے مشہور مجموعہ جو عام طور پر دستیاب ہے وہ رسائل تسعہ مطبوعہ مکتبۂ فاروقی دہلی ہے۔ صفحات ۵۶

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ نو رسالوں کا ایک مجموعہ ہے جو ولایت علی، عنایت علی اور فیاض علی نے مختلف موضوعات پر لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ اردو میں اور کچھ فارسی میں ہیں (جن کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے) ایک عربی میں ہے۔ اس مجموعہ میں حسب ذیل رسالے ہیں:-

ا۔ رسالہ رد شرک فارسی صفحات ۱-۲۹۔ یہ ولایت علی کی تالیف ہے مع ترجمہ از الٰہی بخش بڑاکری، دونوں کے متن پہلو بہ پہلو ایک ہی ایک صفحے میں ہیں اور ان کے درمیان میں ایک خط کھنچا ہوا ہے۔ زبان آسان اور بامحاورہ ہے۔ یہ شاہ اسمٰعیل کے مشہور رسالہ تقویۃ الایمان کا خلاصہ ہے جو ہدایۃ التوحید کے نام سے ۱۲۱۲ھ میں مطبع دارالسلطنۃ کلکتہ سے علیحدہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ صفحات ۲۷

ب۔ رسالہ عمل بالحدیث فارسی، صفحات ۳۰-۵۹۔ مولفہ ولایت علی مع ترجمہ اردو از الٰہی بخش بڑاکری، آسان اور شستہ اردو ہیں۔ دونوں کے متن اسی طرح ایک ہی صفحے پر درج ہیں۔ یہ فقہ اسلامی کے مختلف مسائل پر ہیں۔

ج۔ اربعین فی المہدیین، عربی مع ترجمہ اردو صفحات ۴۰-۴۵۔ مولفہ ولایت علی۔ یہ مہدی یا مسیح کے ظہور سے متعلق ۴۰ احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ رسالہ سید احمد کے ظہور ثانی کے عقیدے کا اظہار ہے جو کچھ عرصے تک وہابیوں کے ایک گروہ میں پھیلا ہوا تھا۔

د۔ رسالۂ دعوت اردو صفحات ۴۶-۶۰، مصنفہ ولایت علی۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو سید احمد کی تعلیمات قبول کرنے اور بیعت کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ظہور ثانی کے عقیدے کو بھی کچھ بیان ہے۔

ہ۔ رسالہ تیسیر الصلوٰۃ، ۶۹-۸۷، ۹۴ مصنفہ ولایت علی۔ اس میں مختلف قسم کی

---

[1] اب دستیاب نہیں ہے۔ مترجم۔

نمازوں کا ذکر ہے۔

اس رسالے کا ایک غیر مؤرخہ مخطوط نسخہ مجھے لول صورت گڑھ کے ایک صاحب کے نجی ذخیرے سے دستیاب ہوا ہے۔ صورت گڑھ ضلع مونگیر بہار میں وہابیوں کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔

و۔ رسالہ تجرید با ثمر[2]۔ اردو صفحات ۸۸۔۹۰ مصنفہ ولایت علی۔ بعض مروجہ صوفی رسوم اور پیروں کی تعظیم میں غلو کے رد میں لکھا گیا ہے۔

ز۔ رسالہ بت شکن اردو صفحات ۹۴۔۱۰۶ مصنفہ عنایت علی۔ یہ طنزیہ طرز پر لکھا گیا ہے اور ان لوگوں کی تضحیک کی گئی ہے جو تعزیے نکالتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اسی موضوع پر کچھ اردو اشعار بھی ہیں۔

ح۔ رسالہ منبع الفیوض۔ فارسی۔ صفحات ۱۰۶۔۱۲۸۔ یہ مکالمہ ہے جس میں مختلف مذہبی مسائل پر فیاض علی سے سوالات اور ان کے جوابات ہیں۔ پہلے یہ فیض الفیوض کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ بعد میں فارسی متن مع ترجمہ اردو از الٰہی بخش ایڈیٹری، منبع الفیوض کے عنوان سے شائع ہوا اور اس مجموعہ میں شامل کر دیا گیا۔

ط۔ تبیان الشرک، اردو صفحات ۱۴۲۔۱۵۶ مؤلفہ ولایت علی۔ یہ دراصل رسالہ [illegible] کی نظر ثانی اور کچھ اضافہ ہے۔

مولوی عبدالغفار نماز تپوری کے ذخیرہ کتب میں مختلف مسائل جیسے ذاتی عبادت، نکاح، بیوگان، جہاد وغیرہ پر کچھ رسالے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بعض نامکمل ہیں اور ان کے لکھنے والوں کے نام اور مقام و تاریخ اشاعت کی دریافت ممکن نہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ رسالہ نماز۔ اردو صفحات ۱۴۰۔ ۲۔ تفسیر سورہ فاتحہ[1]۔ اردو صفحات [illegible]

۱؎ [دستیاب نہیں۔] مترجم۔ ۲؎ شاید یہ تجرید بے ثمر ہے۔ مترجم

وہابی اور خانقاہ پھلواری شریف

یہ نکتہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قدیم اور مشہور و معروف مرکز صوفیہ پھلواری شریف، بھی ۱۸۷۵ء-۸۲ء کے دوران وہابیوں سے ہمدردی کے شبہ میں مبتلا رہا۔ ترکوں کی اعانت کے لئے سجادہ نشین کے بعض اعلانات دینی و مذہبی امور سے متعلق ان کی بعض مطبوعہ تصانیف بھی معرض اشتباہ میں آئیں۔ یہاں تک کہ وہابیوں کے ساتھ علمائے پھلواری کی ساز باز پر حکومت کے [illegible] کے لئے ایک بسیط یادداشت تیار کی گئی۔ اس میں بتایا گیا کہ "پھلواری کی روش وہابیوں کی روش سے بہت مشابہت رکھتی ہے اور یہ کہ پھلواری نے بالکل عماد پٹنہ کے قدم بقدم چلنا شروع کر دیا ہے۔" اس نے یہ سفارش کی کہ پھلواری کو بھی ایک سب ڈویژن بنا دیا جائے اور ایک تجربہ کار ڈپٹی مجسٹریٹ بابو ایشری پرشاد جیسا (وہابیوں کا ٹھیک کرنے والا) وہاں متعین کیا جائے۔

علمائے پھلواری کی بعض تصانیف جنھوں نے حکومت کو برانگیختہ کیا یہ تھیں:

تحفۂ محبت۔ فارسی۔ پٹنہ کے ایک سنی حنفی مسلم کی لکھی ہوئی ایک کتاب تھی تحفہ محبت میں وہابیوں کے خلاف کچھ مذہبی الزامات عائد کئے گئے تھے یہ کتاب اس کے رد میں لکھی گئی۔ اس کتاب کی اشاعت میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ ایکٹ کی دفعہ ۲۵ کی خلاف ورزی تھی۔ اس پر نہ مصنف کا نام درج تھا نہ شائع کنندہ کا۔ لیکن حکومت نے پھلواری شریف کے ایک بڑے عالم پر اس کے مصنف ہونے کا شبہ کیا۔ اور ایک اعلان شائع کیا کہ جو کوئی کتاب کے مصنف اور شائع کنندہ کی اطلاع دیگا اسے اشخاص متعلقہ کے جرمانہ کی ایک ہزار روپے کی رقم کا نصف عطا کیا جائیگا۔

معیار المذہب فارسی مصنفہ مولانا سید علی اعظم قادری پھلواروی پہلی بار [illegible] میں [illegible]

سنہ ۱۲۹۱ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوئی۔

اسوۂ حسنہ۔ فارسی۔ مصنفہ شاہ محمد علی حبیب پھلواروی۔ سنہ ۱۲۹۲ھ میں مطبع محمدی سے شائع ہوئی۔

یہ ساری تصنیفیں خاص طور سے مذہب اور فقہ کے مسائل پر ہیں۔ لیکن یہ بات قابل اعتراض ٹھہرائی گئی کہ آخری دونوں کتابوں کے مصنفوں نے وہابیوں کے سرغنہ کو "آفتاب روحانیت"، "عماد متقین" اور ماہتاب آئین کی صفات سے یاد کیا تھا۔

وہابیوں کے خلاف نگارشات:۔

انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات کی سماعت کے دوران میں جن لوگوں پر وہابیت کا شبہ ہوتا ان کی دھر پکڑ اور جستجو شروع ہو گئی۔ مشتبہ وہابیوں کی نشاندہی ایک زرخیز مشغلہ بن گیا۔ بعض لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا کہ بظاہر وہابی تعلیمات پر سنجیدہ تنقید کے ساتھ کتابیں شائع کرتے مگر درحقیقت گندہ مذاق کے ساتھ وہابیوں پر دشنام طرازیاں ہوتیں۔

اس قسم کی تحریرات کا ایک خاص نمونہ امداد علی جج عدالت خفیفہ ترہٹ ڈسٹرکٹ بہار سائنٹیفک سوسائٹی کی کتاب "وہابیوں کی تاریخ کا خلاصہ" ہے اس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوششیں کی ہیں کہ "وہابی اسلام سے خارج ہیں" "اسلام سے ان کا کوئی واسطہ نہیں" اور "بے ایمان، شریر، دھوکے باز اور باغی" لوگ ہیں۔

اس طبقہ کے مصنفین کی شامت یہ تھی کہ ان کی در پردہ نیت اتنی صاف اور نمایاں ہوتی کہ خود سرکاری حکام تک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ لکھی باتیں ایسے لوگوں اور ان کی تحریروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ پٹنہ کے کمشنر نے امداد علی کی وہابیوں کے خلاف مجسٹریٹ کو یادداشت لکھتے ہوئے رائے زنی کی "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ امداد علی پھر فریب دے رہا ہے۔ ورنہ وہابیوں اور وہابیت کا پردہ کشا بنکر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

مجسٹریٹ مظفر پور کے ایک خط مورخہ ۲۸ فروری سنہ ۱۸۷۱ء پر کمشنر پٹنہ کا نوٹ
نوسنکی منتظم ہائی کورٹ نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ اصل کتاب موجود نہیں مگر ترجمہ کا ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ

بعض مقامی اخبارات و رسائل نے بھی وہابیوں پر گندگی اچھالی۔ ایک اردو اخبار مورخ [illegible] ڈپٹی انسپکٹر پٹنہ نارمل اسکول نے چشمۂ علم کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے شمارہ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۸۷۵ء میں ایک مضمون "وہابیوں کی نئی چال" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی ابتدا اس جملے سے ہوتی "آجکل وہابیوں نے جوتیوں کی طرح بلوں سے سر نکالنا شروع کر دیا ہے ......"

ایک اور وہابیوں کا شکاری ایک مقامی رئیس نجم الدین حیدر قصبہ اندیلہ (نواب) ولایت علی گذری پٹنہ سٹی کا عزیز دوست تھا۔ اس نے "جواب دوازدہ گانہ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۸۷۸ء میں محمڈن پریس پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اس میں وہابیوں کے دعوی کے رد میں بارہ جوابات درج ہیں۔

اس کا ایک نسخہ کونسل کمشنر پٹنہ کی نذر کرتے ہوئے مصنف نے دعوی کیا کہ اس نے اسے "وہابیوں کی برائی کو روکنے کے لئے لکھا ہے" اور کمشنر کو یقین دلایا کہ میں وہابیوں کے سردار کے متعلق سب کچھ معلوم کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا .... (نواب) سید ولایت علی اور میں ہمیشہ یہی کرتے رہیں گے۔"

---

(۸)

مکتوب سید احمدؒ بنام راجہ ہندو راؤ برادر نسبتی مہاراجہ دولت راؤ سندھیا گوالیار

از امیر المومنین سید احمد بطرف عالی تبار اعلیٰ جاہ، منبع جود و کرم، دارائے اہل سیف و قلم، مالک خزائن و دفتر، صاحب افواج و حشم، بانی مصالح و حکم ریاست و نظام حکومت۔ خدا اس کی طاقت و اقتدار قائم رکھے اور اپنی زندگی میں خوش و خرم رہے۔

جذبات اتحاد و دوستی کے اظہار کے بعد واضح ہو کہ میں ایک غریب آدمی رب العالمین کے کچھ بندوں کے ساتھ پشاور کے اطراف میں دین اسلام کی خدمات کی بجاآوری اور سید المرسلین کی امت کے مقصد کی حمایت میں مصروف ہوں۔ اور اپنی مساعی کے ثواب کا منعم حقیقی کی بارگاہ سے متوقع و آرزومند ہوں۔

آپ کی نظر سالی میں ظاہر ہے کہ دور دراز ممالک سے اجنبی لوگ زمان و مکان کے فرمانروا ہو گئے ہیں، اور سوداگروں اور بنیوں نے حاکمیت و سلطنت کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے امرائے ذی شان کی زمین اور عالی جاہ رئیسوں کی ریاستیں برباد کر دی ہیں اور ان کے وقار و اقتدار کو بالکل خاک میں ملا دیا ہے۔ چونکہ صاحبانِ مملکت و ریاست گوشۂ خمول میں جا بیٹھے ہیں اس لئے چند غریب اور عاجز لوگوں نے مجبور ہو کر کمرِ ہمت باندھ لی ہے۔ عاجزوں کی یہ جماعت رب العالمین کے دین کے مقصد کی انجام دہی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی ہے، نہ کہ مال و دولت کے لالچ سے۔ جوں ہی ہندوستان کی سرزمین ان اجنبی دشمنوں سے پاک ہو جائے اور اس جماعت کی مساعی اس کے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں، ریاست و نظام حکومت کے عہدے و دفاتر ان کے طلبگاروں کے حوالہ کر دئے جائینگے اور ان کی طاقت و اقتدار کی جڑیں مضبوط ہو جائینگی۔ یہ عاجز جماعت عالی مرتبہ مقتدر رؤسا و امرا سے صرف یہی چاہتی ہے کہ وہ دل و جان سے اسلام کے مقصد کی اعانت و حمایت کریں اور اپنے

تختِ حکومت پر قابض و برقرار رہیں۔

اگرچہ بظاہر درویشوں کا یہ گروہ ساز و سامان سے قطعاً محروم ہے تاہم رب العالمین کی ربوبیت و حفاظت سے جو اُسے حاصل ہے راضی و مطمئن ہے۔ وہ جاہ و وقار کی خواہشوں اور آرزوؤں سے متنفر اور مال و دولت کی غرض و طمع سے آزاد ہے۔ وہ حال یا مستقبل میں ذاتی اور نفسانی خواہشوں کی تسکین کی ہوس نہیں رکھتا۔ وہ اُن تمام رئیسوں رؤساء و امرا کی جو اس کی اعانت و حمایت کریں گے حکومت کی جڑیں مضبوط کر دیگا۔

چونکہ حامل مکتوب ہذا مقبول بارگاہ الٰہی حاجی بہادر شاہ اس عاجز کے رفقائے قدیم میں سے ہے اس لئے ان معروضات کی تفصیلات عرض کرنے کی خدمت اس راست باز صادق البیان کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اب کچھ عرض کرنا باقی نہیں بجز اس تاکید مزید کے کہ آپ ان معروضات کی تہہ تک پہنچیں اور صورت حال کی اہمیت کا احساس کریں۔

مزید گذارش یہ ہے کہ حاجی صاحب ایک مدت سے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں مصروف ہیں اس لئے اپنے گھر والوں کی ضروریات اور آسائش کی طرف توجہ نہیں کر سکے ہیں۔ انھوں نے مستقبل میں بھی اسلامی فوج میں شامل رہنے کا عزم مصمم کر لیا ہے اس لئے امید نہیں کہ وہ آیندہ بھی اپنے خاندان کی دستگیری کے لئے وقت نکال سکیں۔ اس لئے خدمت عالی میں گذارش کی جاتی ہے کہ ان کے بھائی اور بیٹے کو آپ کی ریاست میں کوئی خدمت سپرد کی جائے تاکہ حاجی صاحب خدا کے کام میں زیادہ دلجمعی سے مصروف رہ سکیں۔

تمام شد

مآخذ

مخطوطات :-

۱۔ امیر نامہ (سوانح نواب امیر خان والی ٹونک) مولفہ بساون لال ۲ جلدیں۔ نسخہ کتب خانہ کلکتہ یونیورسٹی

۲۔ مخزن احمدی مولفہ محمد علی ادلی آئی۔ منقولہ سنہ ۱۲۶۲ ھجری

۳۔ مثنوی شہر آشوب از حکیم عبدالحمید۔ میرا ذاتی نسخہ

۴۔ صراط مستقیم نسخہ صادقپور مورخہ سنہ ۱۲۴۳ھ

۵۔ تاریخ ہزارہ مولفہ مہتاب سنگھ مورخہ سنہ ۱۸۵۴ میرا ذاتی نسخہ

۶۔ مکتوبات سید احمد کا بے نام مجموعہ۔ نسخہ کتب خانہ پٹنہ یونیورسٹی۔ مورخہ سنہ ۱۲۶۲

۷۔ وقائع احمدی۔ ۲ جلد۔ نسخہ کتب خانہ رامپور

۸۔ نیشنل آرکیوز (قومی محافظ خانہ) خارجی سیاسی و خارجی خفیہ محکمہ جات کے مجموعوں سے حسب ضرورت جلدیں۔ سنہ ۱۸۳۱ سے آگے۔

۹۔ سنٹرل ریکارڈز آفس کلکتہ۔ محکمہ عدالت کا مجموعہ دستاویزات سنہ ۱۸۳۱-۵۹

۱۰۔ سنٹرل ریکارڈز آفس پٹنہ۔ محکمہ عدالت کا مجموعہ دستاویزات (مطبوعہ) سنہ ۱۸۵۷ سے آگے

۱۱۔ دفتر ڈویژنل کمشنر پٹنہ :-

(۱) مجموعہ منجانب و بنام مجسٹریاں سنہ ۱۸۲۱ سے آگے۔

(۲) "غدر" اور اہم عدالتی کاغذات (بنڈلوں میں) سنہ ۱۸۴۵ سے آگے۔

(۳) کچھ غیر مسلک کاغذات ایک الماری میں علیحدہ رکھے ہوئے۔ یہ سب کاغذات ایک دفتی میں 'وہابی خفیہ کاغذات' کے عنوان سے رکھے ہوئے ہیں۔

مجموعے (۱) اور (۲) اب پٹنہ سنٹرل ریکارڈز آفس میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔

مطبوعات فارسی واردو

یہ علیحدہ اور اہم مگر فراموش کردہ ماخذ ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں اور رسالے، اشاعت کے فوراً بعد سے ممنوع الاشاعت قرار دیے گئے تھے۔ اور مختلف سرکاری دفتر سے ان کی بازیابی کی گئی ہے۔ ان میں کچھ صوبہ کے مختلف مقامات خصوصاً سورج گڑھا (ضلع مونگیر) سے جو تحریک کا ایک اہم مرکز رہا ہے، نجی ذخیروں میں پائے گئے، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تتمہ

۱۔ اختر احمد اُرمیوی۔ بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا۔ پٹنہ ۱۹۵۷ء
۲۔ اے احمد۔ ہندوستانی ماحول میں اسلامی ثقافت آکسفرڈ ۱۹۶۴ء
۳۔ مرزا حیرت۔ حیات طیبہ۔ طبع ثالث۔ لاہور ۱۹۵۸ء
۴۔ عبدالحق۔ ذرمقال
۵۔ فضل حسین۔ حیات بعد الممات۔ آگرہ ۱۹۰۸ء
۶۔ جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی دہلی ۱۳۰۹ھ۔ وتواریخ عجیب (کالا پانی) طبع ثانی ۱۳۰۲ھ
۷۔ ایس آر۔ کوہلی (پبلشر) ظفرنامہ رنجیت سنگھ مولفہ دیوان امرناتھ۔
۸۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید وغیرہ ۴ جلدیں۔ لاہور ۱۹۵۲-۵۶ء
۹۔ اے۔ ایچ۔ اے ندوی سیرت سید احمد شہید طبع ثالث۔ لکھنؤ ۱۹۳۹ء
۱۰۔ ایم اے ندوی۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تاریخ۔ طبع ثانی۔ راولپنڈی ۱۹۵۸ء
۱۱۔ ایم عبیداللہ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک
۱۲۔ عبدالرحیم۔ تذکرہ صادقہ۔ طبع ثانی۔ الہ آباد (حکیم عبدالخبیر نے ۱۹۲۲ء میں مع تتمہ طبع جدید شائع کیا)
۱۳۔ ایضاً ۔ رسالہ تسمیہ (مجموعہ مقالات)۔ فاروقی پریس۔ دہلی

تاریخ الامم مصنفہ علامہ ابن جریر الطبری

تاریخ طبری

مکمل سیٹ ۰/ ۲۲۰

مکمل گیارہ حصوں میں

تاریخ طبری حصہ اول سیرت النبی صلعم

ولادت رسولؐ سے وفات رسولؐ ۱۱ھ تک

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے ندوی

زیر نظر حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کی تمام تفصیلات معتبر اور اصل راویوں تک مکمل سلسلہ اسناد کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں یہی وہ نایاب تاریخ ہے جو زمانہ قدیم سے لیکر عصر حاضر تک سیرت مبارک کی مستند اور معتبر ماخذ رہی ہے اور تاریخ اسلام کے تمام مورخین نے اسی سے خوشہ چینی کی ہے۔ قیمت ۰/ ۲۲ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ دوم

خلافت راشدہ حصہ اول ۱۰ھ تا ۱۶ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے ندوی، سید رشید احمد ارشد ایم اے

اس میں عہد صدیقی کا مکمل دور خلافت اور عہد فاروقی کے ابتدائی دور (۱۶ھ) کے مفصل حالات حضرت ابوبکرؓ کے عدل و انصاف اور نظام سلطنت کے حالات نہایت دلکش انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت ۰/ ۲۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ سوم

خلافت راشدہ حصہ دوم

خلافت حضرت عمر فاروق اعظمؓ و حضرت عثمان غنیؓ ۱۶ھ تا ۳۵ھ

ترجمہ: مولانا رشید احمد ارشد ایم اے

اس میں سلطنت کسریٰ کے خاتمہ کے حالات اور عراق و شام، ایران، خراسان، ترکستان اور کابل کی وسیع فتوحات کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور اس میں حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی بے نظیر تدبیر و سیاست، حسن انتظام سلطنت اور ان کے ایثار و قربانی کے سبق آموز حالات، نیز حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کے بہت سے حالات بیان کئے گئے ہیں

صفحات ۵۱۲۔ قیمت ۰/ ۲۲ روپے

تاریخ طبری حصہ سوم کا حصہ سوم

خلافت راشدہ (حصہ سوم)

حضرت علیؓ تا حضرت امام حسنؓ ۳۵ھ تا ۴۰ھ

ترجمہ: مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی۔

جس میں حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے دور کے تمام واقعات نیز جنگ جمل و صفین و خارجیوں کی جنگوں کے تمام حالات بیان کئے گئے ہیں اور حضرت علیؓ و امیر معاویہؓ کے باہمی اختلاف کے اسباب تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ صفحات ۵۱۲۔ قیمت ۰/ ۲۲ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ چہارم

امیر معاویہؓ سے شہادت حسینؓ تک ۴۱ھ تا ۶۰ھ

ترجمہ: علامہ سید حیدر علی طباطبائی

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت کے واقعات جب مسلمان فوجیں کابل و افغانستان کو فتح کرکے درہ خیبر کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ نیز

میں قیروان فتح ہوا۔ اور تونس و سوڈان میں فتح و کامرانی کا پرچم لہرایا
یہ کشورکشائی و تمدن آفرینی کی حیرت انگیز تاریخ ہے۔ امیر معاویہؓ کی
وفات کے سات ماہ بعد کربلا کا خونی حادثہ پیش آیا۔ اور تاریخ اسلام
کے صفحات پرخون شہادت کی مقدس مہر ثبت ہوئی۔ حضرت حسینؓ
اور حکومت یزید کے تفصیلی حالات۔ صفحات ۲۷۴۔ قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ پنجم

اُموی دور حکومت —— ۶۷ھ تا ۹۶ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

جس میں عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن
عبدالملک کے زیر عہد حکومت کی تفصیل ہے۔ اسی عہد میں موسیٰ
بن نصیر، قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم، اور قتیبہ بن زید کی فتوحات ہوئیں
خوارج کی بغاوت، حجاج بن یوسف کی خون آشامیاں، عبداللہ
بن زبیرؓ کی خلافت بھی اسی دور میں ظہور پذیر ہوئی۔

صفحات ۳۶۰۔ قیمت ۲۲/۰ روپیہ

تاریخ طبری۔ حصہ ششم

عمر بن عبدالعزیز سے مروان ثانی تک

۹۶ تا ۱۳۲ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

تاریخ طبری کی یہ چھٹی جلد عظیم الشان عہد بنو اُمیہ کے
آخری ۳۶ سال کے عبرت انگیز حالات پر مشتمل ہے۔ یہ
دور وسعت پذیری اور کمال عروج کے بعد زوال کا دور ہے
حضرت عمر بن عبدالعزیز جنہیں بجا طور پر ثانی ابن الخطاب کہا جاتا
ہے ان کے دور سے شروع ہو کر مروان بن محمد کے واقعہ
کے آخری فرمانروا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور اموی خلفاء کی
لغزشوں کے ردعمل کا ظہور، ابومسلم خراسانی کی فتنہ سامانیاں
بنو اُمیہ اور بنو عباس کے نسلی تعصبات اور اموی دور حکومت
کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ ہفتم

عباسی دور حکومت

خلیفہ ابوالعباس تا خلیفہ مہدی

۱۳۲ھ تا ۱۶۰ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ ہشتم

ہارون الرشید اور اس کے جانشین

ہارون الرشید تا واثق باللہ

۱۷۰ھ تا ۲۳۱ھ

ترجمہ سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

قیمت: ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ نہم

خلافت بغداد کا دور انحطاط (حصہ اول)

صفحات ۷۰۰، قیمت ۱۵/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ دہم

جعفر المتوکل تا المقتدر باللہ (حصہ دوم)

قیمت ۱۶/۰ روپے

مکمل سیٹ: ۲۲۳/ روپے

کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر من احوال العرب والعجم والبربر ومن عاصر
ہم من ملوک الکبر یعنی علامہ ابن خلدون کی کتاب التواریخ کا اردو ترجمہ

تاریخ ابن خلدون (مکمل گیارہ حصے)

اُردو ترجمہ : علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی — مکمل سیٹ ۲۴۳ روپے

مقدمہ ابن خلدون ۔ حصہ اول

اُردو ترجمہ مولانا راغب رحمانی ۔ قیمت ۱۸/۰ روپے

مقدمہ ابن خلدون ۔ حصہ دوم

اُردو ترجمہ مولانا راغب رحمانی ۔ قیمت ۱۸/۰ روپے

تاریخ ابن خلدون قبل اسلام

تاریخ الانبیاء (حصہ اول)

اس میں حضرت نوح علیہ السلام سے جناب عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے بعد تقریباً چھٹی صدی عیسوی تک کے حالات اور انساب درج ہیں۔ انبیاء بنی اسرائیل و عرب اور ملوک یمن و بابل و نینوے و موصل و فراعنہ مصر و عمالقہ وغیرہ وغیرہ کے انساب و حکومت اور ان کے سچے اور صحیح واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

بڑا سائز ۔ اعلیٰ سفید کاغذ ۔ صفحات : ۳۰۴ مجلد

قیمت : گیارہ روپے پچاس پیسے

تاریخ ابن خلدون ۔ قبل اسلام

تاریخ الانبیاء (حصہ دوم)

اس میں دولت فارس و یونان و روم و قبطی و ملوک قیاصرہ کیتہ و فیانہ و تتنہ و قسطنطنیہ و شام و قوم تورہ، ملوک اندلس کے حالات و انساب و عرب کے طبقہ ثالثہ (یعنی عرب مستعربہ) بنو حمیر، بنو کہلان، بنو قضاعہ، ملوک حیرہ و کندہ و غسان اور اوس و خزرج ملوک یثرب، عدنان بنو عدنان و مضر، قیس، الیاس قریش وغیرہ کے نسب نامے اور آنحضرت صلعم کا نسب نامہ نہایت تحقیق سے لکھا گیا ہے

بڑا سائز ۔ اعلیٰ سفید کاغذ ۔ صفحات ۳۰۴

قیمت : گیارہ روپے پچاس پیسے

تاریخ ابن خلدون حصہ اول

رسولؐ اور خلفائے رسولؐ

قبل ولادت باسعادت نبوی سے لے کر ۴۰ھ تک کے حوادث و واقعات حیات طیبہ کے مبارک مقامات خلفائے راشدین کی زندگیاں مسلمانوں کے فاتحانہ کارنامے اور اس عہد زریں کے تمام واقعات پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ۔

بڑا سائز ۔ اعلیٰ سفید کاغذ مجلد صفحات ۵۶۰ قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ ابن خلدون حصہ دوم

خلافت معاویہؓ و آل مروان

۴۱ھ میں حضرت حسنؓ کی صلح اور حضرت معاویہؓ کی خلافت سے لیکر ۱۳۲ھ تک کے مکمل حالات اسلامی تاریخ کے

سب سے درخشاں دورِ حکمرانی و کشور کشائی کا پورا نقشہ ۴۱ھ میں زمامِ خلافت اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد سے رجب ۶۰ھ تک حضرت معاویہ حکمراں رہے۔ انہوں نے کس شان سے حکمرانی کی یہ کتاب میں دیکھیے۔ حضرت معاویہ رضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی معتمد علیہ سیکرٹری اور وحی الٰہی کے کاتبوں میں سے تھے۔ یہ حضرت ام المومنین بی بی حبیبہ کے حقیقی بھائی ہیں یہ میدانِ جنگ میں بہترین فوجی، میدانِ سیاست میں شہسوار دانش و تدبیر، انتظامِ مملکت میں بے مثال منتظم اور سب سے بڑھ کر وہ ایک بہترین مسلمان ہیں اور آخری صحابی حکمراں ہیں

صفحات ۵۱۲۔ قیمت ۲۲/- روپے

تاریخ ابن خلدون۔ حصہ سوم

خلافت بنو عباس (حصہ اول)

خلافت عباسیہ کے بانی المنصور السفاح کی سفاکی اسلامی سلطنت کے نئے دارالخلافہ عروس البلاد بغداد کی تعمیر، ابو مسلم خراسانی کی سرکشی، نبوت کے دعویدار ابن مقنع کا خروج، مشرقی دنیا کے نامور خانوادے امیہ کی تباہی ہارون کے بیٹوں امین اور مامون کی کشمکش سے لیکر المعتضد، مکتفی باللہ تک مسلمانوں کے تمدن آفریں دور کے حالات و واقعات۔ بڑا سائز صفحات ۴۵۲ قیمت ۱۴/-

تاریخ ابن خلدون۔ حصہ چہارم

خلافت بنو عباس (حصہ دوم)

اس جلد میں علامہ ابن خلدون نے زوال بغداد کی ابتدا سے اس وقت تک کے واقعات اور حوادث کو اپنی خداداد قابلیت اور حقیقت شناسی سے بیان کیا ہے جبکہ زوال اپنی انتہا کو پہنچ کر ہلاکو خاں کی صورت میں بغداد میں نمودار ہوا اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی آتشِ انتقام بھڑک کر سوا پانچ سو سال کے پرانے تمدن و تہذیب کو خاک سیاہ کر گئی۔ بڑا سائز۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔

صفحات ۴۲۴ مجلد۔ قیمت ۱۶/- روپے

تاریخ ابن خلدون۔ حصہ پنجم

امیران اندلس اور خلفائے مصر

امیر عبدالرحمٰن الداخل سے لیکر آخری دور زوال تک گلستان اندلس کی کہانی ایک بے مثال تمدن کی ابتدا و انتہا اور مشرقی خلافت کے اندر فرقوں کی پیداوار ترکوں کی یلغار اور فاطمیوں کے عروج و زوال کی عبرتناک داستان۔ سفید کاغذ صفحات ۵۸۴۔ قیمت ۲۲/- روپے

تاریخ ابن خلدون حصہ ششم

غزنوی اور دور سلاطین

فاتح سومنات سلطان محمود غزنوی اور ہندوستان میں پہلی سلطنت کے بانی شہاب الدین غوری کی فتوحات کے مستند حالات۔ بڑا سائز اعلیٰ سفید کاغذ صفحات ۵۶۸ قیمت ۱۸/- روپے۔

تاریخ ابن خلدون۔ حصہ ہفتم

سلجوقی اور خوارزم شاہی سلاطین

سلجوقی و خوارزم شاہی خانوادوں کے حالات و کوائف، خانہ جنگیوں، عیسائیوں کا مقابلہ، کفار کرج اور قفچاق کی جدوجہد، ترکوں کی یورش، تاجدار سلجوقیہ اور ملوک خوارزم کی مدافعانہ کوشش، چنگیزی خاں کا خروج، تاتاریوں کا عالمگیر طوفان، ممالک اسلامیہ کی تباہی و بربادی کی عبرتناک داستان، بڑی سائز۔ اعلیٰ سفید کاغذ صفحات ۴۳۲۔ بہترین کتابت و طباعت مجلد دیدہ زیب و رنگین ٹائٹل قیمت ۱۶/- روپے